مشرف عالم ذوقی
لینڈ اسکیپ کے گھوڑے

لینڈ اسکیپ کے گھوڑے

(افسانے)

لینڈ اسکیپ کے گھوڑے

(افسانے)

مشرف عالم ذوقی

زیرِ اہتمام

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-110006

نام کتاب : لینڈ اسکیپ کے گھوڑے
ناشر و مصنف : مشرف عالم ذوقی
پتہ : T-101 تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی - 110031
Ph: 30921613 E-mail:zauqui@yahoo.com
تعداد : 400
سرورق : بشکریہ 'اسپین'
کمپوزنگ : محمد اسلم عبدالغفار

زیر اہتمام : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
گلی وکیل، کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی - 110006
مطبع : این۔ کے پرنٹرس، رمیش پارک، دہلی - 110092

ملنے کے پتے

ساشا پبلی کیشنز، T-101 تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی - 110031
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی - 110006
بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔4

LANDSCAPE KE GHODHE
MOSHARRAF ALAM ZAUQUI
SASHA PUBLICATION
T-101, TAJ ENCALVE, GEETA COLONY
DELHI - 110031

Rs. 200.00
2003

اپنی
پیاری
جان
بٹیا،
انعمتہ
کے
لئے

”سوچا تھا،
تم بھی پوچھو گی
دوسرے بچوں کی طرح/
سورج دن میں نکلتا ہے
رات میں کہاں چلا جاتا ہے؟
چاند رات میں اُگتا ہے
صبح ہوتے ہوتے کہاں کھو جاتا ہے؟

سوچا تھا، تم بھی
چڑیوں کی چہچہاہٹ، کلیوں کے کھلنے سے لے کر
ہر لمحہ، سپنا بُنتی آنکھوں سے جڑے ہوئے
پوچھو گی، ہزاروں پرشن
اور ہر بار دکھ جاؤ گی
کہ سورج غروب کہاں ہوتا ہے؟
چاند صبح میں کہاں چلا جاتا ہے؟

تم اپنا سورج، اپنا چاند
لے کر آئی تھی اپنے ساتھ
کلیوں کے کھلنے اور مرجھانے تک کے راز معلوم
تھے تمہیں،
تم نے کچھ نہیں پوچھا
بس چپکے سے ہنس دی/ لیکن کلی کی طرح کھلی نہیں
سورج کی طرح اوجھل ہو گئی
شام میں“

لینڈ اسکیپ کے گھوڑے

سرخ حاشیے

فزکس، کیمسٹری، الجبرا	۱۱
انکیوبیٹر	۳۳
لینڈ اسکیپ کے گھوڑے	۵۴
فریج میں عورت	۷۴
بیٹی	۹۳
بھورے بالوں والی لڑکی	۱۱۰
کاجو	۱۲۳
انارکلی، عمر 54 سال	۱۳۷
الرجی بنام ہوڑہ کے سوپن رائے	۱۴۸
پانی، اندر اندر گھاس	۱۶۲
نورجہاں، پھول جہاں اور کین کا صوفہ	۱۶۸
ایک مٹھی خاک	۱۸۰

سیاہ حاشیے

لیبارٹری ۱۸۸

احمد آباد۔ ۳۰۲ میل ۲۰۶

یہ کسی تھکی ہوئی رات کی داستان نہیں ہے ۲۲۷

یہ کسی تھکی ہوئی رات کی داستان نہیں ہے (۲) ۲۳۹

اقبالیہ بیان ۲۴۹

سناٹے میں تارا

بُرے موسم کے بے حد اداس دنوں میں یہ کتاب ۲۷۶

سرخ لفظ

اس پُر ہیبت حقیقت کے مقابل، جسے تمام انسانی
زمانوں میں ایک یوٹوپیا کی حیثیت حاصل رہی ہوگی،
ہم، کہانیوں کے موجد، جن کے نزدیک ہر بات قابلِ
یقین ہے، اس بات پر یقین کرنے کے بھی پوری طرح
حق دار ہیں کہ ایک بالکل دوسری قسم کے یوٹوپیا کی تخلیق
میں خود کو منہمک کر دینے کا وقت ابھی ہاتھ سے نہیں گیا۔
زندگی کا ایک نیا اور ہمہ گیر یوٹوپیا، جہاں کسی کو دوسروں
کی موت کے حالات کا تعین کرنے کا اختیار نہیں ہوگا،
جہاں محبت سچی، اور خوشی ممکن ہوگی اور جہاں سو سال کی
تنہائی کی سزا بھگتنے والی قوموں کو، آخر کار اور ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے، اس زمین پر ایک اور موقع دیا جائے گا۔

—— گابرئیل گارسیا مارکیز

فزکس، کیمسٹری، الجبرا......

(اپنی بیٹی صحیفہ کے نام ــــــ کوئی نہ جانے ــــــ تم کو کیسے کیسے سوچا
میں نے ــــــ کیسے کیسے جانا میں نے ــــــ!)

'نہیں انجلی۔ یہاں نہیں۔ یہاں میں پڑھ رہا ہوں، نا۔ یہاں سے جاؤ ــــــ'
'لیکن کیوں پاپا؟'
'بس۔ میں نے کہہ دیا نا۔ جاؤ۔ کبھی کبھی سن بھی لیا کرو ــــــ'
'پاپا۔ مجھے یہاں اچھا لگ رہا ہے۔'
'نہیں۔ میں نے کہہ دیا نا۔ میں کچھ ضروری کام کر رہا ہوں۔ سنا نہیں تم نے۔'
'پاssپاss' آواز میں ہلکی سی خفگی تھی ــــــ تمہارے پاس اچھا لگتا ہے مجھے۔'

○○

ہمت جٹاتا ہوں۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب آتا ہوں۔ بن ماں کی بچی۔ دل میں بہت سارا پیار اُمڈتا ہے ــــــ اندر کے غصے کو اس کے معصوم چہرے پر ہولے، سے رکھ دیتا ہوں ــــــ جیسے 'دیا سلائی' کے ننھے سے شعلے پر موم کو...... پتہ نہیں کتنا پگھلا ہوں ــــــ؟ یا شاید پگھل گیا ہوں ــــــ اس کے سر پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتا ہوں۔

'میں تمہارے سامنے پڑھتی ہوں تو اس طرح ناراض کیوں ہوتے ہو؟'
انجلی 'ہنپا' ہے...... 'جاؤ نہیں بولتی۔'
'اچھا۔ ناراض نہیں ہو، نا ــــــ' میں ہنس دیتا ہوں۔

'ہپا' انجلی خوش ہو کر بچوں کی طرح مجھ پر بچھنا چاہتی ہے۔ میں پیچھے ہٹتا ہوں۔ اس کے ہاتھوں کو ـــــ نہیں۔ اس کے جسم کو ـــــ خود سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔
'نہیں۔ نہیں انجلی۔ ٹھیک ہے...... بچپنا نہیں۔ اب بڑی ہو رہی ہو تم...... سمجھ گئی...... بڑی ہو رہی ہو۔'

''ہونہہ۔ پپا کے سامنے بڑے، بچے ہی رہتے ہیں۔'
'لیکن تم......، بچی ہو ـــــ کہتے کہتے ٹھہر جاتا ہوں۔ انجلی حیرانی سے میرا منہ تکتی ہے۔

'تم کیا پاپا......'
مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں ـــــ 'تم نہیں سمجھو گی، انجلی۔
انجلی منہ بچکاتی ہے ـــــ 'میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔ میں اب سب سمجھتی ہوں پاپا۔ کبھی کبھی تم سمجھ میں نہیں آتے پاپا۔ لو، میں تمہارے پاس سے جا رہی ہوں۔ لیکن سنو، اکیلے کمرے میں مجھے ڈر لگتا ہے۔ اب میں تمہارے پاس ہی سویا کروں گی، پاپا ـــــ تمہارے ہی کمرے میں۔'

'میرے کمرے میں؟'
'کیوں، سب بچے سوتے ہیں۔'
'نہیں۔ میں نے اس لئے پوچھا کہ میں رات بھر لائٹ جلا کر کچھ نہ کچھ آفس کا کام کرتا رہتا ہوں۔'
'مجھے لائٹ ڈسٹرب نہیں کرے گی پاپا ـــــ' انجلی مسکرائی ہے۔' کل سے یہیں سو جاؤں؟'
'نہیں۔ بس کہہ دیا نا۔ اب تم بڑی ہو رہی ہو۔ اس سے زیادہ سوال نہیں۔'

انجلی کے معصوم چہرے پر سوالوں کی سلوٹیں بکھر جاتی ہیں۔ میں جاتے جاتے اس کے الفاظ میں دکھ محسوس کر لیتا ہوں۔

'کوئی بات نہیں پاپا'

انجلی اپنے کمرے میں واپس لوٹ گئی ہے۔ اس کی سلوٹوں بھری سوالیہ آنکھیں اب بھی کمرے میں موجود ہیں۔ یہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔

'انجلی کو کیوں بھیج دیا؟'

میز پر آفس کی کچھ بے حد ضروری فائلیں بکھری پڑی ہیں۔ لیکن ابھی، اس لمحے مجھے ان فائیلوں کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

'انجلی کیوں گئی؟ میں نے اسے اپنے کمرے میں کیوں بھیج دیا۔؟

پتہ نہیں ــــــ لیکن شاید یہ میرے اندر کا سناٹا ہے، جو مجھ سے لڑ رہا ہے۔ کیا ہو جاتا ہے تمہیں۔ کیا ہو جاتا ہے تمہیں۔ اچھے خاصے آدمی سے اچانک 'لڑکی' کے باپ کیوں بن جاتے ہو۔ بن جاتے ہو ــــــ چلو کوئی بات نہیں۔ لیکن اپنی ہی لڑکی سے ڈرنے کیوں لگتے ہو......

ایک بزدل آدمی جرح کرتا ہے ــــــ 'نہیں۔ جھوٹ ہے۔ ڈروں گا کیوں؟'

سناٹا ہنستا ہے ــــــ 'دیکھو' اپنے آپ کو غور سے دیکھو۔ تم ڈر گئے تھے۔ کیونکہ......'

اندر کا سناٹا ایک انتہائی فحش سا جملہ اچھالتا ہے ــــــ تم اسے عموماً ایسے لباسوں میں نہیں دیکھ پاتے۔ ہے نا sss یار، وہ کانونٹ میں پڑھتی ہے۔' سناٹا قہقہہ لگاتا ہے۔ کانونٹ یا نئے زمانہ کی لڑکیاں اب آنچل یا اوڑھنی کا استعمال نہیں کرتیں۔ وہ اپنے بدن پر کپڑوں کا بہت زیادہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتیں۔ تو کیا ہوا۔ وہ تمہاری بیٹی ہے۔'

'بس ڈر جاتا ہوں۔'

'لیکن کیوں؟'

لمبی لمبی سانس لیتا ہوں۔ کہہ نہیں سکتا۔

'بیٹی میں لڑکی تو نہیں دیکھنے لگتے؟'

اندر کا سناٹا دیر تک ہنستا رہتا ہے۔

(2)

اس دن مسز ڈھلن سے یہی تو پوچھا تھا میں نے......

'بیٹیوں میں لڑکیوں کا جسم کیوں آ جاتا ہے۔'

'کیا؟' مسز ڈھلن زور سے چونکی تھیں...... لڑکیوں کا جسم...... ہنستے ہنستے چائے کے کپ پران کے ہاتھ تھرتھرائے تھے...... 'آپ شادی کرلو، آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں...... '

'بیٹی میں لڑکی کا جسم۔ میں نے بہت معمولی بات کہی ہے، مسز ڈھلن۔ یہ لڑکیاں کیوں آجاتی ہیں بیٹی میں...... لڑکیاں۔ پرائی لڑکیاں۔ پرائی لڑکیوں کے جسم پر، مدھومکھی کے چھتوں کی طرح، گرتی ہوئی پرائی آنکھیں...... یہ بیٹیاں بس بیٹیاں کیوں نہیں رہتیں...... بغیر جسم والی...... نہیں، سنو مسز ڈھلن! قصور آپ کا نہیں ــــ یقیناً آپ میری بات نہیں سمجھ سکتیں...... لیکن بیٹیوں میں یہ لڑکیوں والا جسم نہیں آنا چاہئے...... ہے، نا؟'

OO

شاید سب کچھ اچانک بدلا تھا ــــ اچانک ــــ

ہاں، شاید سب کچھ اچانک ہی بدل جاتا ہے۔ گھر میں خوشیوں کا ایک روشندان تھا میرے پاس ــــ سنہری کرنیں آیا کرتی تھیں ــــ یہ سنہری کرنیں مسکراتیں تو گھر جگ مگ، جگ مگ کرنے لگتا......

وہ انجلی کی ماں تھی...... روشن دان سے جھن جھن جھانکنے والی روشنی کی کرن......

'تمہیں پتہ ہے، پہلی بار اسکیٹنگ کرنے والوں کو برف کیسی لگتی ہے؟'

'نہیں'

'چکنی اور خوبصورت۔'

یہ اس کے لئے میرا پہلا کمپلی منٹ تھا......

وہ زور سے ہنسی تھی...... ''کیا یہ تمہاری پہلی اسکیٹنگ ہے؟'

'اگر ہاں کہوں تو؟'

یقین کرلوں گی۔'

''تو پھر یقین کرو۔ اس سے پہلے کبھی برف پر چلنے کا خیال ہی نہیں آیا۔'

'برف پر......' اس کے موتیوں جیسے دانت ہنس رہے تھے...... اُف کتنے شفاف اور قرینے سے رکھے ہوئے ــــ

'کیا یہ سارے ہیرے میرے ہیں؟' میں نے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا۔

'ہاں'۔۔۔۔۔ وہ پھر دلکش انداز میں ہنسی تھی.....'اس کے لئے جو پہلی بار اسکیٹنگ سیکھ رہا ہے.....'

OO

پھر یہ 'اسکیٹنگ' جیسے زندگی کا ایک حصہ بن گئی۔۔۔۔۔ گھر میں خوشیوں والا روشندان کھل گیا......

وہ مسکراتی تھی......

'اب کہیں اسکیٹنگ کرنے جاتے ہو یا نہیں؟'

'اب تو تم سے ہی فرصت نہیں ملتی'

'اب کروگے بھی نہیں۔ اس لئے کہ تمہیں اسکیٹنگ سے روکنے والی آ رہی ہے.....'

OO

یہ انجلی تھی۔۔۔۔۔ جس کے بارے میں شروع سے ہی اس کا خیال تھا۔ بچی ہوگی۔

'کیوں۔'

'زیادہ تر بچیاں اپنے لئے سردیاں پسند کرتی ہیں۔ میں خود سردی کے موسم میں پیدا ہوئی تھی۔۔۔۔۔ سنو۔ اگر بیٹی ہوئی اور بیٹی نے تمہاری طرح اسکیٹنگ کرنی چاہی تو......؟'

میرا چہرہ ایک لمحے کو فق ہو گیا تھا۔۔۔۔۔

وہ زور سے ہنسی......بس ہو گئی نا چھٹی۔ تم مردوں میں ہر وقت ایک چور مرد کیوں رہتا ہے۔ بیٹا ہو تو تاڑ پر چڑھا دو۔ دس گناہ معاف۔ کچھ بھی پہن لے۔ دس دس محبوباؤں کے ساتھ گھومتا رہے۔ مگر بیٹیاں۔'

وہ میرے چہرے پر جھک گئی تھی......

'ساری......میں کھیل کر رہی تھی.....'اس کی مخروطی، جلتی انگلیاں میرے برف جیسے چہرے پر موم کے شعلوں کی طرح اپنی آنچ دے رہی تھیں...... میں جانتی ہوں، تم ایسے نہیں ہو.....تم اپنی بیٹی سے بھی ویسی ہی محبت کروگے، جیسے...... ہے نا.....بیٹی اگر میری طرح ہوئی تو......'

میں نے پھونک مار کر شعلہ بجھا دیا تھا ـــــــ

'بیٹی تمہاری طرح نہیں ہونا چاہئے'

'کیوں'

میں شاید خاموش رہ گیا تھا ـــــــ بیٹی اگر بڑی ہوئی تو......؟ وہی خاموشی سے ڈس جانے والا کمپلیکس...... 'یہ بدن کچھ جانا پہچانا سا ہے...... یہ چہرہ کچھ......!'

(3)

شاید اسی لئے انجلی کی پیدائش پر میں زور سے ڈرا تھا۔ نومولود بچوں کا چہرہ اتنا زیادہ ماں یا باپ سے نہیں ملتا۔ لیکن انجلی میں اس کی ماں مسکرا رہی تھی...... انجلی کو نہارتے ہوئے میں اچانک زور سے چیخا تھا۔

''نیکر...... نیکر کہاں ہے؟''

'شی...... جاگ جائے گی؟' اس کے چہرے پر خفگی تھی۔ زور سے چلائے کیوں ـــــــ وہ ہنسی...... 'شوشو ہو گئی تھی اس لیے۔ دیکھو۔ وہاں میز پر نیکر پڑا ہے۔ بدل دو نا پلیز......'

پتہ نہیں۔ لیکن شاید بہت کچھ بدلنے کی ابتدا ہو چکی تھی......

میں نے میز سے نیکر اٹھا لیا۔

مگر میرے ہاتھ کیوں کانپ رہے تھے۔

'سنو، تم بدل دو۔'

'کیوں ـــــــ اتنا سا کام بھی تم لوگوں سے نہیں ہوتا ـــــــ تم مردوں سے۔ بس بیوی ہی نو مہینے تک پاگل بنی رہے۔ تمہارا بچہ ہے۔ تم کیوں نہیں نیکر بدل سکتے...... سنو......'

وہ انجلی کا نیکر بدل رہی تھی۔ میں کہیں اور دیکھ رہا تھا۔

'سنو۔ انجلی کے آجانے سے میرے بھی کام بڑھ جائیں گے ـــــــ تم بزی رہتے ہو۔ لیکن سنو ـــــــ انجلی کو صبح صبح تم ہی نہایا کرو گے۔ ٹھیک ہے نا؟

'نہیں۔'

سردیوں کے موسم میں جیسے دانت بجتے ہیں ـــــــ اندر کنوئیں سے کوئی صدا اوپر تک

آتے آتے تھم گئی تھی۔

'کیسے باپ ہو، اپنے بچے کو گود میں تو لو؟'

اس نے انجلی کو اچانک اٹھا کر میری گود میں ڈال دیا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔

'کیسا عجیب سا لگ رہا ہے۔ ہے نا؟ جیسے میں ننھی سی ہو کر تمہارے ہاتھوں میں سمٹ گئی

ہوں......

مجھے زور کا کرنٹ لگا تھا......

○○

انجلی کے ایک سال کے ہونے تک یہ سب سلسلے چلتے رہے۔ یہ لڑکیاں صفائی کے معاملے میں پیدائش سے ہی بڑی Sensitive ہوتی ہیں۔ انجلی زیادہ اسی وقت روتی تھی، جب اس نے شوشو کر دیا ہو۔ کبھی کبھی وہ کچن میں مصروف ہوتی تو وہیں سے ڈانٹ لگاتی۔

'نیکر بدل دو______'

شاید وہ پہلا واقعہ تھا۔ نہیں حادثہ...... نہیں، واقعہ کہنا ہی بہتر ہوگا...... وہ شاید شاپنگ کے لئے گئی تھی اور انجلی زور زور سے روئے جا رہی تھی۔ مجھ میں ایک باپ جاگ چکا تھا۔

لیکن کیا، ہمت کی کمی تھی مجھ میں؟

اور کیوں______؟

پیشاب سے چپ چپاتے پھلیے سے، میں نے اسے اٹھا تو لیا۔ مگر میرے ہاتھ پیشاب میں سنے نیکر اتارتے ہوئے کانپ رہے تھے...... اس کے ننھے ننھے سے پاؤں میں دوبارہ صاف ستھری نیکر پہنانے تک، میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اس کی طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔

لیکن کیوں؟

ایک سہمے سہمے سے باپ کو آخر اتنا سمجھانا کیوں پڑتا ہے؟

بچی ہنس پڑی تھی۔ اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ہولے سے، 'منّے' سے ہاتھوں کو چھوا...... پاؤں میں چاندی کے کڑے تھے...... وہ آسمان سے اترا ہوا فرشتہ لگ رہی تھی۔

بیساختہ اسے میں نے گود میں اٹھالیا۔ پیشانی پر چمی لی۔

'میری بیٹی۔میری بیٹی'

وہ شاید پہلے ہی آچکی تھی ـــــ لیکن چھپ کر یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔اس نے زور سے تالیاں بجائیں......

'گڈ آج سے تم باپ بن گئے۔اب میری ضرورت نہیں رہی۔'

'ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'

'کیونکہ تم میں ایک باپ آ گیا ہے؟ وہ ہنس رہی تھی......'سنو، اس باپ کو بزدل نہیں ہونا چاہئے......سنو، میں اس باپ کو بزدل نہیں دیکھ سکتی......'

وہ دوڑ کر آئی ـــــ اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے......

'دیکھو......انجلی ہنس رہی ہے۔ہنس رہی ہے نا......؟'

○○

شاید اس نے صحیح کہا تھا۔

مجھ میں ایک باپ جاگ گیا تھا اور شاید اسی لئے وہ ہمیشہ کے لئے سونے چلی گئی......
اس رات کی نیند اتنی گہری تھی کہ وہ کبھی نہیں جاگی......انجلی میری گود میں تھی......اور میں آسمان کے کنارے تلاش کر رہا تھا۔اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلا ہوا آسمان......ایک لمبی زندگی اور معصوم سی، مٹھی بھر ہاتھوں میں سما جانے والی انجلی۔

انجلی بڑی ہو رہی تھی۔باپ ڈر رہا تھا......باپ دوست بننے کی کوشش کر رہا تھا۔لیکن، لڑکی یا عورت کے بدن سے جڑی ہوئی کچھ ایسی 'خفیہ' کہانیاں بھی ہوتی ہیں، جو اچانک پُر اسرار راتوں کی طرح جاگ جاتی ہیں۔کبھی کبھی، سہمی سہمی راتیں مجھ میں ڈر پیدا کر دیتیں......خاص کر سرما جیسے موسم میں ـــــ ایک ہی لحاف میں......انجلی کے بدن سے لپٹے ہوئے ہاتھ اچانک، خرگوش سے سانپ جیسے بھیانک ہو جاتے......

میں لیمپ روشن کر دیتا۔کمرے کو اپنی لمبی لمبی، گہری گہری سانسیں سونپ دیتا ہوں۔

یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔انجلی بیٹی ہے۔بیٹی ہے۔دو ایکم دو۔دو دونی چار......انجلی بیٹی ہے......بیٹی ہے......بیٹی ہے......دو ایکم دو۔دو دونی چار/ انجلی بیٹی ہے......بیٹی ہے......بیٹی

ہے...... میں اپنی سانسوں سے الجھنے کی کوشش کر رہا ہوں......

انجلی میری بیٹی ہے۔ میری جانو...... یار...... یہ بیٹیوں میں، اچانک لڑکی جیسا بدن کیوں آجاتا ہے......؟

شاید اپنے آپ کو مضبوط کر رہا ہوں۔ مسکراتا ہوں۔ انجلی کی پیشانی کا بوسہ لیتا ہوں...... پاکیزگی سے بھرا بوسہ...... لحاف اوڑھاتا ہوں۔ ٹھنڈک بڑھ گئی ہے...... لیمپ بجھاتا ہوں۔

لیکن انجلی کے لحاف میں گھسنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

کیوں؟

لحاف کے اندر انجلی کا بدن جل رہا ہے...... میں ٹھٹھر رہا ہوں۔ باہر ٹھنڈک بڑھ گئی ہے...... کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آرہی ہے...... سگار، ایش ٹرے......، اندھیرے میں یہ ہاتھ میں سب کچھ تلاش کر لیتے ہیں۔ ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا ہوں...... سگار کا دھواں اور لحاف کے اندر ہلتی ڈلتی ہوئی انجلی......

شاید یہ اسی فیصلے کی گھڑی تھی......

'نہیں انجلی، اب تمہیں بستر الگ کرنے ہوں گے...... سمجھ رہی ہونا...... اب بڑی ہو رہی ہو تم...... اور...... پڑھائی بھی تو کرنی ہے تمہیں......!'

○○

'انجلی کی کیا عمر ہوگئی ہوگی اب......؟'

یہ مسز ڈھلن تھیں...... فائل پر جھکی ہوئی نگاہیں......

'چہ...... چودہ......' کہتے کہتے ٹھہر گیا ہوں......

'مائی گاڈ...... مسز ڈھلن کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی ہے۔ ''چودہ کی ہوگئی انجلی...... اب آپ کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی سر۔ گھر میں اور کون کون ہے...... میرا مطلب، عورت......

'پہلے ایک آیا تھی......'

'تھی......؟'

'ہٹا دیا......'

'کیوں ___؟'

'وہ انجلی سے زیادہ مجھ میں دلچسپی لیتی تھی۔'

'اوہ نو......' فائل سے اوپر اٹھی ہوئی نگاہیں......انجلی کو اس عمر میں عورت کی ضرورت ہے سر۔'

'عورت کی ہے؟'

'Obviously......عورت کی سر......' مسز ڈھلن ہنستی ہیں___ میں کیسے سمجھاؤں آپ کو......آپ......'

ایک خوفزدہ باپ اپنی منہ لگی اسسٹنٹ کے سامنے چپ ہے...... پریشان سا......

'کیابات ہے مسز ڈھلن'

'آپ کی زبان میں سمجھاؤں سر___ وہ ہنستی ہے۔ اس عمر میں ایک خوبصورت حادثہ، لڑکی کا انتظار کررہا ہوتا ہے...... خوبصورت___ نہیں سمجھ میں آنے والا اور دماغ کی رگیں چٹخانے والا...... کیونکہ لڑکی جوان ہورہی ہوتی ہے......

'جوان......' سناٹے میں میزائل چھوٹی۔

'یس سر___'

مسز ڈھلن نے فائل بند کردی۔ 'بہتر ہے آپ اس آیا کو پھر سے بلالیں......'

مسز ڈھلن پر آہستہ سے چیختا ہوں___ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں......

'پی......پی ریڈ۔ اس عمر میں لڑکیوں کو......'

مسز ڈھلن آگے بڑھ جاتی ہیں___

مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے...... کمرے کا رنگ اچانک سرخ ہوگیا ہے......لال لال...... کھڑکیوں پر چڑھے ہوئے شیشے...... دیواریں...... اور زمین...... سب لال لال...... سرخ سرخ...... میری آنکھوں کے آگے...... اندھیرا بھی لال اور سرخ___ میں سر تھامنے کی کوشش کرتا ہوں......

'انجلی'

یہ بیٹیوں میں لڑکیاں کیوں آجاتی ہیں......

OO

'اس دن میں، دفتر سے گھر جلد لوٹ آیا تھا ـــــ دروازے پر داخل ہوتے ہی زور سے چیخا......

انجلی!

مگر کوئی نہیں۔ دروازے کے پٹ کھلے تھے۔ سیڑھیاں خاموش تھیں...... اندھیرے میں، اسکرین پر الفریڈ ہچکاک کی کوئی فلم شروع ہوگئی تھی۔ سسپینس اور تحیر سے بھری ہوئی فلم......
انجلی......

باپ الگ الگ دروازے پر دستک دیتا ہے...... چلاتا ہے...... انجلی...... وہ 'بڑی سی انجلی' کو اچانک دریافت کرلینا چاہتا ہے۔ مگر اس اچانک دریافت کے بعد...... سرخ سناٹے ـــــ جیسے ذہن کو چیونٹیوں کی طرح کاٹے جارہے ہیں...... انجلی...... یہاں بھی نہیں...... اس کمرے میں بھی نہیں۔ کہاں گئی۔ بیک گراؤنڈ سے تیز میوزک...... دروازہ کھلا ہے۔ انجلی نہیں ہے ـــــ کہاں گئی ہوگی...... کہیں گئی ہوگی یار...... بیٹیاں اچانک جوان ہوجاتی ہیں۔ کشمکش بھرے لمحے میں خودکو دی جانے والی تسلیاں...... کہیں گئی ہوگی۔ مگر۔ اس طرح۔ گھر کو کھلا چھوڑ کر...... اور...... وہی ......سرخ انقلاب......

ذہن میں چکر آرہے ہیں......

بالکنی پر آگیا ہوں...... یہ سانسیں دھونکنی کی طرح کیوں چل رہی ہیں...... تیز تیز...... شاید مجھے کچھ ہورہا ہے ـــــ نظروں کے آگے یہ کیسا سرخ انقلاب مجھے پریشان کئے جارہا ہے۔

ایک بار پھر زور سے چلاتا ہوں...... انجلی!

سرخ منظر ایک ایک کرکے 'لیزر' کرنوں کی طرح انجلی کے بدن میں داخل ہوتے چلے جارہے ہیں...... سامنے اسکرین پر انجلی کا بدن روشن ہے...... اور لیزر کرنیں...... سرخ لیزر کرنیں......

مجھے شاور کی ضرورت ہے...... اس بدن کو ہٹاؤ...... انجلی کے بدن کو ہٹاؤ......

میں دونوں ہاتھوں سے سر تھامتا ہوں۔ باتھ روم کی طرف تیزی سے بھاگتا ہوں......

دروازہ کھولتا ہوں اور......

باتھ روم کا دروازہ کے کھلتے ہی ـــــ ہینگر پر لپٹے ہوئے سانپ، جیسے زور سے اُچھل کر مجھے ڈس لیتے ہیں ـــــ چیخنا چاہتا ہوں ـــــ مگر چیخ جیسے اندر گھٹ کر رہ گئی ہے...... میرا جسم تھر تھر کانپ رہا ہے۔ باتھ روم کی ہر ایک شئے میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ سرخ ٹائلس ـــــ ان کے درمیان اسی کلر سے میچ کرتا باتھ ٹب...... ہلکا ہلکا کھلا ہوا شاور...... شاور کے چھید سے ٹپکتے ہوئے قطرہ قطرہ پانی کی بوندیں......اور اُدھر شاور کے داہنی طرف بے ڈھنگے پن سے ہینگر کے سرخ 'رڈ' میں 'کھوئی' گئی انجلی کی برا اور پینٹی ـــــ

شاور کے چھید سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں...... ٹپ...... ٹپ......

میری آنکھیں سہم گئی ہے......

بدن لرز رہا ہے......

گلہ سوکھ گیا ہے......

جسم کے اندر بھونچال آگیا ہے......

ریزہ ریزہ کانپ رہا ہے......

کیمرہ باتھ روم میں نہ اب کہیں Pan ہو رہا ہے ـــــ نہ ٹلٹ اَپ ـــــ نہ ہی ٹلٹ ڈاؤن...... وہ جیسے اُسی منظر پر Freeze ہو گیا ہے...... انجلی کے کپڑے اور......

شاور کے چھید سے ٹپکتی ہوئی پانی کی بوندیں

انجلی!

جیسے بجلی کا کرنٹ لگتا ہے۔

میرے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلتی ہے...... تھر تھر کانپتا ہوا کمرے میں آتا ہوں...... بستر پر رکھا ہوا کمبل اٹھاتا ہوں...... نہیں، مجھے ایک شکار کرنا ہے...... باتھ روم میں سانپ آ گیا ہے...... یہ کمبل نہیں ہے، شکاری کا پھندہ ہے......

پھر وہی باتھ روم...... سرخ ٹائلس...... اور میرا شکار ہے...... آنکھیں خوفزدہ ہو کر دوسری طرف کرتا ہوں۔ کمبل ایک جھٹکے سے انجلی کے اندر پہنے جانے والے لباس پر پھینکتا ہوں...... پکڑ لیا چور...... ہاتھ لرز رہا ہے۔ بدن میں خون کی گردش بڑھ گئی ہے۔ پاؤں کانپ رہے ہیں...... ہاتھ میں چوہے دانی ہے ـــــ اور اندر حرکت کرا ہوا چوہا...... لو پکڑ لیا...... انجلی کا کمرہ

ہے...... اس کا وارڈ روب...... آنکھ بند کر کے کمبل کھولتا ہوں......اور یہ گیا چوہا...... کمبل وہیں پھینک کر باتھ روم کی طرف دوڑتا ہوں۔ شاور چلاتا ہوں...... آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ پانی کی تیز بوند سر پر پڑتی ہے۔ ایک ذرا سا، خیالوں کی برہنہ گپھاؤں سے باہر نکلا ہوں......

یہ مجھے کیا ہو گیا تھا......

میں انجلی کی آواز سن رہا ہوں...... پاپا...... پاپا......

انجلی آ گئی ہے......

پانی میں ارتعاش پیدا ہوا ہے...... میں اپنے جسم کو نارمل ٹمپریچر پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں......

پاپا...... پاپا......

انجلی بیٹی ہے...... بیٹی...... میری پیاری بیٹی...... دو ایکم دو۔ دو دونی چار...... بیٹی ہے...... بیٹی ہے......

OO

'پاپا چیخ کیوں رہے تھے؟'

'تم گئی کہاں تھی؟'

جاؤں گی کہاں۔ مینو سے نوٹس مانگنے گئی تھی۔'

'مینو؟'

'ہاں۔ وہ پڑوس والے شرما انکل کی بیٹی۔ لیکن تم چیخ کیوں رہے تھے...... پتہ ہے۔ دروازہ رکھلا رہ گیا تھا، اس لئے ______ ساری پاپا۔ مجھے خیال نہیں رہا......

'کوئی بات نہیں،

میں مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ انجلی بیٹی ہے۔ دو دونی چار...... دو ایکم دو......

'ایسے کیا دیکھ رہے ہو پاپا'

'کچھ نہی'

'نہیں۔ کچھ تو ہے۔'

'دیکھ رہا ہوں کہ اب میری بیٹا بڑی ہو گئی ہے۔'

'تو؟ اب میری شادی کرو گے؟' انجلی مسکرا رہی ہے۔ یہ ایک دم سے باپ کیوں بن جاتے ہو____ اولڈ فیشنڈ۔' آگے بڑھ کر اس نے میرے گلے میں پیار سے اپنی بانہیں ڈال دی ہیں۔ 'تم ایک دوست ہو پاپا۔ میرے لئے...... پاپا سے زیادہ دوست۔'

'ہاں بیٹا' میں تمہارا دوست ہی ہوں۔'

انجلی کے ماتھے پر Kiss کرتا ہوں...... 'دوست ہوں۔ لیکن تمہیں اچانک اتنا بڑا نہیں ہو جانا چاہئے تھا......'

مسز ڈھلن کے لفظ چاروں طرف سے مجھے گھیر رہے ہیں...... ایک خاص طرح کا ساؤنڈ ایفیکٹ ECHO...... انجلی کو دیکھ کر میں مسکرانا چاہتا ہوں مگر وہی......

...... ہر زور ظلم کی ٹکر میں انصاف ہمارا نعرہ ہے۔

سرخ سرخ انقلاب......

مسز ڈھلن کے بجتے ہوئے لفظ...... ''اس عمر میں ایک خوبصورت حادثہ لڑکی کا انتظار کر رہا ہوتا ہے...... خوبصورت اور نہیں سمجھ میں آنے والا...... پھر دھماکہ ہوتا ہے...... پیریڈ...... تیز دھماکہ...... جیسے ایک ملک نے دوسرے پر بمباری شروع کر دی ہو...... دھائیں دھائی......

اپنی دنیا میں واپس آنے تک، ایک اٹ پٹا سا سوال کر دیتا ہوں......

'تم ٹھیک تو ہو بیٹی۔ میرا مطلب ہے رات میں؟'

'رات میں......'

'ر...... ا...... ت____ 'رات میرے ہونٹوں پر آ کر____ طلسم ہوش رُبا کی پتھر بنانے والی ساحرہ بن گئی ہے...... ہاں، رات میں...... ٹھیک ہو، نا...... میرا مطلب ہے......'

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے رات وات میں کچھ نہیں ہوتا ہے____ دیکھو۔ میں بالکل فٹ ہوں۔'

انجلی میرے سامنے تن گئی ہے۔

میں مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں...... اندھیرے میں، آسمان پر چمکتے ایک پیارے سے تارے کو 'ہولے' سے چھو لیتا ہوں...... نہیں...... میں بالکل ٹھیک ہوں اور صحتمند......

کیا میں 'پرورٹیڈ' ہوں؟

نہیں۔ مجھے یقین ہے ـــــ میں پرورٹیڈ نہیں ہوں۔ میں گندے ذہن کا آدمی نہیں ہوں۔ ویسا آدمی، جیسا ہمارے ماحول میں عام طور پر 40 کے بعد کے مرد ہو جاتے ہیں...... انہیں کہیں بھی دیکھ لیجئے۔ بس اسٹاپ سے کلب اور اپنے خوبصورت دفتر کے 'رعب دار' کمرے میں اپنی حسین سکریٹری کو ڈکٹیشن دیتے ہوئے...... وہ اس بات پر دل کھول کر ہنستے ہیں کہ بغیر کرسیوں والے باس کے کمرے میں، باس کے 'بیٹھ جاؤ' کہنے پر نئی نئی آئی ہوئی سکریٹری نے اِدھر اُدھر کرسیاں تلاش کرنے کے بعد پوچھا تھا ـــــ کہاں بیٹھوں سر، یہاں تو کرسیاں ہی نہیں ہیں......'

وہ بہت کچھ گھر سے اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں...... پرانی بیوی کا اداس بستر...... اس کے ڈھلتے جسم کی 'سدا بہار' جوانی ـــــ اور پہلے جن پتھ Kiss کے نان وج لطیفے...... جانتا تھا، یہ سب اندر کا فرسٹریشن ہے اور کچھ نہیں...... ان ڈھلتی ہوئی عمر کی پائیدان پر کھڑے مردوں کے لئے جوانی کا اشتہار، بن جانے کی روایت کوئی نئی نہیں ہے...... جسم سونے لگتا ہے تو ہونٹ بولنے لگتے ہیں اور آنکھیں زہریلی ہونے لگتی ہیں......

لیکن......

انجلی کی ماں کے مرنے کے بعد سے لے کر اب تک، کسی Psychiatrist یا Sexologist کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں کبھی بھی گندی ذہنیت کا قائل، کبھی نہیں رہا...... 'ڈھلان' پر کی ڈھلان باتیں ـــــ نان وج لطیفے...... میں ان لطائف میں انجلی کی ماں کا مذاق نہیں اڑا سکتا تھا...... عورت میرے لئے دیوی یا تقدس کی مورتی نہ سہی، لیکن لائق احترام شئے ضرور رہی، اس لئے مجھے ہمیشہ خود پر ناز رہا...... میں ان ڈھلتی عمر کے بوڑھوں میں سے نہیں ہوں...... جو اندر کچھ باہر کچھ ہوتے ہیں......

لیکن یہ سب اچانک......

یہ میرے لئے عمر کا ایک نیا موڑ ہے ـــــ یار، یہ بیٹیوں میں ایک دم اچانک سے، لڑکیاں کیوں آجاتی ہیں......

''چلئے۔ مان لیا میں پرورٹیڈ نہیں تھا۔ پھر انجلی کے اندر گارمنٹس کو دیکھ کر ڈر کیوں گیا تھا......؟ حواس باختہ...... میری چیخ کیوں نکل گئی تھی ـــــ؟

بیٹی مقدس شئے ہے تو اس کے کپڑے بھی مقدس ہوئے...... پھر...... ؟ میں ڈر کیوں گیا تھا؟ چوہے کو جال میں چھپانے جیسا، کمبل ڈالنے کا واقعہ کیوں پیش آیا...... شاید، انسانی سائیکی ابھی بھی اپنے اندر کا بہت کچھ سراغ لگا پانے میں نا کام ہے......

مگر...... سرخ انقلاب اور

OO

'انجلی بڑی ہو رہی ہے......'

'کتنے کی...... چودہ...... چودہ کی ہوگئی، نا انجلی......' مسز ڈھلن میری آنکھوں میں جھانک رہی ہیں...... اُن کی آنکھوں میں شرارت ہے۔

'آپ کو...... آپ کو ہشیار رہنا چاہیے سر۔'

'کیوں؟'

'بس' کہہ دیا نا...... 'یہ عمر ہی ایسی ہے۔'

'یعنی 14...... 14 کی عمر......'

'سب سے سنسنی خیز...... لڑکیوں کے لئے سب سے سنسنی خیز عمر یہی ہوتی ہے...... اس عمر میں لڑکیاں Love Letter بھیجنا شروع کر دیتی ہیں......

'لو...... لیٹر......' میری سانس رک رہی ہے...... انجلی کا چہرہ ایک پل کو، آنکھوں کے آگے دوڑ جاتا ہے۔ یہ معصوم سی بچی...... آنکھوں کے پردے پر چھوٹے انجلی کے ہاتھ ہیں...... نہیں، یہ ہاتھ محبت بھرے خط نہیں لکھ سکتے......'

'کیا سوچ رہے ہیں سر؟ مسز ڈھلن مسکراتی ہیں۔ لیکن آپ کے لئے۔ آپ کے لئے 'یا غلط ہے سر...... آپ تو اس معاملے میں بہت لبرل ہیں...... یعنی...... مجھے لگتا ہے، آپ اس معاملے میں بھی انجلی سے شیئر کریں گے...... کیوں سر...... زمانہ بدل رہا ہے۔ بس انجلی کو پھسلنا نہیں چاہئے...... سمجھ رہے ہیں نا سر۔ بس اسی جگہ تھوڑا سا ہشیار رہنے کی ضرورت ہے......'

لیکن کیوں ضرورت ہے مجھے...... ؟ بڑے ہوتے ہی ہم اپنا زمانہ کیوں بھول جاتے ہیں۔ انجلی کی جگہ لڑکا ہوتا تو؟ تب تو چلا چلا کر اس کی پہلی پہلی محبت کی خوشی میں فائیو اسٹار میں ڈنر دیتا...... لوگ پوچھتے معاملہ کیا ہے؟ تو چلا کر کہتا...... میرے بیٹے کو پہلی بار کسی سے محبت

ہوئی ہے...... میرے...... بیٹے کو......

انجلی کی محبت پر پارٹی کیوں نہیں دے سکتا......؟

نہیں۔ انجلی لڑکی ہے۔ انجلی کو محبت نہیں کرنا چاہئے۔ لڑکیوں کے معاملے الگ ہوتے ہیں۔ مسز ڈھلن بتاتی ہیں۔ جب ان کی بیٹی سات سال کی ہوئی تھی اور مسٹر ڈھلن بہت پیار کرنے والی اپنی بیٹی کو باتھ روم سے نہلا کر ــــ ٹاول باندھ کر باہر لائے تھے ــــ تو ان کی ممی نے اسے سمجھایا تھا۔

Not, not again. اب بیٹی کو تم ہی نہلایا کرو۔

'لیکن کیوں ممی۔ وہ باپ ہے۔'

'باپ ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو مرد'

مرد......؟ باپ کو مرد نہیں ہونا چاہئے...... بیٹی۔ سگی بیٹی...... باپ کتنی کتنی باتوں سے محروم ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے۔

مسز ڈھلن نے پوچھا تھا......

'آپ۔ آپ کیا کرتے ہیں سر'

'میں انجلی کو سات آٹھ سال کی عمر تک خود ہی......'

مسز ڈھلن نے قہقہہ لگایا تھا...... وہی...... آپ نے کہا تھا، نا سر ــــ یہ بیٹیوں میں لڑکیاں کیوں آجاتی ہیں ــــ ماں غسل دیتی ہے تو بیٹیوں میں لڑکیاں نہیں آتیں ــــ بیٹیوں میں بیٹیاں ہی رہتی ہیں مگر......'

مسز ڈھلن نے کتنی آسانی سے یہ سچ اگل دیا تھا...... اور حقیقت تھی کہ انجلی کے پھیلتے جسم کے ساتھ ہی، تقدس کے رشتے نے، قدم قدم پر اپنی Limitations کی دیوار اٹھانی شروع کر دی تھی...... یہ جوان ہوتی لڑکیوں کا جسم اچانک لاؤڈ اسپیکر کی طرح چیخنے کیوں لگتا ہے......!

اور یہ چیخ میرے اندر اتر رہی تھی۔ ایک کمزور باپ کی آتما میں...... کیا انجلی کسی کو لیٹر لکھ سکتی ہے۔

'نہیں۔'

'کیوں؟'

'بس نہیں لکھ سکتی'

'کیوں نہیں لکھ سکتی؟'

'اس لئے کہ میری بیٹی ہے۔'

لیکن اس نے اگر لکھنا شروع کر دیا تو ـــــ؟ کالج ہے..... سارا دن اکیلے رہتی ہے..... اس نے کبھی اس بارے میں پوچھا نہیں ـــــ وہ اپنی تنہائیاں کس کے ساتھ شیئر کرتی ہے..... سارا دن کس طرح اپنا دل بہلاتی ہے..... کالج میں کیا کرتی ہے..... کالج سے کتنے بجے گھر واپس آتی ہے.....

سوچ کی رفتار رک نہیں پا رہی تھی.....

اور اس دن گھر میں داخل ہوتے ہی ایک بار پھر وہ ناز یبا واقعہ رونما ہو گیا تھا ـــــ

(6)

وہ اپنے کمرے میں تھی ـــــ وارڈ روب کے، ہینگر میں لپٹے کپڑے اس کے بستر پر پھیلے تھے ـــــ مجھے سامنے دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی ـــــ اس نے اپنے ہاتھوں کو اچانک پیچھے کر لیا تھا..... چھپا کر..... مسز ڈھلن کے لفظ میرے اندر چیخ رہے تھے.....

'کیا..... کیا بات ہے پاپا.....'

وہ چونکنا تھی ـــــ اس کی نظریں مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھیں۔ 'یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'

'کچھ نہیں۔'

'کچھ نہیں کچھ..... لاؤ دکھاؤ۔'

'نہیں پاپا.....'

'دکھاؤ.....'

'میں نے کہہ دیا نا، کچھ نہیں ہے پاپا۔'

'پھر چھپا کیوں رہی ہو۔'

بس ایسے ہی۔

'لاؤ دکھاؤ'، میں غصّے کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ وہ بستر سے چھلانگ لگاتی ہے..... یقیناً لو لیٹر..... اشارہ سے دکھانے کو کہتا ہوں۔ وہ پیچھے دیوار کی طرف، میری طرف منہ کئے ہٹتی ہے.....

'نو.....نو پاپا.....کچھ نہیں ہے۔ آپ جاؤ.....'

'نہیں.....لاؤ.....'

اور..... اب دیوار ہے۔ وہ پیچھے نہیں جاسکتی۔ وہ دیوار کے پار نہیں ہوسکتی۔ میں چیختا ہوں ـــــ اور وہ چور خط میرے سامنے کھول دیتی ہے..... انجلی کی آنکھیں بند ہیں۔ بدن تھر تھر کانپ رہا ہے۔ کھلے ہوئے ہاتھوں پر اس کی 'برا' اچانک سانپ کے پھن کی طرح میرے سامنے تن جاتی ہے.....

'نہانے جارہی تھی.....'

'کیا.....؟'

وہ اچھلی..... باپ کے سامنے جوان ہوتی عمر کے چغلی کھانے کا احساس اُسے اچھا نہیں لگا تھا ـــــ انجلی نے برا کو پھر سے مٹھیوں میں جکڑ لیا تھا اور باتھ روم بھاگ گئی تھی.....

OO

میں سرتاپا لرز رہا تھا۔

اس کی کھلی مٹھی میں جگنو نہیں تھے ـــــ تارے نہیں تھے ـــــ محبت بھرے خط نہیں تھے..... دھماکہ تھا..... اشتعال تھا۔ سنسنی خیزی تھی..... وہ شئے تھی، جس کے احساس سے ذہن، بدن کے خطوط ناچنے لگتا ہے.....

انجلی کی کھلی مٹھیاں..... انجلی کی بند آنکھیں..... پھر انجلی کا اچھل کر بھاگنا.....

یہ۔ یہ کیا ہو گیا..... کیا سمجھا ہوگا انجلی نے..... کتنا Guilt محسوس کیا ہوگا..... اس کا ذہن تناؤ کا شکار ہے۔ رگیں پھٹ رہی ہیں.....

میزائلیں مسلسل چھوٹ رہی ہیں.....

بدن۔ بارش۔ شاور..... اور کھلی ہوئی ہتھیلیاں ـــــ اور کھلی ہتھیلیوں کا چور ـــــ مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ اپنے آپ کو شانت کرنے کے لئے مجھے کچھ کرنا ہوگا.....

لیکن کیا کرنا ہوگا۔

انجلی۔ بدن۔ بارش۔ شاور اور کھلی ہتھیلیوں کا چور...... مجھے کچھ کرنا ہوگا......

واتسائن اور انجلی

انجلی اور واتسیائن......

مجھے کچھ کرنا ہوگا______

ٹہلتا ہوں۔ تیز تیز سانسوں کو دل کے کبوتر خانے میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہوں......

سانسوں کی لہروں کو سمجھاتا ہوں۔ اتنا تیز مت بہو......

کیوں......

مت بہو اتنا تیز......

انجلی بیٹی ہے۔ دو ایکم دو۔ دو دونی...... انجلی بیٹی ہے...... ٹہلتے ہوئے انجلی کی میز تک آ گیا ہوں...... کتنی گندی ہو رہی ہے یہ میز۔ کتابیں بکھری پڑی ہیں...... یہ آنکھیں______ ان کتابوں پر جمانے کی کوشش کرتا ہوں......

فزکس۔ کیمسٹری۔ الجبرا......

موٹی موٹی کتاب کے صفحات میرے ہاتھوں کا لمس جذب کرتے ہیں۔ کتنی مدت ہوگئی۔ انجلی کو ساتھ پڑھانے بھی نہیں بیٹھا۔ کبھی پوچھا بھی نہیں۔ دسویں پاس کرنے کے بعد کیا لیا...... سائنس یا آرٹس______ بس کالج اور ٹیوشن کے پیسے دیتا ہوں...... اور یہ کتابیں______ فزکس۔ کیمسٹری۔ الجبرا...... میز کتنی گندی ہو رہی ہے۔ روشنائی بھی گر گئی ہے۔ میز صاف کر رہا ہوں______ فزکس، کیمسٹری...... الجبرا......

انجلی کی کھلی ہتھیلیاں اور بند آنکھیں ذہن کی Retina پر Freeze ہو جاتی ہیں۔ انڈر گارمنٹس۔ پینٹی، برا اور...... فزکس۔ کیمسٹری......

پینٹی برا......

فزکس، کیمسٹری......

کتابوں کو قرینے سے سجا رہا ہوں......

یہ انجلی کی کتابیں ہیں اور وہ...... انجلی کے انڈر گارمنٹس۔

فزکس، کیمسٹری، الجبرا......

پینٹی اور برا......

میں وہیں کرسی پر بیٹھ گیا ہوں ـــــ ان میں فرق کیا ہے۔ کتابوں میں اور کپڑوں میں۔ دونوں انجلی کے ہیں......

انجلی میری بیٹی ہے......

کتابیں میز پر سجا سکتا ہوں تو بیٹی کے انڈر گارمنٹس چھوتے ہوئے بدن میں زلزلہ کیوں آجاتا ہے......

مقدس باپ کے ذہن میں کہیں کوئی ایک چور دروازہ بھی ہوتا ہے کیا......؟

اس چور دروازے سے ہو کر بیٹی لڑکی کیوں بن جاتی ہے......

فزکس......کیمسٹری......

کیمرہ پین ہوتا ہے ـــــ سرخ ٹائلس۔ باتھ روم...... باتھ روم کی دیواریں۔ سرخ بیسن۔ باتھ ٹب......ایک بار پھر شاور کے پاس ہی ہینگر سے جھولتے انجلی کے انڈر گارمنٹس......پینٹی اور برا......فزکس، کیمسٹری......الجبرا......

مڈشاٹ ـــــ کلوز میں، میں ہوں۔ میں نے ہاتھ بڑھا دیا ہے اور یہ کیا ـــــ میرے ہاتھوں سے سانپ کے پھن غائب ہو گئے ہیں......کلوز میں میرا ہنستا ہوا چہرہ......ڈیزالو......

انجلی کپڑے بدل کر کمرے میں آجاتی ہے......سجی ہوئی میز کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکراتی ہے......

I am proud of you, my papa ـــــ تم نے میری میز صاف کر دی۔

'کیوں؟' اس میں Proud کی بات کیا ہے؟'

'ہے کیسے نہیں؟'

'کیسے ـــــ؟'

'میری سہیلیوں کے پاپا ایسا نہیں کر سکتے۔'

'کیوں نہیں کر سکتے۔'

'بس نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ وہ میرے پاپا نہیں ہیں۔

وہ اُچھل کر اپنی بانہیں میرے گلے میں حمائل کرتی ہے۔I love you papa
'فزکس، کیمسٹری......الجبر......'

میں مسکراتا ہوا، اس کو اپنی بانہوں میں لیتا ہوں ——
انجلی میری بیٹی، تم اپنی ماں سے کتنی ملنے لگی ہو۔'
'ماں سے؟' وہ ہنستی ہے —— ''مسکراتی ہے۔اسی لئے پیار ہو رہا ہے۔کیونکہ مجھ میں ماں آ گئی ہے۔''

انجلی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے......وقت نے یہ منظر یہیں فریز کر دیا ہے......

○○○

انکیوبیٹر

(اپنی بٹیا صحیفہ کے لئے ـــــــ جو دو برس کے سفر میں
اتنا کچھ دے گئی، جو پوری زندگی پر بھاری ہے)

نرسری

سیمون دبووار (Simone De Beauvoir) نے کہا تھا۔

'عورت پیدا نہیں ہوتی، بنائی جاتی ہے۔'

لیکن، نیل پیدا کہاں ہوئی تھی۔ نیل تو بن رہی تھی۔ نیل تو ہر بار بننے کے عمل میں تھی۔ شاید اسی لئے، پیدا ہوتے ہی وہ ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال بھیج دی گئی تھی۔ اُسے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ماں نے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ کہنا چاہئے ڈاکٹروں کو چھوڑ کر، جو آپریشن کے وقت یقیناً پاس پاس لیبر روم میں موجود ہوں گے، یا جیسے ڈاکٹروں نے بھی ہنستے ہوئے کہا ہوگا.... ''وشواس کیجئے ـــــــ ہم نے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن وہ ہے۔ اور سانس چل رہی ہے۔'

اور...... ڈاکٹروں کے مطابق نیل پیدا ہو چکی تھی اور سانس بھی چل رہی تھی...... اور اب صرف اس کے بچائے جانے یعنی زندہ رکھنے کی کارروائی باقی تھی۔ جس اسپتال میں نیل پیدا ہوئی، وہاں نرسری کا کوئی اچھا انتظام نہیں تھا۔ اس لئے ڈاکٹروں نے ایک چھوٹی سی ایمرجنسی میٹنگ کے بعد نیل کو ایک دوسرے اسپتال شفٹ کر دیا تھا۔

نیل اسپتال سے گھر نہیں آئی۔ نیل ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال چلی گئی...... جس

ایمبولنس میں اسے دوسرے اسپتال شفٹ کیا گیا، اس میں نیل کے ساتھ رشتے کے ایک بھائی کو بٹھایا گیا۔ واپسی میں اس بھائی سے پوچھا گیا......

تم نے اسے دیکھا؟

......نہیں

کیوں؟ تم تو ایمبولنس میں اس کے پاس ہی بیٹھے ہو گے نا؟

......ہاں بیٹھا تو پاس ہی تھا، مگر!

......مگر کیا؟

وہ نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے......

بھائی سر کھجا رہا تھا۔ آنکھیں چرانے کی کوشش کر رہا تھا......

○○

مدر نرسری میں سب کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسپتال کی پانچویں منزل پر یہ نرسری آباد تھی۔ نومولود، ابھی ابھی پیدا ہوئے بچے کی آرام گاہ...... یہ پورا ہال ہی ائیر کنڈیشنڈ تھا...... اندر شیشے کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی دنیا...... شیشے کے اس عجیب وغریب ڈزنی لینڈ میں چھوٹے چھوٹے لاتعداد انکیوبیٹر پڑے تھے...... چھوٹے چھوٹے شیشے کے گھروندے...... ان گھروندوں میں ایسے نومولود بچوں کے لئے ایک نقلی دنیا آباد تھی۔ یعنی جیسی دنیا وہ آنکھیں جھپکاتے ماں کی کوکھ میں دیکھتے یا محسوس کرتے ہوں گے۔ شیشہ کی اس چھوٹی سی دنیا کے اندر کا ٹمپریچر بھی وہی تھا جو ماں کی کوکھ میں بچہ محسوس کرتا تھا...... انکیوبیٹر میں آکسیجن کی ٹیوب بھی لگی تھی۔ مگر دور سے، شیشے کے بڑے دروازے سے جھانکنے پر، یہ ڈھیر سارے چھوٹے چھوٹے گھروندے ہی لگتے تھے......

'نیل کہاں ہے؟'

مدر نرسری دکھانے والا، ڈاکٹر جوش میں ہاتھ کے اشارے سے کچھ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا......

'وہ...... وہ رہی نا......'

......وہ......موٹا سا بچہ......

'نہیں اس کے پاس والا......'

......اچھا۔وہ، جو بے بی الٹی پڑی ہے......

'نہیں، اس کے دائیں طرف دیکھئے۔'

......وہ۔مگر وہ انکیو بیٹر تو......

'خالی ہے'......ڈاکٹر مسکرا رہا تھا۔وہ بن رہی ہے۔وہ ہے اور آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'

OO

واپس اسپتال آکر میں نے اس کی ماں کو یہ مژدہ سنادیا۔ماں کو اب ہوش آچکا تھا۔بیٹی ہونے کی اطلاع ڈاکٹر اسے دے چکے تھے۔یہ بھی بتایا جاچکا تھا، کہ وہ مدرنرسری بھیج دی گئی ہے۔مجھے دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں تجسس کے دیئے ٹمٹمائے تھے۔

......تم نے دیکھا۔

ہاں

......کیسی ہے، وہ......؟

وہ......ہے......یعنی کہ......

کس پر گئی ہے......

......گئی نہیں ہے۔بن رہی ہے۔گھبراؤ نہیں، جب تک، تمہیں مکمل طور پر گھر جانے کی اجازت مل جائے گی، وہ بن چکی ہوگی......

''مطلب۔؟''

......فکر مت کرو۔وہ بن رہی ہے اور دیکھتے دیکھتے۔ہاں تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا، وہ تمہارے سامنے آکر کھڑی ہو جائے گی۔وہ خوب زور سے چیخے گی اور تم چہرے کو انتہائی سنجیدہ بنا کر کہو گی......نیل۔بی ہیو یور سیلف۔

لیکن، ماں شاید اب کچھ بھی سن نہیں رہی تھی۔

ماں ایک لمبی خاموشی میں ڈوب گئی تھی۔

ترپتی مینن کے دو رنگ (ادب اور آرٹ)

ترپتی مینن......ایک ایسی خاتون جن کے بارے میں، میں بار بار الگ الگ نظریے گڑھتا تھا اور نظریے کچی مٹی کے گھڑے کی طرح ٹوٹ جاتے تھے......نہیں، مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ ہماری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی۔ یا ترپتی مینن میں یاد رکھی جانے والی کون سی ادا یا بات تھی کہ میں نے پہلے پہل اپنی نوٹ بک میں......پھر آہستہ آہستہ اس کی 'اول جلول' اداؤں کو دل کی گرہ میں باندھ لیا......

'چلو خالی وقت کا ایک سامان تو ہوا'......

پہلی بار میں ہم بہت کم بولے تھے......مجھے یاد ہے، اس وقت بھی ہمارے مکالمہ کا عنوان عورت تھی۔ وہ ایک ہندی میگزین میں اپنی کہانی چھپوانے آئی تھی۔ میگزین کے ایڈیٹر میرے بزرگ دوست تھے......آنکھوں پر کالا چشمہ۔ بڑھی ہوئی داڑھی......نام تھا، رادھیکا رمن۔ رادھیکا جی درویش صفت منش ہیں۔ مگر کچھ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ بقول رادھیکا جی، کہ 'چٹکی' لینے کی خواہش زور پکڑنے لگتی ہے......چائے آگئی تھی۔ ترپتی مینن آہستہ آہستہ چائے کی سپ لے رہی تھی۔ دھیان کہیں اور تھا۔ آنچل ذرا سا ہٹ گیا تھا۔ سانولی بانہیں......نیم عریاں، آدھی سوئی ہوئی بہار کے قصے سنا رہی تھی۔ چہرے پر ایک تیکھی مگر بچوں جیسی مسکراہٹ تھی۔ ترپتی بار بار رادھیکا جی کے مذاق کی عادت پر پسری جا رہی تھی۔

عورت میں ہر بار ایک نئی عورت آجاتی ہے......یہ رادھیکا جی تھے۔

عورت میں ہر بار ایک عورت گم ہو جاتی ہے......یہ میں تھا۔

عورت......آپ لوگ اسے عورت کیوں نہیں رہنے دیتے......یہ ترپتی تھی۔

○○

میں نے پہلی بار اداؤں میں ڈوبے اُس کے جسم کا جائزہ لیا۔ اس جسم میں کتنی بہاریں قید ہوں گی۔ چالیس......چالیس بہاریں۔ مگر ترپتی جانتی تھی، خزاں سے پہلے اس بہار کی کیسے حفاظت کرنی ہے۔ مگر ہر بار نوخیز اداؤں کی گرفت میں اس کا پورا وجود ایک 'جوکر' میں تبدیل ہوا جا رہا تھا۔

تم اپنی عمر کو نہیں بھولی ہو......رادھیکا جی نے پھر چٹکی لی۔

''عمر کو......''

میں آہستہ آہستہ مسکرا رہا تھا......

'میں سمجھی نہیں......' ترپتی کے سانولے چہرے پر بجلی دوڑ گئی تھی۔

''سب سمجھتی ہو تم۔ گھر سے چلتے ہوئے عمر کو کسی لاک اَپ میں بند کر کے آتی ہو......

پھر واپس آ کر جب عمر کو لاک اَپ سے نکالنے کی کوشش کرتی ہو تو......'' رادھیکا رمن مسکرائے......

یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں ہے ترپتی۔ تمہاری جیسی تمام عورتوں کا مسئلہ ہے۔

'نہیں۔ سر، میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'

'اور مینن؟'

'ہم نے لو میرج کی ہے......'

'لو (Love) تم نے کیا تھا یا مینن نے کیا تھا......''، رادھیکا رمن زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولے......

نیم عریاں شانے پر اس نے آنچل پھر سے بار بار کر دیا تھا......'' اب...... اب میں چلوں گی سر۔ کہانی دیکھ لیجئے گا'

چہرے پر ناراضگی تھی۔

'ارے بیٹھو......'

'نہیں سر۔ آج آپ کچھ زیادہ ہی مذاق کر رہے ہیں۔'

'اس نے کرسی خالی کر دی۔ گولڈن کلر کا بیگ شانہ سے لٹکایا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دروازے سے اوجھل ہو گئی......

'ترپتی ناراض ہو گئیں......' میرے لئے یہ پہلا اتفاق تھا۔

رادھیکا رمن ہنس رہے تھے......'' پاگل مت بنو۔ ترپتی کو تم نہیں سمجھو گے.. ہو ہو.. وہ یہی کرتی ہے۔ عادت ہے اس کی.. ہو ہو.. دراصل وہ چاہتی بھی یہی ہے۔''

'کیا۔'

'جو میں نے کیا......' وہ مسکرا رہے تھے۔

'مطلب؟'

'ارے۔ اس میں حیرانی کی بات کیا ہے۔ اپنشدوں میں کہا گیا ہے۔ ناری کو نہ سمجھو تو

بہتر ہے..... ناری سمجھنے کی وستو نہیں ہے۔ رہسیہ ہے۔ گھور رہسیہ..... ترپتی اسی رہسیہ کا حصہ ہے..... ایسا نہیں کرو تو وہ ناراض ہو جاتی ہے۔ ناراضگی پر کیوں جاتے ہو۔ اس میں پراکرتک سوندریہ، کیوں نہیں، دیکھتے۔..... اس آیو میں بھی..... تم نے دیکھا..... سانولے جسم میں سارے سمندر کی 'سنہلی'، مچھلیاں ایک ساتھ کہاں جمع ہوتی ہیں..... ان ساری 'سنہلی' مچھلیوں کو جوڑ کر ترپتی ایک بہت لمبی 'سنہلی' مچھلی بن گئی ہے۔''

وہ ہنس رہے تھے..... اس مچھلی کے پیچھے دوڑو گے..... بولو.....؟'

○○

لیکن مجھے زیادہ دور تک دوڑنے کی ضرورت نہیں پڑی.....

یہ ترپتی سے میری دوسری ملاقات تھی۔

وہ کارلٹن آرٹ گیلری میں کھڑی تھی..... ایک لمحے کو میں نے اس سے چھپنے کی کوشش کی..... وہ کسی کو اپنے بارے میں بتارہی تھی۔

'انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ کرافٹس سے کمرشیل ڈیزائن کا کورس کیا ہے۔ آرٹ میرا شوق نہیں ہے۔ زندگی ہے۔ سانسیں ہیں۔ آئل ان کینوس کے علاوہ آئل آن پلائی وڈ، واٹر کلر پیسٹل، پین اینڈ انک، پلاسٹر آف پیرس، سیمنٹ آن گلاس وغیرہ میڈیمز میں کام کر چکی ہوں۔'

درمیان میں اس کی کھنکدار ہنسی گونجی.....

'پچھلی بار فیسٹیول آف ویمن سیریز میں، میں نے بھی اپنی کچھ تصویروں کی نمائش لگائی تھی۔'

میں ایک دم سے چونک گیا تھا.....

موٹے بھدّے جسم والی خاتون نے حیرت سے دریافت کیا..... 'آپ..... یعنی آپ بھی۔'

'کیوں' ترپتی مسکرائی ہے..... '' آئل ان کینوس۔ کبھی کبھی کینوس پر صرف آئل بچتا ہے اور عورت آئل کی طرح پوچھ ڈالی جاتی ہے..... نہیں؟ ایک کورا کینوس..... میں نے عورت کے 'رحم' کو دکھانے کی کوشش کی تھی۔

'رحم'.....؟'

رحمِ مادر یعنی 'Womb' ...... جہاں نو مہینہ تک بچے کے روپ میں ایک مرد سڑتا ہے۔
پتہ ہے۔ میرے شوہر تک جب اس نمائش کی بات پہنچی تو وہ پانچ مہینے تک مجھ سے غصہ رہے تھے۔
بات چیت کمپلیٹلی بند۔ میں نے بھی کوشش نہیں کی...... عورت کا ننگا بدن۔ آپ دکھانا ہی چاہتے
ہیں تو وہ جگہ کیوں نہیں دکھاتے جہاں سے سرشٹی، یعنی ایک عورت Creator بنتی ہے۔ رچیتا۔ مرد
کو جننے والی۔ خالق۔ اب یہاں دیکھئے نا......

وہ آرٹ کے عریاں فن پاروں کو دکھا رہی تھی۔

'دکھانا ہے تو عورت کو پورا پورا ننگا کرنے سے کیا حاصل۔ بس وہ جگہ دکھا دو، جو مرد
دیکھنا چاہتا ہے۔'

'مائی گاڈ۔ ترپتی۔ تم میں کتنا دکھ بھرا ہے۔ Leave it یار۔ پینٹنگس دیکھتے ہیں۔'

ترپتی اچانک مڑی تھی...... مڑی اور چونک گئی۔ میری طرف دیکھا۔ مسکرائی۔ ہاتھ نہیں
بڑھایا۔

'آپ'؟

'مجھے نہیں ہونا چاہئے تھا......!'

'نہیں۔ ہونا کیوں نہیں چاہئے تھا۔' وہ جھینپ رہی تھی...... کب آئے؟

شاید وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ آپ دیر سے تو نہیں ہیں۔ ہماری بات تو نہیں سن رہے
تھے۔ میں نے جھوٹ بولنے ہی میں عافیت سمجھی......

'بس۔ ابھی آیا۔'

'اوہ۔' ترپتی کو تسلی ملی تھی...... موٹے جسم والی عورت سے پیچھا چھڑاتے ہوئے اب وہ
میرے ساتھ پینٹنگس پر اپنی تنقیدی نظر ڈال رہی تھی۔

'اچھی ہیں نا......'

'ہاں'

'دراصل۔' وہ کہتے کہتے ٹھہری...... 'مجھے موڈس والی پینٹنگس کچھ زیادہ ہی پسند ہیں۔
اسکیچنگ ورک، فیگر یٹو ورک اور ریلسٹک اپروچ مجھے پسند ہیں۔ ان تصویروں میں امپریشن ازم
کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

'کیوں'...... میں تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ایک سانس میں اپنی معلومات کی توپ چھوڑتی چلی گئی۔ وہ کمپوزیشن اچھا ہے۔ فلاں غلط۔ وہاں کینواس کی سطح کم گاڑھی ہونی چاہئے تھی۔ فلاں تصویر میں Base بناتے ہوئے ٹیکسچر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناہموار سطح پر پاور فل اسٹروکس کے ذریعہ رنگوں کا خوبصورت استعمال کیا جانا چاہئے تھا......'

'رنگ......' میں نے ایک لمبی آہ کھینچی تو وہ چونک گئی۔

'زندگی سے رنگ جھڑ جائیں تو......؟'

'' آرٹ گیلری سے باہر بھی ملاقات کا ایک راستہ جاتا ہے۔'

وہ اداس ہوگئی تھی...... Sorry'

'Sorry کیوں؟'

تمہارا نمبر ہے؟''

'نمبر۔'

'میں فون کرلوں گی۔'

اس کے جسم میں تھرتھراہٹ تھی...... پرانی ترپتی غائب تھی...... میں ایک نئی ترپتی کو دیکھ رہا تھا۔ جو ڈر رہی تھی...... یا ڈرنے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

رادھیکا جی کے لفظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ ناری گھور رہسیہ ہے۔ ترپتی اسی رہسیہ کا حصہ ہے......'

میں نے ترپتی کو نمبر لکھوا دیا......

آرٹ گیلری سے سڑک دو الگ، الگ دشاؤں میں مڑ گئی تھی۔

آثار قدیمہ اور ترپتی کا تیسرا رنگ (میوزک)

صحافیوں کے لئے یہ دنیا ایک سیپ کی طرح ہے۔ یہ بات کس نے کہی تھی، یاد نہیں۔ لیکن فرصت کے اوقات اس بارے میں سوچتا ہوں تو اپنی ذات سیپ کی 'ڈگی' میں بند 'گھونگھے' سے زیادہ نہیں لگتی...... بس بھاگتے رہو...... بھاگتے بھاگتے تھک جاؤ تو اپنی چھوٹی سی دنیا میں بند ہو جاؤ اور آپ جانئے...... فری لانس جرنلسٹ کو کیسے کیسے محاذ پر لڑنا ہوتا ہے...... اس دن طبیعت ناساز تھی لیکن میگزین کی طرف سے بھارت سنگاپور اتسو، میں شامل ہوکر اس کی رپورٹ تیار کرنی تھی۔

بانسری کا مجھے کبھی شوق نہیں رہا۔ بچپن کے دنوں میں ہونٹوں سے لگایا ہو، اب یاد نہیں۔ لیکن ہری پرساد چورسیا میں میری دلچسپی ضرور تھی...... اور یہی دلچسپی مجھے اس اُتسو میں کھینچ کر لے گئی تھی...... فکّی آڈیٹوریم کا مین ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کسی نے مجھے ذرا سا دھکا دیا اور تیز تیز اندر کی طرف قدم بڑھائے۔ میں غصہ میں کچھ بولنا چاہتا تھا کہ ٹھہر گیا۔

'ترپتی۔'

OO

یہ ترپتی سے میری تیسری ملاقات تھی۔ شو شروع بھی ہوا اور ختم بھی ہو گیا۔ میں برابر اس پر نظر رکھے ہوا تھا۔ وہ ہال میں ہو کر بھی ہال میں نہیں تھی۔ کسی چور جیسی، اپنی سیٹ پر دُبکی ہوئی تھی...... بلی کی طرح سہمی ہوئی۔ آہٹ سے ڈر ڈر جانے والی۔ شو ختم ہونے کے بعد میری نظروں نے اس کا تعاقب کیا۔ گیٹ کے پاس ہی میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

'آہ ترپتی۔ یہاں بھی تم۔'

'ہاتھ چھوڑو......' اس کے لہجہ میں سختی تھی...... میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ میں خود تم سے ملنے والی تھی۔

میں نے ہاتھ ہٹا لیا...... 'شو کیسا لگا تمہیں؟'

وہ ابھی بھی کہیں اور تھی۔ بھیڑ سے الگ ہم باہری گیٹ سے دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ نکلنے والی گاڑیوں کا شور انسانی شور سے کہیں زیادہ تھا۔

'بہلانے آئی تھی خود کو۔ مگر بور...... انڈین اوشن کے اس 'بینڈ' کو دیکھا تم نے......' اس کے لہجے میں کڑواہٹ تھی...... فن مر گیا ہے۔ ہم دو سنسکرتیوں کو ملا دینا چاہتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ ایک جھوٹا تماشہ۔ تمہیں لکھنا چاہئے۔ بھارتیہ سروں کا یہ کیسا میل ہے۔ جاز، ریگے، راک، پاپ اور بھارتیہ سنسکرتی کا بریک فاسٹ ملا دیا۔ مکچر تیار۔ کلچرل موٹف کو نئے ماڈرن ڈھانچہ میں ڈال دیا اور نیو جنریشن کے سامنے پروس دیا۔ یہی 'فیوزن' ہے...... سکڑتی سمٹتی دنیا کو، پاگل بنا دینے والی میوزک کمپنیوں کا دیا ہوا دیشی تحفہ ——

'تمہیں فیوزن سے چڑھ کیوں ہے؟'

آپ اسے ویسے کا ویسا رہنے کیوں نہیں دیتے، جیسا کہ وہ ہے۔ لیکن نہیں۔ بات

پروفیشنل منافع کی ہے۔۔۔۔۔۔ کنزیومر ورلڈ کی ہے۔۔۔۔۔ بازار کی ہے۔۔۔۔۔ آپ وہی تہذیب فروخت کریں گے، جس کی وودیشوں میں مانگ ہے۔'

اس کی ہرنی جیسی آنکھیں اب بھی سہم سہم کر اِدھر اُدھر دیکھ لیتی تھیں...... سنو'

اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ تھاما......

'مینن ایک ہفتہ کے لئے باہر گئے ہیں۔۔۔۔۔ ساؤتھ۔۔۔۔۔ کل آسکتے ہو۔'

'کس وقت؟'

'شام کے وقت۔'

تیزی سے آتے ہوئے آٹو کو اس نے ہاتھ دے کر روک لیا تھا...... مینن غلطی سے گاڑی کی چابی اپنے ساتھ لے گئے۔ آؤ گے نا؟'

اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا۔ آٹو پر بیٹھی اور آٹو روانہ ہوگیا۔ میرے ہاتھ میں ایک چھوٹے سے کاغذ کی پرچی تھی۔ جس پر اس کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ لیکن یہ ایڈریس اس نے کب لکھا۔ جب وہ ہال میں تھی۔ یا۔ مجھے دیکھ کر وہ پہلے سے ہی مجھ سے ملنے کا من بنا چکی تھی۔

'ناری گھور رہسیہ ہے وستو ہے'...... مسکراتے ہوئے میں نے کاغذ جیب کے حوالے کردیا۔

OO

کال بیل کی پہلی آواز پر ہی دروازہ کھل گیا۔ شاید وہ میرے انتظار میں تھی۔ میرے اندر آتے ہی اس نے 'کھٹاک' سے دروازہ بند کردیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ترپتی کے چہرے پر اب بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''مینن صاحب کب آئیں گے؟''

''پتہ نہیں''

میں نے گھر کی سجاوٹ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا...... 'مینن صاحب کرتے کیا ہیں؟

ترپتی بجھ گئی تھی۔ آہستہ سے بولی۔ ان کا تعلق محکمۂ آثار قدیمہ سے ہے۔

ترپتی مینن کی آواز اس بار برف کی طرح سرد تھی...... 'وہ ہر بار کچھ نہ کچھ برآمد کر لیتے

ہیں۔ محنتی اور سخت ــــــ صرف اور صرف اپنے کام پر یقین رکھنے والے ــــــ لیکن ہر بار...... مجھے تعجب ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ......'

'جیسے؟'

'کوئی...... قدیم تہذیب ــــــ قدیم شہر......' ترپتی مینن نے اپنی زلفوں کو جھٹکا دیا ــــــ آنچل اُس کے سیاہ جمپر سے پھسل کر گود میں آگرا تھا ــــــ لیکن ترپتی نے آنچل کو اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ اُس کی عریاں بانہیں نمایاں تھیں۔ 'صندلی' برہنہ بازؤں کے گوشت آہستہ آہستہ چنگاریاں دینے لگے تھے۔ ترپتی کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

OO

''وہ ہر بار کچھ نہ کچھ برآمد کرلیتا ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے۔ وہ آج تک مجھے برآمد نہیں کرپایا۔ اپنی بیوی کو......'

ترپتی نے جیسے اپنے آنسو پونچھے ہوں! دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے جذباتی لہجے پر قابو پالیا تھا۔ ارے میں تو بھول ہی گئی۔

'کیا؟'

'آپ پہلی بار آئے ہیں۔ اور شاید......' اس کا لہجہ داس تھا۔

'مینن صاحب ہوتے تو......'

'میں ہمت تو کُجا، سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'

'کیوں؟'

پتہ نہیں۔ وہ مسکرائی...... 'پہلے چائے۔ آپ چائے لیں گے یا کافی۔'

'کچھ بھی چلے گا۔'

OO

ترپتی کیبن میں گئی تو میں نے اس کے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیوار پر دو خوبصورت بچوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ کمرے میں ایسا بہت کچھ تھا، جو ترپتی کے ذوق وشوق کی کہانیاں بیان کررہا تھا ــــــ دیوار پر ٹنگی تصویروں میں ایک بچہ کم از کم تیرہ سال کا ہوگا۔ دوسرا دس کے آس

پاس۔ ترپتی تو اتنی عمر کی نہیں لگتی۔ کیا پتہ۔ ساؤتھ کے رتی رواج اور کلچر کے بارے میں ہم ابھی بھی کتنے انجان ہیں۔

ترپتی کافی لے کر آئی تو میں نے دیوار کی تصویر کی طرف اشارہ کیا ـــــــ

'میرے بچے ہیں۔' ترپتی نے سر جھکا لیا۔

تمہارے یا مینن کے؟' میری آنکھیں اس کی آنکھوں میں سما گئی تھیں۔

مینن کے۔ میں ان کی دوسری بیوی ہوں۔ پہلی بیوی اتفاقیہ طور پر......

اس کا گلا بھر آیا تھا......

'تم نے کہا تھا، مینن سے تمہاری لو میرج ہوئی تھی۔'

وہ سامنے بیٹھ گئی۔ کافی آہستہ آہستہ سڑکتی رہی...... ہاں لو میرج کی تھی۔ کسی کسی لمحے کا بوجھ ساری زندگی ڈھونا پڑتا ہے۔ انہی دنوں مینن کی پتنی کا دیہانت ہوا تھا۔ وہ گھر آئے تھے۔ بابو جی سے ملنے۔ اُن دنوں...... بزنس میں مسلسل گھاٹے کی وجہ سے سارا گھر پریشان چل رہا تھا۔ بابو جی نے مینن کے بارے میں بتایا۔ یہ بھی، کہ وہ آثار قدیمہ میں ہیں۔ سامنے بیٹھا ہوا آدمی مجھے ایسا ہی کچھ لگ رہا تھا...... کسی کھنڈر یا قدیم تہذیب سے نکلا ہوا...... بس میں آہستہ سے مسکرا دی۔'

'پھر سودا ہو گیا......؟'

'ہاں۔ تم اسے سودا بھی کہہ سکتے ہو...... گھر والوں کو صرف میری فکر تھی۔ میرا کیا ہوگا۔ میں دودھ سے بالائی کی طرح ہٹا دی گئی تو سارا نقصان پورا ہو گیا۔ میں مینن کے ساتھ خوش تھی مگر......'

کافی کا پیالہ اس نے میز پر رکھ دیا۔ میں نے اسے بغور دیکھا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی نائیٹی پہن نہیں رکھی تھی...... نائیٹی کے 'وی' شیپ سے گولائیوں کی پہاڑی جیسی ڈھلان میں ایک بے حد خوبصورت منظر کی عکاسی کر رہی تھیں۔ نیلے پربتوں کے درمیان ایک ہلکی سی کھائی برانگیختہ کرنے والی تھی...... اس نے نظر جھکا لیا تھا۔

'تحفہ میں دو بچے ملے تھے۔ ان بچوں کی اپنی زندگی تھی...... اس زندگی میں، میں نہیں تھی۔ میں ایک نقلی عورت بن کر اس زندگی میں داخل ہونے کی کوشش تو کرتی رہی ــــــ شاید

مینن کوخوش کرنے کے لئے ۔مگر...... بچوں نے صاف کہہ دیا۔

''ماں بننے کی جستجو میں دوسری عورت ایک فاحشہ بن جاتی ہے۔فاحشہ......''

مجھے وہ لمحہ یاد ہے۔ دن تاریخ یاد ہے...... چودہ فروری ویلنٹائن ڈے ــــــ رات ساڑھے سات بج کر بیس منٹ...... فاحشہ...... بچوں کے لفظ چہرے پر آ کر جھریاں بن گئے ــــــ پل میں خوشیوں کے انگور سوکھ کر کشمش ہو گئے ــــــ مجھے لگا، بچوں نے ریوالور کی تمام گولیاں میرے بدن میں اتار دی ہیں۔ میں چیختی ہوئی غصے سے پلٹی تو وہیں کنارے میز پر ــــــ جلتے ہوئے لیمپ کی روشنی میں مینن بہت سے کوڑے کباڑ کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا......

'تم نے سنا۔' میں روتی چیختی ہوئی زور سے گرجی تھی۔

'ہاں سنا۔مگر یہ دیکھو...... یہ......' اس کے چہرے پر ذرا بھی شکن نہیں تھی...... میں سانسوں کے رتھ پر سوار تھی...... جیسے لکڑی کے 'سانچے' سے ــــــ لحاف میں روئی بھرنے والے ــــــ روئی ڈھنکتے ہیں۔ میں سانسیں 'دھنک' رہی تھی...... مینن کہہ رہا تھا۔ یہ دیکھو......'

میں دیکھ رہی تھی۔ میز پر کباڑ پڑا تھا...... ہاں کباڑ۔ جیسے کبڑیا گندہ نالا صاف کرنے والے پرانی ٹوٹی پھوٹی اشیاء کو دھو پوچھ کر رکھ لیتے ہیں......

میں سانسیں 'دھن' رہی تھی...... ''ان بچوں نے مجھے......''

'رنڈی کہنے سے کوئی رنڈی نہیں ہو جاتا...... سنا ہے......' اس کا چہرہ تاثر سے عاری تھا۔ میں نے ایک تیز چیخ ماری...... غصے میں میز الٹ دی۔ دوسرے ہی لمحے مینن کے لات جوتوں کی زد میں تھی۔ وہ مجھے ویسے ہی ڈھن رہا تھا جیسے لحاف میں پرانی روئی بھرنے والے...... وہ مجھ پر سڑی گلی گالیوں کی بوچھار کر رہا تھا۔ بچے مشینی انداز میں، پڑھائی کرنے میں لگے تھے۔

مینن چیخ رہا تھا...... ' جاہل عورت۔ پتہ ہے تم نے کیا کر دیا ــــــ تہذیب۔ قدیم تہذیب...... ارے آرکیالوجیکل سروے سے ملی تھی یہ نادر چیزیں ــــــ بدقسمت عورت۔ برسوں کی کھوج کے بعد تو یہ خزانہ ملا تھا۔ ہم جس کے لئے مدتوں بھٹکتے رہے ہیں۔ تال سے پاتال تک...... اسٹوپڈ...... ڈاٹر آف سوائن۔ بچ...... اس نے مجھے دیوار کی طرف ڈھکیلا...... شکل دیکھی ہے...... بچے ٹھیک کہتے ہیں۔ بچے کوئی غلط نہیں کہتے......''

'میں فاحشہ ہوں'...... ترپتی، اچانک میرے سامنے آکرتن گئی تھی ——— اتنے قریب کہ میں سانسوں کی سرگم سننے لگا تھا...... میں فاحشہ ہوں...... میرے بدن کے 'تاروں' سے روئی کے گولے بکھرتے چلے گئے۔ اس نے نائیٹی ہوا میں اڑادی...... میں نے اسے مضبوط بانہوں کے شکنجے میں لے لیا۔

'روئی دھننے والے' کی آواز آہستہ آہستہ مدھم مدھم ہوتی ہوئی ایک دم سے کھوگئی ——— وہ اٹھی۔ نائیٹی پہنی۔ دل کھول کرمسکرائی۔ میرے گالوں کو پکڑ کرزور سے بوسہ لیا۔ آہستہ سے بولی ——— تھینک یو۔ واش بیسن پر پانی کے دو چار چھینٹے چہرے پر مارے۔ پھر مسکراتی ہوئی سامنے آکر بیٹھ گئی......

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

'وہ بچوں کو بھی لے گیا......؟'

'ہاں۔ میرے پاس اکیلے رہنے سے وہ اور بچے دونوں ہی خود کو ان سیکورفیل کرتے ہیں۔'

'شاید اسی لئے تمہاری آتما بھٹکتی رہتی ہے۔ کبھی میگزین کا دفتر۔ کبھی آرٹ گیلری، کبھی میوزک ورکشاپ ———'

میں ایک آترپت آتما ہوں۔ وہ ہنس رہی تھی...... شاید اسی لئے ماں باپ نے مذاق کے طور پر میرا نام ترپتی رکھ دیا۔

میں نے کپڑے پہن نہیں لئے تھے ——— وہ اچانک اٹھی۔ بے اختیار ہوکر ایک بار پھر میرے جسم سے لگ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔

'ترپتی...... ترپتی'...... میرے ہاتھ بارش بن گئے تھے...... اُس کے جسم کے لئے...... اس کے تھرتھراتے مچلتے جسم کے لئے۔ وہ ہرجگہ برس رہے تھے۔ بوسوں کی بارش کررہے تھے...... پھر جیسے بجلی تیزی سے گرجی۔ اسے جیسے غلطی کا احساس ہوا ہو۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹی۔ میری طرف دیکھ کر ہنسی...... پھر بولی......

''آخر اسے ایک تہذیب مل گئی۔ جس کی کھوج میں وہ برسوں سے لگا تھا۔ ایک قدیم

تہذیب...... یہ اس ڈراوَنے ویلنٹائن ڈے کے چوتھے دن بعد کا قصہ ہے۔ مسوری، ہماچل وغیرہ میں برف گری تھی شاید۔ سردی اچانک تیز ہوگئی تھی...... وہ رات کے 3 بجے آیا۔ میں سوگئی تھی۔ عام طور پر جب میں اکیلے ہوتی ہوں۔ بیڈروم میں ـــــ تو برائے نام لباس پہنتی ہوں...... وہ مجھے اٹھا رہا تھا۔ جانوروں کی طرح......

''ہوہو..اٹھو..اٹھو۔''

میں نے سمجھا، ایک جانور پیاسا ہے۔ عام طور پر وہ اسی طرح، ایک بے حس جانور کی طرح اپنی بھوک مٹاتا تھا۔ رات کے تین بجے اُٹھا کر اس نے مجھے صوفہ پر بیٹھا دیا۔ وہ خوشی سے جھوم رہا تھا۔ 'جھومر' کی طرح مسکراہٹ اس کے پور پور سے روشنی دے رہی تھی۔

'بولو۔ اُٹھایا کیوں۔ میں گہری نیند میں تھی۔''

'مل گیا۔ یوریکا۔'' اسے میرے لفظوں کی، نیند کی فکر نہیں تھی...... ''تمہیں یاد ہے...... وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا ـــــ میں نے بتایا تھا نا، 1991ء کے آس پاس جرمن سیاحوں کو آلپس کی پہاڑیوں پر ٹہلتے ہوئے انسانی اعضاء ملے تھے۔ یاد ہے؟ وہ بیسویں صدی کی سب سے عظیم دریافت تھی ـــــ سب سے عظیم دریافت۔ گیارہ برس بعد ـــــ اس کے ٹھیک گیارہ برس بعد۔ آہ تم یقین نہیں کروگی۔ مگر ہم دنیا بدل دیں گے۔ تاریخ نئے سرے سے لکھی جائے گی۔ میں ان کچھ لوگوں میں سے ایک تھا ـــــ گجرات کے ساحل سے 30 کلومیٹر دور کھمباٹ کی کھاڑی میں ایک عظیم خزانہ ہاتھ آگیا ہے۔ سونو فوٹو گرافی۔ تمہیں یاد ہے نا، چار دن پہلے......

'جلتے ہوئے گجرات میں، عظیم خزانہ......'

'ہاں' مجھے یاد ہے'...... میرے لہجہ میں ناگواری تھی...... چار دن پہلے، ویلنٹائن ڈے کے دن جو کچھ ہوا میں اسے کبھی بھول نہیں سکتی۔'

'بھولنا بھی نہیں چاہئے......' مین کے لہجہ میں کہیں بھی دکھ یا اداسی کی جھلک نہیں تھی۔ 'جھومر' جیسے اندھیرے میں سوئچ کی حرکت سے روشنی کی طرح بکھر گیا تھا...... 'سونو فوٹو گرافی سے نکلی تصویریں جب لیب سے باہر آئیں تو ہمیں اچانک احساس ہوا ـــــ سمندر میں 40 میٹر نیچے دفن قدیم ترین تہذیب اچانک رنگین ستاروں کی طرح ہماری قسمت سے جوڑ دی گئی ہو...... ایک قدیم شہر، موہن جداڑو کی طرح رہائشی مکانات ـــــ سیڑھیوں کی طرح نیچے اترتے پوکھر ـــــ تالاب۔

''اور سب کچھ اُسی گجرات کے ساحلی علاقے میں......''

میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں دیواروں کا خیال رکھتے ہوئے چیخی۔

''میں بھی ایک عظیم پوکھر ہوں۔ ایک عظیم تالاب ہوں اور انتہائی قدیم۔ تمہیں اس عظیم پوکھر میں بہتے پانیوں کے اشارے کیوں نہیں ملتے۔؟''

اس نے میری آواز کو نظر انداز کیا...... وہ بتا رہا تھا۔ تہذیبیں کہیں جاتی نہیں ہیں۔ وقت کے ڈائنا سور انتہائی خاموشی سے انہیں نگل جاتے ہیں____ تہذیبیں 'ممی' سے باہر نکلنے کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ آہ، تم نہیں جانتی...... میں کس قدر خوش ہوں۔ سمندر کے گہرے پانی میں 90 کلومیٹر کے دائرے تک، اس قدیم تہذیب کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں____ قدیم شہر____ ایک پورا شہر ندی میں سما گیا____ سندھو گھاٹی کی تہذیب کی طرح۔ یہ شہر اسی طرح کا ہے۔ جیسے ہڑپا کے برامدات میں پایا گیا تھا____ مٹی کی بنی ہوئی نالیاں۔ پکی سڑکیں۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کے گھر۔ پتھر کے تراشے اوزار۔ گہنے____ مٹی کے ٹوٹے پھوٹے برتن____ جواہرات____ ہاتھی کے دانت اور...... وہ مسکرا رہا تھا۔ سب کچھ یعنی 7500 ق۔م۔ یعنی قبل مسیح کا۔

'یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو'؟

وہ آگے بڑھا۔ میرے جسم پر یوں بھی کپڑے اس وقت برائے نام تھے......' اس نے باقی بچے کپڑے بھی جسم سے الگ کر دیئے...... اس لئے کہ...... ''میری آثار قدیمہ...... تمہیں اب انہیں کھنڈروں میں بیٹھانا چاہتا ہوں...... لیکن اس سے پہلے تمہارے ان کھنڈروں پر ریسرچ کرنا چاہتا ہوں...... اس نے ایک بھدی گالی دی۔ مجھے بستر تک کھینچنا چاہا اور شاید......''

وہ ہانپ رہی تھی...... یہ اس کے ساتھ مسلسل، گزر رہے لمحوں کا جبر تھا کہ میں نے الٹا ہاتھ اس کے گال پر جڑ دیا۔

'کتیا......' وہ ہانپ رہا تھا...... ''ایک بہت قدیم تہذیب برآمد کرنے کے بعد مجھے تمہارے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے مجھے دھکا دیا اور خود کو بستر پر سونے کے لئے ڈال دیا____ میں زمین کے تنہا گوشہ میں دیر تک اپنے آنسوؤں کا شکار ہوتی رہی......

OO

''پھر کیا ہوا، اس نے تمہیں ڈیورس دے دیا؟''

'نہیں۔' وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی..... ایسے لوگوں کو جانتی ہوں۔ جان گئی ہوں۔ ایسے لوگ، ڈرپوک ہوتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں بہت دور تک دھوپ اور سایہ دیکھنے والے..... ایسے لوگ قدم قدم پر ان سیکورٹی کے مارے ہوتے ہیں ــــــ مینن بھی ایسے ہی جذبہ سے دوچار تھا ــــــ میرے بعد.....؟ اپنی، جسمانی اور بچوں کی..... ترپتی مینن میری طرف مڑ گئی تھی۔ تمہیں کیا لگتا ہے ایسے لوگ جیت سکتے ہیں؟ نہیں..... کسی ایک لمحے کا ــــــ بولا گیا سچ ان کی اپنی ذات پر بھاری پڑتا ہے۔ دوسرے دن وہ ایک سدھا، ہوا بلڈاگ بن گیا تھا ــــــ میرے قدموں پر لوٹتا ہوا۔ بچے اسکول جا چکے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

ترپتی آگے بڑھ کر کھڑکی کے پٹ کھول رہی تھی۔ باہر رات کی سیاہی مکمل طور پر چھا چکی تھی۔ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکے کھڑکی کھولتے ہی اندر ہمارے جسموں میں داخل ہو گئے۔

''ہوا تیز چل رہی ہے، نہیں؟''

'ہاں۔'

باہر کہرے کے 'آبشار' گر رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے پاس اپنے منہ کو لے گئی۔ پھر میری طرف پلٹی۔ ہلکی سانس چھوڑی۔ چہرے کو اپنی ہتھیلیوں سے خشک کیا۔

''کہرے کا احساس چہرے پر کیسا لگتا ہے۔ آں؟ جیسے ایک نم سی ٹھنڈی، روئی آپ کے چہرے پر رکھ دی گئی ہے..... ہے نا؟''

وہ پھر مسکرائی ــــــ میں کہاں تھی۔ ہاں، یاد آیا۔ وہ ایک سدھے ہوئے بلڈاگ کی طرح اپنے نتھنے، میرے جسم پر رگڑ رہا تھا۔ کتا ــــــ مجھے ابکائی آ رہی تھی۔ تیز نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سیکس کے بخار میں جل رہا تھا۔

''پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے۔ کل رات..... معاف کر دو ترپتی'..... اس کے رکھڑے، بن مانس جیسے ہاتھ میرے جسم پر مچل رہے تھے۔ وہ میرے کپڑے کھول رہا تھا۔ میں نے کوئی

احتجاج نہیں کیا۔ میمنے، کی طرح معصومیت سے، اپنے غصے کو دبائے اس کے جانور نما، بچوں کا کھیل دیکھتی رہی...... جب وہ میرے کپڑے اتار چکا اور کسی جنگلی بھیڑیے کی طرح اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے تیار تھا ــــــ ایک دم اسی وقت، میں کسی جنگلی بلی کی طرح غرائی ــــــ دھب سے زمین پر کود دی ــــــ غصے میں اسے پرے ڈھکیلا ــــــ کپڑے پہنے اور چلائی۔

یو، سن آف بلڈی سوائن۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی......؟

وہ جل رہا تھا۔ وہ اپنے بدن کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ اپنے بھوکے بدن کی دہائیاں دے رہا تھا۔ میں کسی فاتح کی طرح مسکرائی۔ اس بار اسے سیراب کرنے کے لئے، میں نے سکندر بادشاہ کی طرح فتح کا سہرا اپنے سر لکھ لیا تھا......

تر پتی نے کھڑکی بند کر دی...... 'چلو، اس حادثے کو بھی بھول گئی میں...... بھولنا پڑتا ہے۔ وہ چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ میری جانگوں پر بیٹھ گئی۔

'سنو۔ تمہارے یہاں کون کون ہیں؟''

'ملوگی؟'

'ہاں۔ ملنا چاہوں گی۔'

'مینن آگئے تو؟'

'اب میں اسے ڈرانا چاہتی ہوں ــــــ وہ میرے شرٹ کے بٹن سے کھیل رہی تھی۔ کھیلتے کھیلتے خود بولی......

'ایک بیوی ہوگی!!'

'ہاں'

'اسے بتاؤ گے کہ تم سے ایک ندی کی لہر ٹکرائی تھی ــــــ '

'نہیں'

'ڈرتے ہو۔'

'ڈرنا پڑتا ہے۔ بیویاں صرف ایک سمندر...... سمندر کی صرف ایک لہر سے واقف ہوتی ہیں ــــــ دوسرے لفظوں میں کہوں تو وہ ساری لہروں پر خود ہی حکومت کرنا چاہتی ہیں۔'

وہ ہنس رہی تھی ...... اور کون ہے۔

'ایک بیٹا'

'کتنے برس کا؟'

'آٹھ برس کا'

اور......'

میں نے اسے جانگھوں سے پرے کیا۔ شریانوں میں گرم گرم طوفان کی آمد سے خود کو بچانا چاہتا تھا۔

'تم نے بتایا نہیں۔ اور کون ہے......'

'ایک بیٹی ہے۔ مگر......'

'مگر......؟'

'نہیں۔ وہ ہے نہیں۔ میرا مطلب ہے، وہ بن رہی ہے......بس وہ بن رہی ہے اور ایک دن یقین جانو وہ پوری طرح بن جائے گی۔'

'اس نے چونک کر تعجب سے مجھے دیکھا'

'پہیلیاں مت بجھاؤ'

'دراصل...... میں نے اپنا جملہ مکمل کیا......وہ انکیوبیٹر میں ہے اور مسلسل بننے کے عمل میں ہے......'

'کیا مجھے ملواؤ گے؟'

تر پتی نے اپنا بدن ایک بار پھر میرے بدن پر ڈال دیا تھا______

○○

لفٹ پانچویں فلور پر رک گئی تھی۔ یہ اسپتال کا نرسری وارڈ تھا۔ فل ائیر کنڈیشنڈ______ باہر ایک لمبی راہداری چلی گئی تھی۔ تر پتی نے آہستہ سے میرا ہاتھ تھام لیا______ شیشے کے بنے دروازوں سے گزرتے ہوئے ہم 'ماترتو سدن' کے بورڈ کے آگے ٹھہر گئے______

'یہاں جوتے اتارنے ہوں گے۔'

تر پتی کے پاؤں جاپانیوں اور چینی عورتوں کی طرح چھوٹے اور ملائم تھے۔ گیٹ کیپر

نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے اندر شیشے کی ایک عجیب سی دنیا تھی۔ ترپتی حیرت سے شیشے کے اس پار دیکھ رہی تھی۔ شیشے کے اس پار بھی، شیشے کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے گھروندے بنے ہوئے تھے ——— ایسے ہر گھروندے میں نیلے بلب جل رہے تھے۔

'نیل کہاں ہے؟ ترپتی کی آنکھوں میں تجسس تھا۔'

وہاں ان گنت انکیو بیٹرس تھے۔ ترپتی کی انگلیاں تیر رہی تھیں۔ وہاں......

'نہیں'، 'نہیں؟'

'وہ......'

'وہ بھی نہیں......'

'اچھا وہ...... دائیں طرف......'

'نہیں......'

'پھر نیل کہاں ہے؟'

'نیل وہ رہی'

'مگر۔ وہ انکیو بیٹر تو خالی ہے...... ترپتی چونک گئی تھی۔

'خالی نہیں ہے۔ غور سے دیکھو۔'

'خالی ہے!، ترپتی کا لہجہ اُداسی سے پُر تھا۔

'ہے نا...... میں نے کہا تھا۔ وہ بن رہی ہے ——— 'میں نے ترپتی کا ہاتھ زور سے تھام لیا تھا...... یاد ہے ترپتی۔ میں نے کہا تھا، عورت ہر بار بننے کے عمل میں ہوتی ہے۔ ایک بے چین آتما...... ایک یونانی دنت کتھا میں پڑھا تھا ——— عورت کی جون میں پرویش سے پہلے، آتما دھرتی کی سو پریکر مائیں پوری کرتی ہے۔ تمہاری آتما بھی بے چین تھی۔ کبھی ساہتیہ۔ کبھی آرٹ اور کبھی......'

ترپتی میری طرف تیزی سے مڑی۔ ہنستے ہوئی بولی......

'سنو۔ اس انکیو بیٹر میں مینن کو ڈال دوں؟'

'نہیں۔'

میرا لہجہ نپا تلا تھا...... 'سب سے پہلے ابھی تمہیں اس انکیو بیٹر سے باہر نکلنا ہے'

میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا......اس کا ہاتھ تھام کر باہر آ گیا......لفٹ کے بٹن پر انگلیاں رکھتے ہوئے بھی میں نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا____
ممکن ہے وہ انکیوبیٹر میں رہ گئی ہو......یا ممکن ہے، شوہر کے آثار قدیمہ میں بھٹک رہی ہو!

○○○

لینڈ اسکیپ کے گھوڑے

(پیارے دوست اس۔ ال۔ حسین کے نام)

سب سے بُری خبر

''نہیں، اس گھوڑے کے بارے میں نہیں پوچھیے۔ برائے مہربانی''۔ وہ زور زور سے ہنس رہا تھا۔ برائے مہربانی اور جیسا کہ میں نے کہا، آپ یقین کیجیے۔ وہ گھوڑا۔ با...... بابا...... ایک بے حد دلچسپ کہانی اور جیسا کہ میں ہوں۔ کیا آپ مجھ پر یقین کریں گے۔ ہاں آپ کو کرنا چاہئے...... اور وہ گھوڑا اچانک کورے کینواس سے چھلانگ لگا کر میرے سامنے آکھڑا ہوا تھا......''

کالے چشمہ کے اندر حسین کی پتلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ نہیں۔ مجھے مغالطہ ہوا تھا۔ کسی بھی انسانی آنکھ کی پتلیوں میں یہ جوش میں نے کم دیکھا تھا...... حسین کی پتلیاں ٹھہرتی نہیں تھیں...... وہ شرارتی کنچے، کی گولیوں کی مانند تھیں۔ ادھر سے ادھر چمکیلے فرش پر تیرنے والی...... اور مجھے لگتا ہے باتیں کرتے ہوئے بھی حسین ان پتلیوں کو وقفے وقفے آپ کی نظر بچا کر اپنی ہتھیلیوں میں تھام لیتا ہے...... گو، ایسا کرتے ہوئے وہ پریشان بھی ہوا اٹھتا ہے کہ پتہ نہیں سامنے بیٹھا ہوا آدمی اس کے اس عمل کو کیا نام دے؟ مگر...... کنچے کی گولیوں کی طرح اس کی آنکھوں کی شراتی پتلیاں...... اور گھوڑے۔

شراب کے دو ایک گھونٹ کے بعد ہی ہو وہ جذباتی حد تک فلسفی بن جاتا ـــــــ
'دوست، سب سے بُری خبر ابھی لکھی جانی باقی ہے۔' وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہل رہا ہے۔

مجھے معلوم ہے۔ حسین کو چڑھ گئی ہے۔ چڑھنے کے بعد حسین کے اندر سنبھال کر رکھا ہوا، بوجھل آدمی مر جاتا ہے اور ایک حساس، جذباتی اور پاگل آدمی زندہ ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

''دوست، ابھی سب سے بُری خبر لکھی جانی باقی ہے۔ لیکن یہ بُری خبر آہستہ آہستہ لکھی جائے گی اور ممکن ہے۔ ممکن ہے...... اس کے لکھے جانے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہو۔''

حسین پھر اپنی کرسی پر واپس آ کر بیٹھ گیا ہے۔

'کیا یہ خبر تم سے جڑی ہے؟'، میں ہنسنا چاہتا ہوں۔ حسین کو چھیڑنے کا منشا ہے۔ مگر۔ حسین کے اندر کا آدمی دکھ گیا ہے۔

''سب سے بُری خبر...... سب سے بُری خبر کا تعلق محبت سے ہوگا دوست۔ سب سے بُری خبر ہوگی کہ محبت کرنے والے نہیں رہیں گے۔ سب سے بُری خبر ہوگی کہ محبت پر کچھ بھی تحریر نہیں کیا جائے گا۔ سب سے بُری خبر ہوگی......''

حسین بہک رہا ہے۔

میں اپنے دل کو سمجھاتا ہوں۔ حسین، جیسے بہت دیکھے ہیں...... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سارے پینے والے ہی حسین ہوتے ہیں۔ پی کر، خود پر قابو نہیں رکھنے والے...... اپنے آپ کو بھول جانے والے۔ پھر۔ اندر کا فریڈیشن مزے لے لے کر آپ کو ایک بیوقوف قسم کے جوکر میں بدل دیتا ہے...... یعنی جیسے آپ آئینہ کے سامنے کھڑے ہوں اور اپنے عکس کو دیکھ کر عجیب عجیب حرکتیں کر رہے ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ پینے کے بعد آپ اپنی عجیب عجیب حرکتوں کے لئے تو بچ جاتے ہیں لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ پاتے۔ پھر بے سر پیر کی کہانیاں اور فلسفے شروع ہو جاتے ہیں اور شراب کا نشہ ہرن ہونے تک، فلسفے بھی شیمپین کے جھاگ کی طرح بہہ جاتے ہیں۔

لیکن۔ سب سے بُری خبر۔

OO

مجھے اس خبر نے چونکایا تھا تو کیا اس آدمی نے، اس پچاس باون سالہ جذباتی خبطی آدمی نے محبت کا روگ بھی لگایا ہوگا...... نہیں۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ اس پچاس باون سالہ آدمی نے...... ایک انتہائی تجربہ کار، حساس اور جذباتی آدمی نے ـــــــ سوچنے کے آخری لمحے میں میں نے حسین سے اپنے دل کی بات پوچھ لی تھی۔

'' آپ کی سب سے حسین پینٹنگ کون ہے؟''

''جو میں نے اب تک نہیں بنائی''......

اس کی آنکھوں کی پتلیاں، پھر سے کنچے کی گولیاں بن گئی تھیں۔

اور جو کچھ حسین نے بتایا

یہ کہانی یوں بھی شروع ہو سکتی تھی کہ ایک تیس سال کا پینٹر تھا اور ایک دبئی یا کسی بھی عرب ممالک میں رہنے والی لڑکی تھی۔ لیکن حسین کے لئے صرف لڑکی ہونا، محبت کے لئے کافی نہیں تھا۔ اور وہ بھی تب۔ جب ایک عمر نکل جانے کے بعد بھی ایک عمر آپ میں چھپی بیٹھی رہ جاتی ہے۔ یہ پوچھنے کے لئے کہ میں ہوں تو مجھے جیتے کیوں نہیں ہو۔

'وہ کیسے ملی......؟'

حسین کے لفظوں میں...... پہلی بار لگا، وہ لڑکی دیکھتے دیکھتے میرے سامنے ایک پینٹنگ میں بدل گئی ہو۔ ایزل، کینواس، برش، رنگ...... اس پینٹنگ میں سب کچھ تھا۔ لیکن لڑکی غائب ہو گئی تھی۔ لڑکی کی جگہ......'

'گھوڑے نے لے لئے تھے۔' میں مسکرایا۔ دلی کی نمائش گاہ میں اس کی جس پینٹنگ کی، میں نے سب سے زیادہ داد دی تھی، وہ وہی دو گھوڑے تھے۔ دو وجیہہ گھوڑے۔ حسین ایرانی گھوڑے...... آپس میں گلے ملتے ہوئے...... کاغذ کے کینواس پر پنسل کی باریک لکیروں سے، ان دو گھوڑوں نے جنم لیا تھا۔

'کیا یہ تم ہو، حسین؟'

'' آہ نہیں۔ لیکن تم قریب قریب پہنچ رہے ہو۔''

'کیا ان میں سے ایک گھوڑا ہندستانی ہے اور ایک......'

'نہیں...... حسین پر اس بار پینٹنگ والی لڑکی حاوی ہو گئی تھی...... ''اس سے پہلے میں نہیں جانتا تھا۔ عورتیں، مردوں کی کمزوری سے کس حد تک واقف رہتی ہیں...... اور شاید وہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن شاید اپنی ان کمزوریوں کو مرد بھی پہچانتا ہے۔ مرد ان کمزوریوں سے واقف رہتا ہے...... اس وقت بھی جب عورت اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھا رہی ہوتی ہے...... لیکن آہ، عورت کبھی مرد کی اس طاقت کو نہیں پہچان پائی...... جس کے بارے

میں وہ جان لے تو شاید عورتوں کا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے۔ کیونکہ ان کی پہچان کا ایک راستہ مرد کی طاقت سے بھی ہو کر گذرتا ہے۔ حسین کہتے کہتے ٹھہر گئے تھے۔

''وہ میرے دوست کی بہن تھی اور اس دن، میرا دل بار بار کہہ رہا تھا، حسین کچھ ہونے والا ہے...... یہ اندر کے گھوڑے کی بے چینی تھی، جس نے اپنے علاج کے لئے ڈاکٹر دوست کا گھر دیکھ لیا تھا۔

''میں اپنے اسی لباس میں تھا۔ کرتا پانجامہ اور جیسا کہ میں عام طور پر پہنتا ہوں۔ کرتے پر کالے رنگ کی ایک صدری یا بنڈی۔ آپ جو بھی نام دے دیں۔ کال بیل پر اُنگلی رکھتے ہوئے بھی میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔''

اور وہ آئی...... وہ سامنے کھڑی تھی۔ تصویر ساکت تھی۔ وہ مجسم، میری اس پینٹنگ میں بدل گئی تھی، جو میں نے اب تک نہیں بنائی تھی۔ کیا یہ کیوپڈ کا تیر تھا؟ لمحہ رک گیا تھا اور پینٹنگ ساکت تھی۔

ایک بہت ہی عام چہرہ جیسا کہ میں ہوں......
اور ایک بے حد خاص چہرہ جیسا کہ وہ تھی......
ایک بے حد عام سا مرد...... اور بے حد خاص سی لڑکی......

ہم دونوں دروازے پر تھے۔ ایک دروازے پر ہاتھ رکھے...... اور دوسرا دروازے کے باہر۔

خاموش ان لمحوں کا جادو ایسا تھا کہ کسی حسین پینٹنگ کی طرح میں اسے آنکھوں کے کینواس پر قید کر رہا تھا۔ بکھری ہوئی زلفیں۔ آسمانی رنگ کی شلوار، قمیض...... اسی رنگ سے میچ کرتا ہوا دوپٹہ...... دوپٹہ ہڑبڑاہٹ میں، اس کے کندھے سے ہوتا ہوا سینے پر جھول گیا تھا۔ وینس دی میلو۔ خوبصورت آدھے کٹے ہاتھوں والی عورت اور اس کا بَراق حسین سینہ۔ وہ سینہ مصفّٰی وہ دوقبہ نور...... یقیناً وہ حسین تھے اور بھرے بھرے۔ اس کے ہونٹ موٹے تھے۔ موٹے ہونٹ میری کمزوری ہیں۔ موٹے اور رسیلے۔ وہ تو وینس دی میلو تھی۔ لیکن میں کیا تھا......؟

وہ مجھ میں کیا دیکھ رہی تھی۔

میں اس پر نثار ہو رہا تھا اور چاہتا تھا، وہ اپنے لئے میری اس کمزوری کو محسوس کرے۔

''عمر۔عمر کیا ہو گی اس کی؟''

ان جادوئی خاموش لمحوں میں، میں اس کی عمر کی، رواں سڑک سے گزر رہا تھا۔ سولہ، اٹھارہ یا زیادہ سے زیادہ بیس...... یا عمر کہیں کسی سرکش گھوڑے کی طرح ٹھہر گئی تھی...... ندی بہہ رہی تھی۔

پھر ندی ایک دم سے ٹھہر گئی۔

وینس کو اپنے ہونے کا احساس ہو گیا تھا......

'دیکھئے۔'

میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔'' میری طبیعت خراب ہے۔ اس وقت بھی بخار سے جل رہا ہوں۔ فرقان میرے دوست ہیں اور آپ کے ملک میں میرا ساتواں دن ہے...... آنے سے قبل، پاکستان سے فرقان سے میری فون پر بات ہوئی تھی''

اس کی آنکھوں میں نشہ تھا۔ وہ ہرن کی طرح لہرائی...... ندی کی لہروں کی طرح گھومی...... دوپٹہ کو ریشم کی ڈوری کی طرح نچایا...... اپنی 'لانبی' گردن کو جنبش دی۔

مجھے اندر آنے کے لئے جگہ دیا۔ مسکرائی۔

'' آجائیے۔ فرقان میرے بڑے بھائی ہیں''۔

ڈاکٹر فرقان، پینٹنگ اور وہ

وہ بات بات پر ہنس پڑتا تھا۔ یا یوں کہئے، اسے ہنسنے کی بیماری تھی۔ یا یوں کہئے، ہنسنا اس کے لئے مریضوں کو 'رُجھانے' کا ایک شغل بن چکا تھا۔ مجھے یقین تھا وہ رات میں سوتے سوتے بھی بلاواسطہ ہنستا ضرور ہنستا ہوگا۔ تو یہ ڈاکٹر فرقان تھا۔ (نہیں، آپ اس آدمی یا اُس کی کہانی پر تعجب مت کیجئے، جس کے بارے میں، بعد میں معلوم ہوا کہ فرضی اور جعلی ڈگریوں کے حوالے سے اس نے نہ صرف میڈیکل کی ڈگری حاصل کی۔ بلکہ دبئی تک کا سفر بھی کر آیا۔ بہر کیف ان باتوں کا کہانی سے کوئی زیادہ تعلق نہیں ہے) مجھے تعجب تھا، اتنی حسین لڑکی ڈاکٹر فرقان کی بہن کیسے ہو سکتی ہے اور اس سے مسلسل، باتیں کرنے کے دوران مجھے یہ خیال بھی پیدا ہو رہا تھا کہ اس جیسے کسی ڈاکٹر کو یعنی جس کا ٹارچر کرنے والا پیشہ اس کے چہرے پر بھی لکھا ہوتا ہے، کی کوئی بہن

نہیں ہونی چاہئے...... بہن اور وہ بھی اتنی خوبصورت۔

'ہو..ہو۔ ڈاکٹر فرقان پھر ہنسا...... تو اب بھی تمہاری وہی عادت ہے، یعنی آڑی ترچھی لکیریں..ہوہو..

وہ ہنس رہا تھا۔

وہ سامنے آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔

''تو آپ پینٹنگ بناتے ہیں؟''

ہو..ہو۔ ڈاکٹر فرقان کو اپنی بے کار کی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

'آیئے۔ آپ سے کچھ پینٹنگ کے بارے میں باتیں کرتے ہیں...... کھڑے اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ انتہائی شفاف۔ لانبی مخروطی انگلیاں...... کیا یہ وینس دی میلو کی انگلیاں ہیں۔ آج اس کا دوپٹہ غائب تھا۔ کھلے گلے سے 'قبۂ نور' کے دیدار کے لئے آج اس نے میری مسحور نظروں کو روکا یا ٹوکا نہیں تھا۔ جی بھر کر دیکھنے دیا تھا۔ اس کی انگلیاں گرم تھیں۔ ہتھیلیاں، آگ کا گرم انگارہ بن گئی تھیں۔

ڈاکٹر فرقان ہنس رہا تھا...... پینٹنگ۔ ہوہو..جاؤ میری بہن اس موضوع پر تم سے کچھ زیادہ اچھی باتیں کر سکتی ہے......ہوہو..

اس نے ہاتھ تھامے ہوئے اپنی بہن کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا، جیسے عام طور پر وہ اپنے مریضوں کو دیکھتا ہوگا۔

اس کی آواز سرد تھی۔ جیسے کسی گہرے کنویں سے آرہی ہو۔

'بھیا ایسے ہی ہیں...... ہمیشہ سے۔ یعنی پورے ڈاکٹر......'

ہم بالکونی میں تھے۔ پلاسٹک کی کرسیوں کے پاس کی جگہ ایک چھوٹے سے گارڈن کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ جہاں ہم بیٹھے تھے، وہاں سے آسمان پتوں کی قطار سے جگمگاتا ہوا، کچھ زیادہ ہی گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ اس نے نظر جھکائی۔ بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے تھام لیا۔ وہ اپنے ناخنوں پر لگی پالش سے کھیل رہی تھی۔

''تہذیب نے آرٹ کو جنم دیا اور آرٹ نے تہذیب کے لئے راستے پیدا کئے...... پہلے تہذیب پیدا ہوئی یا پہلے آرٹ؟ پہلے بیج پیدا ہوا یا پہلے درخت؟ ...... مجھے لگتا ہے، پہلے پہلے

ایموشنس، رہے ہوں گے۔ جذبات...... دو آنکھوں، دو دریا اور دو دلوں کے بیچ...... جیسے ندی میں کنکری پھینکو۔ پہلے پہلے کسی نے اس کنکری کی چیخ سنی ہوگی...... اور اس چیخ کو 'پاشان' والوں نے کسی درخت کے کھوکھل یا زمین کے ماتھے پر لکھ دیا ہوگا۔ آرٹ پہلے آیا اور تہذیب......؟''

اس نے کنچوں والے جھولتے گل دستے سے ایک پتہ توڑ لیا...... ''تہذیبیں کتنی آگے نکل گئیں۔ اسٹون، کوپر اور آئرن ایج کے انسان نے اپنے ہر کرشمہ کے لئے آرٹ کو آواز دی ہوگی......؟ ہے نا؟'' وہ میری طرف گھومی تھی۔

''تم پینٹر، عورت میں کیا دیکھتے ہو......؟''

وہ جھکی تو اس کے قبۂ نور کے شعلے انگاروں کی بارش کرنے لگے۔ اس نے مجھے اپنے جادو میں تیرنے دیا۔ زرا توقف کے بعد وہ پھر بولی۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔ تم لوگ عورت میں کیا ڈھونڈھتے ہو۔؟ 'ایک ننگا جسم؟ وہ میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی...... گداز بانہیں، حسین چکنے پاؤں، جیسے ایک چکنی سڑک اور...... وہ مسکرا رہی تھی۔

پھر اس کی مسکراہٹ کچھ زیادہ ہی گہری ہوگئی......

'کیا تم مجھے دیکھنا چاہو گے......؟'

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اٹھی۔ میرا بدن لرز رہا تھا...... اٹھتے اٹھتے میں نے دیکھا اس نے جھولتے گلدستہ سے جو پتہ توڑا تھا۔ اس کے ٹکڑے زمین پر بکھر گئے تھے۔

ڈاکٹر فرقان! میرے لب تھرتھرائے۔

'نہیں۔ وہ مریضوں کو دیکھنے جا چکے ہیں اور شام کے 8 بجے سے قبل لوٹیں گے بھی نہیں۔'

وہ مجھے اپنے بیڈروم میں لے آئی تھی۔ آگے بڑھ کر پچھم کی طرف کھلنے والی کھڑکی اس نے بند کردی۔ پردہ کھینچ دیا۔ بلب روشن کردیا۔ مجھے صوفہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر میز پر، کتابوں کے درمیان سے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی...... پھر تیز تیز میرے قریب آکر، البم سے ایک تصویر نکال کر ہنس پڑی۔

''پہچانو۔''

تصویر میں ایک سال کی بچی، نہانے والی بالٹی کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ ایک عورت ہاتھ میں پانی کا مگ لئے کھڑی مسکرا رہی تھی......

''یہ میں ہوں، اس نے بچی کی طرف اشارہ کیا......'' اور یہ ماں ہے۔'' اس کے چہرے پہ معصوم شرارت تھی۔

'دیکھ لیا مجھے۔ اس بچی کو ایک پینٹنگ میں کتنا بڑا کر سکتے ہو؟...... میرے برابر؟...... پھر وہ یہ رہی۔ یا یہ میں بن گئی......؟''

''اس بچی نے کچھ بھی نہیں پہنا ہوا ہے۔'

'اور میں لباس سے ہوں'۔

وہ ہنس رہی تھی...... کمال تو تب ہے جب تم اس بچی کو ربر کی طرح کھینچ کر پینٹنگ میں ڈال دو۔ ڈال سکتے ہو......؟

مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی

'تو کیا یہ میں ہوں گی حسین......؟ یعنی، میں جو بھی ہوں۔ یا وہ بچی ہوگی، جو اس تصویر میں ہے اور جو نہانے کے نام پر رو رہی ہے۔ برہنہ''

'تم یہ بات کس طرح جاننا چاہتی ہو؟'

'پتہ نہیں۔'

'اس بچی کو اگر ربر کی طرح کھینچا جائے تو......' میں بچی اور اس کے چہرے کو تول رہا تھا ''بچی میں تم نہیں ہو اور تم میں بچی نہیں ہے''۔

—— 'یہ میری بات کا جواب نہیں ہوا'

اس بار میرا لہجہ سخت تھا —— سنو، پریم پجاری...... امتحان مت لو میرا۔ پینٹنگ کی زبان میں یہ دونوں الگ چہرے اور جسم رکھتے ہیں۔ تمہیں چھوٹا کروں تو اب کی تم کل والی اس بچی میں داخل نہیں ہو سکتی...... اور بچی کو ربر کی طرح کھینچوں تو، یہ تمہاری طرح آگ نہیں بن سکتی۔'

''پینٹنگ کی زبان چھوڑ کر زندگی کی زبان میں بات کرو تو......'' وہ مسکرا رہی تھی۔

''بچی کے ساتھ سیکس کا خیال نہیں ابھرتا اور تمہارے ساتھ''

اس نے گرم ہتھیلیاں میرے ہونٹوں پر رکھ دیں ——

قبہ نور، کو اب لباس کی ضرورت نہیں تھی ——

وہ ناچی، اچھلی، تڑپی اور میرے جسم میں سما گئی......
یہ پہلے گھوڑے سے میری ملاقات تھی......

OO

کمرے میں ٹپ ٹپ بارش رک چکی تھی۔

"برسوں پہلے موہن جوداڑو کی کھدائی سے ـــــــ تمہیں یاد ہے...... سفید چادر میں اس کے ہلتے پاؤں نے میرے ننگے پاؤں پر اپنا گداز بوجھ ڈال دیا تھا ــــــ تمہیں یاد ہے حسین، وہ آرکائیو والوں کے لئے یقیناً ایک انوکھی، قیمتی اور مہنگی چیز تھی۔ مجھے یاد کرنے دو...... ایک عظیم بھینسا، رائنس جیسا...... بڑی بڑی سینگیں...... لیکن چھوٹا سر...... دونوکیلی سینگیں آسمان سے باتیں کررہی تھیں...... میں نے یہ تصویر کسی امریکن میگزین میں دیکھی تھی...... لیکن، مجھے یاد رہ گئی۔ پتہ ہے، وہ عظیم بھینسا کون تھا۔ وہ تم تھے حسین!"

وہ اچھلی...... سفید چادر اس کے اجلے نرم ملائم بدن سے پھسل کر اس کی جانگھوں تک چلی گئی تھی ــــــ

"تم اس وقت بھی تھے۔ موہن جودڑو کی تہذیب میں۔ ایک عظیم بھینسے کی صورت میں۔ لیکن اس وقت میں کہاں تھی حسین......؟"

وہ تارکول کی طرح میرے بدن پر پھسل رہی تھی...... "میں بن رہی تھی شاید...... ہر بار بننے کے عمل میں تھی۔ عیسیٰ قبل کئی صدیاں پہلے یونان میں...... کبھی 'پارتھنیان'، کے آدھے گھوڑے آدھے انسانی مجسمے کی صورت...... کبھی وینس اور 'اپالو' کی پینٹنگ میں...... کبھی لیونارڈو دی ونچی کی مونالزا اور جن آف راکس، دی میڈونا اینڈ چائلڈ اور باچیوز میں...... اور کبھی رافل، رمبراں اور جان اور میر کی تصویروں میں......"

وہ کچھوے کی طرح پھدکی۔ میرے پاؤں کے انگوٹھے کو اپنے ہونٹوں میں بھرا...... پھر اچھل کر میرے پاؤں کے بیچ و بیچ آکر بیٹھ گئی......

"سچ کہنا، مونالزا کا صرف چہرہ مسکراتا تھا اور میرا جسم......"

"لیونارڈ دی ونچی نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے وہ جسم کی ایسی کسی مسکراہٹ سے واقف نہیں تھا۔"

''کیا میں مائیکل اینجلو کا تصور ہوں؟''

''تم ایک حسین بدن کا تصور ہو''

''کیا میں......''

میں نے اپنے چیختے بدن کو ایک بار پھر اس کے حوالے کر دیا تھا......

''تم ایک گھوڑا ہو اور یقیناً یہ گھوڑا پارتھینان کے گھوڑے سے مختلف ہے......''

اور اسی کے ساتھ میں نے اس کے جسم کے دریا میں چھلانگ لگا دیا تھا......

خالی کینواس، ننگا بدن اور چھلاوہ

اس رات، بلکہ یوں کہئے ساری رات میں خود سے لڑتا رہا...... 'ایزل' کسی ایرانی گھوڑے کی طرح تنا ہوا، کورے کینواس کا بوجھ اٹھائے تھا...... اور کینواس کا 'کورا بدن' میرے ہاتھوں کی انگلیوں کے تعاقب میں تھا۔ رنگ بھرے جانے تھے۔ لیکن رنگ کون بھرتا۔ پینسل کا پورا ڈبہ بلیڈ کی حیوانیت کی نذر ہو چکا تھا۔ سفید کاغذ پر دھبے جمع ہو رہے تھے۔ پارتھینان کا آدھا گھوڑا، آدھا انسان۔ ایک سرکش ندی کا بدن...... خیال آ رہے تھے۔ مچل رہے تھے...... اور اس کے مخملی بدن سے پھسلتے ہوئے لوٹ جا رہے تھے۔ آدھی جل مچھلی، آدھا گھوڑا...... یہ بھی نہیں۔ مکمل گھوڑا۔ یہ بھی نہیں۔ اس کا بولتا بدن...... چیختا بدن...... اس کے موٹے، پھل کے رس سے بھرے ہونٹ۔ میں بار بار اس کی زندہ پینٹنگ میں دفن ہوا جا رہا تھا۔ پھر میں نے سوچ لیا۔

''کیا؟''

میں یہاں رہا۔ تو میں مر جاؤں گا۔ ٹھیک اپنے کینواس کی طرح ــــــ کورا...... میں اس کا جسم بن جاؤں گا۔ کیونکہ سمندر کو، ندیوں کو ضم کرنے کا حق حاصل ہے...... وہ سمندر تھی اور 'تم ندی تھے؟......'

''میں ندی بھی نہیں تھا۔ میں ندی کی معمولی لہر بھی نہیں تھا...... اور وہ...... بلا خیز طوفان تھی۔ اس نے مجھے...... آسمان سے باتیں کرنے والا، دو عظیم سینگوں والا بھینسا غلط کہا تھا۔ دراصل''۔

''مطلب......؟''

''موہن جوداڑو کی تہذیب سے نکلے جس مجسمے کی تصویر کو اس نے امریکن میگزین میں دیکھا تھا'' وہ...... وہ خود تھی۔ وہ مجھے خوش کررہی تھی۔ سمندر ندیوں کو پی کر مہان بننے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ ایک طرح سے ایگو پرابلم تھا۔ میں ایسی کوئی ندی نہیں بننا چاہتا تھا جسے سمندر آسانی سے ہضم کرڈالے۔ ندی سہی، لیکن میں ندی بن کر ہی اپنے آرٹ کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔''

''پھر۔؟''

''اس سنسنی خیز حادثے کے بعد میں وہاں دو دن اور رہا۔ دو دنوں میں، میں نے اپنی واپسی کی پوری تیاری کرلی۔ اس درمیان ڈاکٹر فرقان کے کئی فون میری تلاش میں آئے۔ لیکن میں کسی بھی طرح اپنی واپسی کی اطلاع کو اس سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔'

''تو کیا یہ ممکن ہوا۔؟''

''آہ۔نہیں۔فلائیٹ میں چار گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ دو بڑے بڑے سامان پیک ہوکر دروازے کے پاس رکھے تھے۔ بیل بجی۔ میں نے دروازہ کھولا...... سامنے، سمندر کی شانت لہریں میری طرف دیکھ رہی تھیں...... اسے میرے واپس جانے کی خبر مل گئی تھی......

''جاؤ''......

وہ ایک بے حد ''اچھالدار'' لہر تھی...... ''مگر یادرکھو، میرا بدن تمہارے بدن میں رہ گیا ہے۔ کیا اس بدن کو بھول سکو گے؟۔''

جانے سے پہلے وہ پلٹی...... ''اور یاد رکھو۔ یہ پارتھینان کے آدھے انسان کا بدن یا وینس دی میلو نہیں ہے۔''

''سنو۔''

جانے سے پہلے، اسے آخری بار دیکھ کر، میں نے اپنے آنسو چھپا لئے تھے ــــــ
''برسوں پہلے تمہارے جنم میں میں نے اپنا جنم رکھ دیا تھا...... آواگون کو مانتی ہو تو ہم پہلے بھی ملے تھے اور ہم...... پھر ملیں گے......''

دروازے پر کوئی نہیں تھا۔

میری فلائیٹ کا وقت قریب آچکا تھا۔

دو گھوڑے

قارئین!

سب سے پہلے میں آپ کی توجہ ایک بے حد خاص موقع کے لئے، بنائی گئی اس بے حد خاص پینٹنگ کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا...... اس پینٹنگ میں دو گھوڑے ہیں۔ دو حسین گھوڑے۔ یہ گھوڑے جوناتھن سوئفٹ، کے خیالی گھوڑوں کی طرح خوبصورت بھی ہیں اور وجیہہ بھی...... یعنی دو بے حد حسین ایرانی نسل کے شاندار گھوڑے...... ان کے دو پاؤں دھرتی پر اور دو ہوا میں معلق ہیں...... اس طرح جیسے یہ کوئی بہت اہم پیغام لے کر ایک دوسرے کے گلے مل رہے ہوں۔ یہ پینٹنگ میری ڈرائنگ روم کی زینت ہے۔ یعنی ایک بے حد خاص موقع کے لئے بنائی گئی...... پینٹنگ...... اور ایک بے حد خاص دوست کی طرف سے ـــــ اور جیسا کہ پہلی بار دتی کی نمائش گاہ میں جیتے جاگتے ان دو گھوڑوں کے ملاپ پر، شیشے کے اوپر سے ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے حسین سے پوچھا تھا......

''کیا ان میں سے ایک ہندستان ہے؟''

حسین کی آنکھوں میں چمک تھی......

''اور دوسرا پاکستان......؟''

اور جواب کے طور پر حسین نے کہا تھا...... ''آہ نہیں، لیکن اب تم قریب قریب صحیح جگہ پہنچنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

پاکستان جانے سے پہلے حسین کا ایک مختصر دستی خط مجھے ملا تھا۔ ''آپ کی پینٹنگ چھوڑے جا رہا ہوں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے، یہ پینٹنگ آپ کو وہیں رفیع مارگ، اسی بلڈنگ میں مل جائے گی جہاں میری تصویروں کی نمائش لگی تھی۔''

اور اس طرح، قارئین، بے حد خاص موقع پر بنائی گئی وہ پینٹنگ میرے گھر، میرے ڈرائنگ روم کی زینت بن گئی...... لیکن یہ کہانی چونکہ انہی وہ گھوڑوں کی مدد سے شروع ہوئی ہے اور اس کے خالق حسین ہیں، اس لئے حسین کے بارے میں کچھ اہم اطلاعات آپ تک پہنچانا ضروری

تقسیم وطن کے دو ایک سال بعد، جب مارکاٹ میں کچھ کمی آ گئی تھی، ہندستان، پاکستان دو آزاد ملکوں کے طور پر اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کی تیاریاں کر رہے تھے...... یہ وہی وقت تھا جب نوابوں کے شہر لکھنؤ کی ویران بستیوں میں حسین کا جنم ہوا تھا۔ ویران بستیاں...... مجھے اپنے الفاظ پر شرمندگی ہے۔ لٹا تو پورا ملک تھا، بلکہ بٹوارے میں تو دل اور دماغ بھی بٹ گئے تھے...... لیکن لکھنؤ کی تہذیب کا خون کچھ زیادہ ہی ہوا تھا____ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ لکھنؤ چھوڑ کر حسین کا خاندان پاکستان کیوں آباد ہو گیا____ ظاہر ہے، کچھ تو وجہ رہی ہوگی۔ امین آباد کی انہی سونی گلیوں میں سے ایک میں ڈاکٹر فرقان کے والد، والدہ کا گھر آباد تھا، جن سے بچپن میں حسین کے مراسم تھے...... ہاں' پاکستان جانے تک وہ لڑکی، جس کا ذکر کہانی کے شروع میں بار بار آیا ہے، کا دور دور تک وجود نہیں تھا____ فرقان پانچ سات برس، حسین سے بڑے ہوں گے____ اور پاکستان سے دبئی جاتے ہوئے حسین کو اتفاقیہ طور پر ان کا پتہ ملا تھا...... لیکن حسین کو کیا خبر تھی کہ اس غیر ملک میں ایک بہت عجیب خبر، ایک بے حد خاص خبر میں بدلنے کے لئے ان کا انتظار کر رہی ہے۔

تو میں اس پینٹنگ کی بات کر رہا تھا، جو میرے ڈرائنگ روم میں آویزاں ہے۔ (اور پینٹنگ کے پہلے گھوڑے کی کہانی آپ حسین کی زبانی آپ سن چکے ہیں۔)

''دوسرا گھوڑا......''

ہم ہوٹل جن پتھ کے 'بار' میں تھے۔ یہ حسین کے واپس جانے سے دو دن قبل کا واقعہ ہے۔ حسین تین پیک لے چکے تھے اور حقیقتاً، کہنا چاہئے آنکھوں کی تھرکتی پتلیاں، ایک بار پھر کانچ کی گولیاں بن گئی تھیں۔

''قصوں سے کہیں زیادہ پُراسرار ہوتی ہیں سچی کہانیاں''

''بچپن میں لکھنؤ چھوڑا۔ پاکستان آباد ہو گیا۔ 80ء کے آس پاس دبئی گیا۔ یعنی اچھے کام کی تلاش میں۔ تب عمر ہو گئی یہی کوئی تیس کے آس پاس...... ڈاکٹر فرقان کی بہن ٹکرائی...... اور میں واپس پاکستان لوٹ گیا''

''پھر......''

حسین نے ایک بڑا سا پیگ بنایا۔اس کی آنکھوں میں نشہ اتر رہا تھا۔

OO

یعنی یہ پچھلے سال گرمیوں کا ذکر ہے...... سن 2001ء کے اگست ستمبر کا مہینہ...... اس خوبصورت حادثہ کے 22-20 برس بعد 'پیس مش' سلسلہ میں حسین کو ہندستان کے دوسرے فنکاروں کے ساتھ ویزا ملا تھا۔ویزا کے مطابق وہ دلّی کے علاوہ اپنے وطن لکھنؤ جا سکتے تھے۔سیاسی سطح پر ہندوپاک کے تعلقات اس حد تک خراب ہو چکے تھے کہ فنکار اور دانشوروں کا طبقہ ان دنوں لگاتار پاکستان سے پیس مشن پر ہندستان آ رہا تھا____

لیکن۔کیسا پیس مشن......؟ جہاں دلوں کو سیاسی دیواروں نے بانٹ رکھا ہو، وہاں شانتی اور امن کے پیغام بھی بے معنی لگنے لگتے ہیں...... شاید اسی لئے ان دو گھوڑوں کی محبت بھری ادا کو دیکھ کر میں نے پوچھا تھا۔ان میں سے ایک ہندستان ہے اور دوسرا......'

نمائش گاہ سے باہر نکل کر حسین نے مجھے چونکا دیا تھا۔''یقین کرو گے یہ میری تازہ پینٹنگ ہے۔''

''یعنی......''

''دوبئی میں اس رات جو کینوس ادھورا رہ گیا تھا، وہ لکھنؤ مسعود نیّر کے شہر سے واپسی پر کل رات میں نے پورا کیا۔

''مسعود نیّر؟''

'فرقان کو مذاق مذاق میں، ہم لوگ مسعود نیّر بھی کہتے ہیں۔(اور جس کے، میڈیکل کی جعلی ڈگری لے کر دبئی آنے کا تذکرہ آپ پہلے سن چکے ہیں)

''ممکن تھا، میں اس رات جانے کا ارادہ ترک کر چکا ہوتا۔ممکن تھا، میں نے پینٹنگ بنالی ہوتی۔لیکن میرا یقین ہے۔''

حسین نے زور سے میز پر ایک مکا مارا۔بار میں بیٹھے دوسرے لوگوں نے پلٹ کر حسین کی طرف دیکھا۔حسین کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے مدہوشی چھانے لگی تھی۔

''شاید میرا اپس مشن پر آنا کامیاب ہو گیا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا؟ وہ ہماری آدھی ملاقات تھی جب اس نے کہا تھا، کیا تم اس بدن کو بھول سکو گے۔ ہاں، مجھے اس کی ایک ایک بات یاد رہی اور پورے بیس بائیس برسوں تک ـــــ پاکستان کی آمرانہ فوجی حکومت...... سیاسی اتھل پتھل اور زندگی کے ہنگاموں کے دوران کا ہر لمحہ...... وہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رہا...... وہ لفظ میرے کانوں میں گونجتے رہے......' یہ پارتھنیان کے آدھے انسان کا بدن یا وینس دی میلو نہیں ہے...... میں جینے کی کوشش کرتا تھا اور سمندر کی لہریں اچانک اچھلتی، گرجتی چاروں طرف سے۔ مجھے اپنے قبضہ میں کر لیتی تھیں...... میں نے سوچا تھا، اس سے دور جا کر میں جیت جاؤں گا...... مگر نہیں۔ شاید 22-20 برسوں تک...... اس سے الگ کی ایک لمبی زندگی ـــــ شاید میں سچ مچ ندی تھا اور سمندر کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ مجھے اپنے میں ضم کر لے...... وہ دور رہ کر بھی سمندر رہی...... اور میں اتنے طویل برس لگا تار اسی سمندر میں تیرتا ابھرتا رہا...... ہاں پارتھینان کے آدھے گھوڑے والے حصے کو اپنی ناکامی کے طور پر کاغذ کے کینواس پر رنگ دے چکا تھا مگر......

''دوسرا گھوڑا......؟''

حسین مسکرائے...... بوتل خالی پڑی تھی۔ گلاس بھی خالی تھا۔ نیپکن سے ہاتھ پوچھتے ہوئے حسین نے گلاس پلٹ کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

''لکھنؤ گیا تو معلوم ہوا مسعود نیر دبئی کی پریکٹس چھوڑ کر واپس آ گیا ہے۔ (واپس آنے کی وجہ وہی جعلی ڈگری تھی۔ یعنی مسعود نیر نے زندگی بھر جو کچھ کمایا وہ سب جعلی ڈگری کے عوض تھا)۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا، وہ بیمار رہ رہا ہے۔ میں اس کی عیادت کے لئے گیا اور...... لکھنؤ میں امین آباد کی، انہی ویران گلیوں میں سے ایک میں، ذرا سا پوچھتا چھ کرنے پر اس کا مکان مل گیا۔ میں نے دروازہ پر دستک دی اور مسعود نیر کے دروازہ کھولنے کے انتظار میں کھڑا رہا......

کیا آپ......؟

حسین کے چہرے پر نشہ کا دور تک نام نہیں تھا...... کیا آپ جنم جمانتر کا بندھن یا آواگون پر یقین رکھتے ہیں؟ مجھے میرے لفظ یاد آئے، جو میں نے آخری بار اس کے واپس جاتے قدموں کو روک کر ادا کئے تھے۔ ''برسوں پہلے تمہارے جنم میں، میں نے اپنا جنم رکھ دیا تھا......''

دروازہ کھولنے والی وہی تھی...... وہ ذرا سی بجھ گئی تھی۔ لیکن 22-20 برس کے فاصلے کو بہت زیادہ اس میں محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا...... اس نے 'ول پال' کی پینٹنگ کی طرح بہتے ہوئے پانی اور بہتی ہوئی ہوا کو ہاتھ کے اشارے سے، آدھے میں ہی روک رکھا تھا ـــــ مجھے دیکھ کر اسے ذرا بھی تعجب نہیں تھا۔ یہ سب کچھ ایسا تھا، جیسے میں اپنے ہی گھر میں، صبح آفس سے گیا گیا شام کو واپس گھر لوٹ آیا تھا۔ ہاں، اس کی آنکھیں تھکی تھکی تھیں۔ لیکن ان آنکھوں میں اس نے ایک لمبا انتظار رکھ دیا تھا ـــــ تو اس نے دروازہ کھولا۔ میری طرف دیکھا اور میرا، آخری ملاقات میں بولا گیا، میرا ہی جملہ میرے سامنے رکھ دیا......

''آواگون کو مانتی ہوں۔ ہم پہلے بھی ملے تھے اور ہم پھر مل رہے ہیں۔''

''کون ہے؟'' اندر سے ڈاکٹر کی آواز آئی تھی۔

''ہو ہو.. ہو.. آڑی ترچھی لکیریں.. ہو ہو...... آدھی ہنسی کے راستے میں دمہ کے مرض نے اسے بے چین کر دیا تھا...... کم بخت کھانسی۔

''تم لوگ باتیں کرو'...... اندر جاتے ہوئے میں نے ڈاکٹر فرقان کا غور سے جائزہ لیا۔ ان برسوں نے اسے ایک بدنما شخصیت میں تبدیل کر دیا تھا۔ پھولا پیٹ۔ بدن پر چڑھی ہوئی کچھ زیادہ چربی۔ آنکھوں پر کالا چشما اور پیشانی پر سجدے کا داغ۔

سامنے آ کر اس نے اپنی ہتھیلیاں میری طرف بڑھائیں۔

'یہ میرے دوسرے گھوڑے کا چہرہ تھا۔'

OO

اور اس کے ٹھیک دو دن بعد ہی، میرے لئے ایک دستی خط اور ایک، دو گھوڑوں کا پورٹریٹ چھوڑ کر حسین پاکستان واپس لوٹ گئے تھے ـــــ خط میں ایک جملہ اور بھی تھا، جسے میں نے جان بوجھ کر کہانی کے حسین اختتام کے لئے آپ سے چھپا کر رکھا تھا ـــــ اصل میں حسین کے آناً فاناً پاکستان بھاگنے کے پیچھے بھی ایک راز تھا اور اسی لئے خط کے آخر میں حسین نے تحریر کیا تھا...... ''مائی ڈیر، وہ لڑکی مجھ سے شادی کے لئے راضی ہو چکی ہے...... پاکستان جا کر بہت سے کام مکمل کرنے ہیں۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ عقد مسنونہ کے لئے۔ میرے لئے اپنے انتظار

کو سنبھال کر رکھنا۔ بس الٹی گنتی شروع کر دو۔ میں پہنچنے ہی والا ہوں۔ تمہارے ملک...... اپنے ملک......"

دہشت گردی بنام جنگ اور حسین کی آمد

یہ وہ اُنہی دنوں کا واقعہ ہے جب ای میل سے مجھے حسین کا پیغام ملا تھا۔ میں آرہا ہوں۔ میں بہت جلد تم سے ملوں گا۔ بائیس برسوں کی مسافت کم نہیں ہوتی یار...... اور جب آپ نے محسوس کیا ہو کہ وہ برس تو آپ نے خرچ ہی نہیں کئے۔ دراصل ہم دونوں نے وہ 22 برس اپنی اپنی ذات کی تحویل میں رکھ کر، کنجی وقت کے حوالے کر دی تھی...... وقت نے اب جا کر یہ کنجی ہمیں واپس کی ہے۔ یقین جانو، یہ ایک انوکھی شادی ہوگی۔"

OO

اور آپ جانئے، یہ انہی دنوں کا واقعہ ہے، جب دنیا کی تقدیر میں دہشت کے نئے باب لکھے جا رہے تھے۔ قارئین! یہ کہانی کی مجبوری ہے کہ یہ اپنے وقت اور حالت کے تجزیے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی...... 'پرانے ہزارہ' کے تاریخی دھماکے ابھی کم بھی نہیں ہوئے تھے کہ نئے ہزارہ کی چیخوں نے انسانیت کی کتاب میں کتنے ہی لہولہو باب کا اضافہ کر دیا...... 11 رستمبر ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگن پر دہشت گردوں کے ہنگامے کے بعد ہندو پاک کے درمیان کشیدگی بڑھتی چلی گئی...... پھر 13 ردسمبر ہندستانی پارلیامنٹ پر دہشت پسندوں کے حملے کے بعد صورت حال آہستہ آہستہ جنگ میں تبدیل ہوتی چلی گئی...... نتیجہ کے طور پر اپنی اپنی سطح پر دونوں ہی ملکوں نے کئی بھیانک قدم اٹھائے۔۔۔۔۔ ہندستان نے نہ صرف اپنا سفارت خانہ بند کیا بلکہ اپنے ہائی کمشنر بھی واپس بلا لئے...... فضائیہ اڑانوں پر بھی پابندی لگا دی گئی...... اس تعلقات کی سرحدوں پر آخری کیل ٹھوکنے کی کارروائی باقی تھی۔

اور وہ کارروائی تھی...... ہندستان سے پاکستان جانے والی سمجھوتہ ایکسپریس اور بسوں کو بند کرنے کی کارروائی......

قارئین! ان پابندیوں کا وقت وہی تھا، جب حسین، اپنی بائیس برسوں کی گمشدہ محبت کو نیا عنوان دینے کے لئے ہندستان آنے والے تھے...... یعنی سمجھوتہ ایکسپریس سے باراتیوں کا قافلہ آنے والا تھا۔

سرحدیں بارود اُگل رہی تھیں۔ واگہہ باڈر سے دتی بس اڈے تک گھنا کہرا چھایا ہوا تھا۔ باہر سرد لہر چل رہی تھی۔ میں اپنے ڈرائنگ روم میں تھا۔

اچانک یوں ہوا...... پورٹریٹ سے حسین کے دونوں گھوڑے کودے اور میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے...... میں نے غور سے دیکھا۔ یقیناً یہ پارتھینان کے آدھے حصے والے گھوڑے نہیں تھے۔ یہ گھوڑے اپنے حسن میں مکمل تھے۔ لیکن یہ گھوڑے ٹھہرے نہیں، بلکہ پلک جھپکتے ہی ڈرائنگ روم سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے ڈرائنگ روم میں، دیوار پر آویزاں پورٹریٹ کی طرف دیکھا...... وہاں ایک خالی کینواس پڑا تھا۔ مجھے حسین کے الفاظ شدت سے یاد آرہے تھے۔

''سب سے بُری خبر لکھی جانی ابھی باقی ہے۔ سب سے بُری خبر یہ ہوگی کہ محبت کرنے والے نہیں رہیں گے۔ سب سے بُری خبر کا تعلق محبت سے ہوگا دوست۔''

اور میں نے جوابی کارروائی کے طور پر کہا تھا...... ''سب سے بُری خبر آہستہ آہستہ لکھی جائے گی۔ جنگ اور دہشت کے ماحول میں''......

○○○

فریج میں عورت

(i)

وہ چپ چاپ اس بات کا اعتراف کر لیتا تھا...... ''ہاں، میرے فریج میں ایک عورت ہے''۔

......فریج میں عورت؟'

......' کیوں۔ عورت فریج میں نہیں ہو سکتی۔ میں جب چاہوں، اسے فریج سے باہر بلا لیتا ہوں۔ کمرے میں یار، اس کے ساتھ ہنستا ہوں۔ باتیں کرتا ہوں۔ دل بہلاتا ہوں۔'

OO

فریج والی عورت پہلی بار اس کے کمرے میں کب آئی یا اس کے کمرے نے پہلی بار فریج کا منہ کب دیکھا، یہ ایک لمبی کہانی ہے...... ممکن ہے آپ اس کہانی پر کچھ زیادہ یقین بھی نہ کریں، یا یہ کہانی آپ کو بے وقوفی سے بھری ہوئی ایک من گھڑنت کہانی نظر آئے۔ تسلیم! اس کے باوجود میں کہوں گا آپ اس کہانی کا مطالعہ ضرور کریں......

بہار کے موتیہاری ضلع کے رہنے والے نربھے چودھری کو دتی میں جگہ کیا ملی، قسمت کھل گئی۔ عام طور پر مہانگر میں آنے کے بعد آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ مگر نربھے چودھری کا رویہ دوسرا تھا۔

'' کا ہے، موتیہاری اب کم ہے کا۔ ارے اب یہاں بھی شوٹنگ ہوتی ہے۔ بڑے بڑے ہیرو ہیروئین آتے ہیں۔''

ان دنوں موتیہاری میں شول فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی، اور نربھے چودھری کے اپنے لفظوں میں......''یار روینہ کو تو دیکھ کے ہم پگلئے...... گئے......''

آپ مانیں یا نہ مانیں، ہر آدمی کے دماغ کے اندر ایک رنگین گلیمر کی دنیا ہوتی ہے۔ سو یہ دنیا ہمارے ہیرو نربھے چودھری کے ذہن میں بھی موجود تھی...... غلط پہاڑ ارتنے کی باری تب آئی جب اپنے نربھے چودھری کو کچھ دنوں تک جے این یو یعنی جواہر لال نہرو یونیورسٹی رہنے کا اتفاق ہوا۔ پیسوں کی تنگی ہوئی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کمپیوٹر میں گھس گئے...... کمپیوٹر کے آئیں۔بائیں۔ شائیں، بٹنوں پر کمانڈ نہیں ہوا تو، ایئر کنڈیشن، والوں کو جوائن کرلیا...... ایئر کنڈیشن کی ٹھنڈک برداشت نہیں ہوئی تو واشنگ مشین بنانے والی ایک نئی کمپنی میں سلیس مین ہوگئے۔ یہ نوکری بھی نہیں چلی تو کچھ دنوں تک ٹیوشن پڑھانے کا کام شروع کیا...... یہاں تک کہ ساؤتھ ایکس جیسی پاش کالونی میں ایک لڑکی کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ آخر ایم اے پاس تھے۔ لیکن 'بہاری' میں انگریزی بولنے کی وجہ سے، یہ ''ریسپیکٹیڈ'' کام بھی ان کے ہاتھوں سے نکل گیا...... ان کی دقت یہ تھی کہ:......

''ایاں لوگ انگریزی نہیں جانتے ہیں نا۔ بڑ بک۔ ہم کو بہاری کہتے ہیں۔ بتایئے بہار کوئی انڈیا سے باہر کا ہے۔؟ بڑے قابل بنتے ہیں۔ ارے ہم جو انگریزی بول دیں گے۔ ای کا بولیں گے۔ گاندھی جی بھی موتیہاری گئے تھے۔ پتہ ہے۔''

ڈھنگ کی نوکری کیا ملتی، چپل گھستے گھستے دور درشن کے لئے سیریل بنانے والے پروڈیوسر اجے گوسوامی سے ملاقات ہوگئی۔ کریٹیو ریلس...... بن گئے۔ کریٹیو ریلس کے پروڈکشن منیجر۔ ویزیٹنگ کارڈ بھی چھپ گیا۔ جمنا پار علاقے میں سستے ریٹ پر ایک چھوٹا سا کمرہ بھی مل گیا۔

تو گلیمر کی جو رنگین سی دنیا کبھی فلم ریل کی طرح ذہن کے پردے پر چلتی تھی، اب آنکھوں کے سامنے تھی...... شوٹنگ، ایکشن، کٹ، لائٹس، لڑکے، لڑکیاں...... اور مزے کی بات یہ، کہ چاروں طرف دوڑتے ہوئے ہمارے نربھے چودھری۔ کہیں اکڑتے ہیں۔ کسی لائٹ والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے باتیں کرتے ہیں۔ کبھی ''ہیروئین'' کے سامنے ٹھمکا لگاتے ہیں......

کچھ چاہئے تو نہیں آپ کو......؟

ہیروئین مسکرا کر پوچھتی۔ 'آج آپ بڑے خوش نظر آرہے ہیں۔'

جواب ملتا۔ 'آپ کو دیکھ کر کون خوش نہیں ہوگا۔'

'ہو ss ہو' ...... ہیروئین قہقہہ مار کر ہنستی ......

پیک اپ کے بعد جب چار یار شراب کی بوتلیں کھول رہے ہوتے، تو یہ باتیں ایک دم سے فلعا سی کی طرح زبیے چودھری کو پاگل بنا دیتی ______ عورت ...... سیکس ...... پچویشن۔ یہاں گفتگو میں صرف اور صرف عورتیں ہوتیں۔ چور دروازے سے دل میں داخل ہونے والی عورتیں ...... ان عورتوں کو لے کر ہزاروں قصے تھے ______ اور ایسا ہر قصہ زبیے چودھری کو زخمی کر جاتا تھا۔

OO

رات گئے شوٹنگ کے خاتمے کے بعد زبیے چودھری جب اپنے کمرے میں پہنچتے تو خالی کمرے کا اندھیرا انہیں ڈسنے لگتا ...... گفتگو والی عورتیں ...... تنہائی اور خاموشی کی بین کی آواز پر ناگن جیسی لہرانے لگتیں ...... بین کی آواز تیز ہوتی جاتی۔ پھر یہ ناگ ناگن تیز تیز لہراتے ہوئے ایک دم سے زبیے چودھری کے جسم میں داخل ہو جاتے۔ کافی دیر بعد جب اندر کا طوفان تھم جاتا تو زبیے چودھری کو لگتا ...... اس کی زندگی میں ایسی ہریالی کب آئے گی؟ کب تک عورت کے بغیر رہنا ہوگا۔

OO

اجے گھوسائی ...... زبیے چودھری کی نگاہ میں دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی تھا۔ آخر کو پروڈیوسر تھا۔ لڑکیاں اس سے چپکی رہتی تھیں۔ زندگی ہو تو ایسی، زبیے چودھری کو، اجے گھوسائی یعنی اپنے ہونہار آقا پر رشک آتا تھا ......

لیکن بھائی، پیٹ کا اپنا 'اتہاس' ہے ...... اور کبھی کبھی جب پیٹ کا جغرافیہ بگڑتا ہے نا، تو حالت بڑی بے رحم ہو جاتی ہے۔ کہنے کو تو زبیے چودھری فلمی دنیا کے آدمی بن گئے تھے، مگر اصل میں تھے کیا خاک پتی ...... نہ لاکھ پتی ...... نہ ہزار پتی۔ بک بک جھک جھک کے بعد تو اجے گھوسائی کی گانٹھ سے بندھے ٹکے دو۔ چار۔ پانچ سو روپے نکلتے تھے ______ 'کیا کہوں بھائی۔ دوردرشن کی حالت خراب ہے۔ ٹونی پرسنٹ تک دینے کو تیار نہیں۔ اب تم لوگوں کو دوں تو کہاں سے

دوں......'

یہ الگ بات ہے کہ پروڈیوسر کو دھکا دھک ٹریپل فائیو پینے کے پیسے مل جاتے تھے......
کبھی کبھی نربھے چودھری عجیب عجیب حساب لگاتا۔ ایک آدمی کے کھڑے ہونے میں کتنے پیسے درکار ہیں؟ شادی کرنے میں کتنا خرچ بیٹھے گا؟ شادی کے بعد کے خرچ میں کیا ہوں گے؟ اور اگر بچے آ گئے تو؟ یعنی کم پیسے میں ایک ایسی دنیا جسے طے کرنے میں قطب مینار کی بلندی تک کے فاصلے پسینے نکال دیتے تھے...... 'نا بھائی...... وہ ساری زندگی شادی نہیں کر سکتے۔ نا نو من تیل ہوگا، نا رادھا نا چے گی......'

نربھے چودھری گھبرا جاتے تو اجے گوسوامی کے بیڈروم میں منڈرانے والی لڑکیاں چپکے چپکے ان کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے بیٹھ جاتیں...... ہری ہری لڑکیاں۔ آسمان سے اتری ہوئی پریاں...... جیسے ایک دھند ہوتی ہے...... جیسے اس گھنی دھند میں کچھ بھی آگے پیچھے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا ہے—— لیکن نربھے چودھری اپنی پریشانی کی کینچلی اتارتے ہوئے دھند میں چپکے چپکے اتر جاتے۔

○○

گھر سے خط آ رہے تھے۔ پیسے چاہئیں۔ اجے گوسوامی سے ڈرتے ڈرتے پیسے مانگے تو ناراض ہو گئے۔ ''پیسے کیا ڈال میں پھلتے ہیں''
نربھے چودھری کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ لہجہ کمزور ہوا...... دھیرے سے بولا
''ڈال میں تو نہیں۔ لیکن ہمارے بنتے ہیں۔ ہمیں ضرورت ہے۔''
اجے گوسوامی نے ایک پل کو انہیں دیکھا۔ پھر ٹھٹھا کر ہنسے۔
'کتنے دن سے شیو نہیں بنایا ہے؛ وہ پھر ہنسے...... پروڈکشن میں ہو۔ ایسے چہرہ بگاڑ کر رہو گے تو لڑکیاں گھاس نہیں ڈالیں گی۔ سنو، تم کہہ رہے تھے کہ ٹھنڈے پانی کی تکلیف ہے۔ کہہ رہے تھے نا؟

○○

گودریج کمپنی کا ایک پرانا سا فریج اس نے ڈرائنگ روم کے پاس والے کباڑ خانے میں دیکھا تھا۔ ایک دم علاء الدین کے چراغ جیسا...... کبھی کبھی اس میں بوتلیں بھی رکھی دیکھی تھیں...... دو ایک بار اس نے خود اس میں سے بوتل نکال کر پانی پیا تھا۔ خشک گلے کو تر کیا تھا۔ اسے یاد آ گیا۔ اے جی گوسوامی اسے ٹٹولتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

'اچھا فریج ہے۔ پینٹ کرالو تو کوئی مانے گا نہیں کہ سترہ ہزار سے کم کا ہے۔ صرف اندر کی لائٹ نہیں جلتی...... 'ڈھبری؛ ڈھبری کہتے ہو نا۔ وہ پھر ہنسے...... مگر کیا روشنی میں موم بتی ڈھونڈنا ہے...... ارے کھانا رکھو۔ چار دن بعد کھاؤ۔ تازہ ملے گا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیو۔ برف جماؤ۔ شربت لسی بناؤ، کیوں، فریج چاہئے......؟'

اور اس طرح علاء الدین کے چراغ جیسی وہ فریج کب کیسے، نربھے چودھری کے کمرہ میں آ گئی، اس واقعہ کا ذرا تاریخ یاد نہیں ہے۔ لیکن فریج ان کے کمرہ نما دنیا میں آ چکی تھی اور یہیں سے اس کہانی کی شروعات ہوئی تھی...... جس نے نربھے چودھری کے مکمل وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

(2)

بہت پیچھے چھوٹا ہوا ایک گھر...... گھر کے کسی تنگ کمرے اور تنگ کمرے کے کسی گرد آلود طاقچے پر رکھی ہوئی کچھ آدھی ادھوری خواہشیں...... مٹی کے مرجھائے پودے والے گملوں میں رکھے ہوئے کچھ خواب...... شہر کی تنگ ویران گلیوں میں، اب اکیلے مٹر گشتی کرنے والے دوستوں کی جماعتیں۔

گھر سے چٹھی آتی تو جیسے یادوں کا ایک کارواں چل پڑتا...... اور جیسے سب نربھے چودھری کو گھیر کر بیٹھ جاتے...... ''وہاں موتیہاری میں سب کچھ چھوڑ کر آئے ہو۔ یہاں تیر مار لیا؟

نربھے چودھری کو پرچھائیاں گھیر کر بیٹھ جاتیں......

اس دن گھر سے پھر چٹھی آئی تھی...... چٹھی میں ایک ماں کا خواب بند تھا...... وہی پرانی داستاں کے بوسیدہ صفحے...... باپ ریٹائر ہو رہا ہے۔ بہن جوان ہے...... فکر کے چھوٹے چھوٹے طاقچوں سے گزرتے مسئلے......

نیند نہیں آ رہی تھی نربھے چودھری کو......

آسماں کے نیلگوں پردے پر رات بکھر چکی تھی۔ اچانک کمرے میں سرسراہٹ سی ہوئی...... پہلے چھم سے کوئی پائل بجی۔

نر بھے چونک گئے......کون؟

نقرئی سا قہقہہ گونجا۔

نر بھے چودھری اچھل گئے۔

''کون۔؟''

''میں......میں ہوں''

وہاں روشنی تھی۔ روشنی کے دائرے میں ایک بلا کی قیامت کھڑی تھی ــــ قیامت کے بدن پر کپڑے بھی قیامت کے تھے۔ چہرہ ایسا کہ خوبصورتی نے اپنی حدوں کو چھولیا ہو......'بس اس سے زیادہ نہیں' ــــ بدن کے نقوش اتنے تیکھے کہ دنیا کی ساری حسین عورتوں کے بدن بھی شرما جائیں ــــ کپڑے اتنے باریک کہ شاہی مخمل وکمخواب کے خزانے بھی ماند پڑ جائیں۔

اپنے نر بھے چودھری خاصہ ہکلا رہے تھے۔

ــــ 'کہاں......کہاں سے آئی ہو؟'

ــــ 'وہاں......فریج سے!'

ــــ 'فریج سے؟'

ــــ 'ہاں......'

ــــ 'کیوں......؟'

ــــ 'کیوں!' عورت کے ہونٹوں پر بلاخیز تبسم تھا......'بوتل سے جن آسکتا ہے فریج سے عورت نہیں آسکتی'

ــــ 'لیکن کیوں آئی ہو؟'

جواب میں عجیب سی بے تکلفی شامل تھی۔

ــــ 'تمہارے لئے'

ــــ 'میرے لئے!'

ــــ 'ہاں۔تمہارے لئے'

یقیناً وہ دنیا کی سب سے خوبصورت مسکراہٹ تھی جو اس کے ہونٹوں پر سجی تھی۔

......'صرف تمہارے لئے'

......'مجھے......یقین کیوں نہیں ہو رہا ہے''

______ 'پاگل ہو، فریج والی عورت ہنسی۔ دیکھو میں صرف تمہارے لئے ہوں۔'

......تو کیا میں تمہیں چھو سکتا ہوں______ ؟

نقرئی قہقہہ پھر گونجا____ 'دریا سے صرف قطرے کی تمنا رکھتے ہو......ارے آگے بڑھو۔ میں تمہاری ہوں صرف تمہاری......''

اس نے ہلکی سی انگڑائی لی...... کمرے میں یوں ہلچل ہوئی جیسے آندھی سے گھر کی کھڑکیاں۔ دروازے ہلنے لگے ہوں۔ یقیناً یہ ایک توبہ شکن انگڑائی تھی...... سرخ پھولے ہوئے ہونٹ......لمبی گردن...... کپڑوں سے انگاروں کی بارش کرتا ہوا نوخیز بدن......

وہ والہانہ طریقے سے ہنسی...... ''بڑھو، نا...... آگے بڑھو......''

اور ایک جھٹکے سے اس نے کپڑوں کے ہوک کھول دئے تھے...... اندھیرے کمرے میں روشنی کے گول دائرہ کے بیچ ایک برہنہ جسم دعوت نظارہ دے رہا تھا۔

''یار! یہ صرف تمہارا ہے......دریا سے صرف قطرے کی توقع رکھتے ہو......!''

نربھے چودھری کے بدن میں لرزش ہوئی۔ جسم میں ایک طوفان سا آیا۔ شریانوں میں خون کے گرم گرم لاوے دوڑ گئے۔ تو کیا یہ کوئی خواب تھا۔ مگر نہیں...... وہ مجسم سامنے کھڑی تھی...... اور ایسا توبہ شکن، پُرکشش بدن انہوں نے کبھی خوابوں خیالوں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

پھر جیسے چاند کی کشتی میں ہلچل ہوئی...... اور کشتی چاند کی برفیلی سطح کو پگھلاتے پگھلاتے دھند کی سرنگ میں ڈوب گئی......

وہ ہوش میں آئے تو سانس تیز تیز چل رہی تھی...... کپڑے ادھر ادھر بکھرے تھے...... عورت غائب تھی...... فریج کا دروازہ بند تھا...... مگر، کمرے میں ایک عجیب سی خوشبو پھیلی تھی...... اور اس سے بھی زیادہ بدن ایک عجیب سی لذت میں ڈوبا ہوا تھا۔

(3)

''سنو یہ کیا کہہ رہا ہے۔'' اجے گوسوامی زور زور سے قہقہہ لگا رہے تھے...... 'نہیں بھائی، مجھے...... مجھے مت روکو...... ہنسنے دو...... یعنی کہ فریج میں عورت...... فریج میں...... اور کہیں نہیں ملی ss ہو s...... ہو ہو sss...... یعنی کہ چوکی کے نیچے نہیں، ٹب کے اندر نہیں...... ss انٹرنیٹ کی عورت سنی ہے ss ٹیلی فون کال والی عورت کے بارے میں سنا ہے۔ نمبر ملائیے مستی بھری باتیں کیجئے...... یہ سب ٹھیک...... مگر فریج میں، ہو ہو؟ یار تم سچ مچ پگلا گئے ہو...... s

اجے گوسوامی کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے بھی ٹھہا کہ لگایا۔ اس وقت ان کے گھر نئی اسکرپٹ کو لے کر میٹنگ چل رہی تھی۔ نربھے چودھری نے بس یونہی دریافت کیا تھا...... یار فریج ٹھیک سے کام کر رہا ہے نا؟

'کام کیا کر رہا ہے...... فریج میں عورت آ گئی ہے۔'

نربھے چودھری کے منہ سے یہ جملہ نکل تو گیا لیکن ماحول پر جیسے اس جملے کا پہلی بار میں کوئی اثر نہیں ہوا۔ اجے گوسوامی رائٹر کے ساتھ اسکرپٹ کی بات چیت میں لگا رہا۔ ہاں پاس بیٹھے آدمی نے چٹکی لی۔

''نربھے جی! شادی نہیں کرو گے تو فریج میں عورت ہی رہے گی۔ سامان تو نہیں رہیں گے نا......''

''اب لو جیسے ہم جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ عورت آ گئی ہے تو سامان کہاں رکھیں بھائی۔''

اجے گوسوامی نے ڈانٹا...... ''اپنا بہاری غصہ یہاں مت دکھاؤ...... کہہ دیا نا، پیسے مل جائیں گے...... شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ تم آرٹ ڈائرکٹر، سیٹ ڈیزائنر، کسٹیوم، میک اَپ مین، کی ڈیٹیل تیار رکھو...... اور ہاں۔ وہ رائٹر کی طرف دیکھتے ہوئے ہنستے تھے۔'' شادی کر لو...... کہو تو اس سیریل کی ہیروئین سے کروا دیں۔ کیوں؟''

رائٹر نے بھی ٹھہا کہ لگایا۔'' پھر فریج سے عورت نہیں آئے گی۔''

'' آپ سمجھتے ہیں کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ پیسہ مانگنے کے لئے اپنی جھنجھلاہٹ دکھا رہے ہیں۔ سمجھئے...... آپ کی مرضی...... لیکن ہم جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔ ہنمان جی...... جے بجرنگ بلی، جس کی چاہیں قسم لے لیجئے۔ وہ عورت تھی۔ ہاڑ مانس کی عورت، ارے، پری لوک میں ایسی کیا عورت ہوگی۔ جو وہ تھی...... ہم تو آواز سنتے ہی سکپکا گئے۔''

کمرے میں ہنسی کا دورہ پڑا......

ایک آواز ابھری...... 'پھر وہ فریج کھول کر آپ کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔'

'ہاں ایسا ہی ہوا۔ بالکل ایسا ہی......'

'پھر تو آپ نے......'

اس کے بعد ہنسی کے دورے نے رکنے کا نام ہی نہیں لیا۔

''ہنسئے آپ لوگ۔ ہنسئے۔ میرے پاس بے کار کا وقت نہیں ہے۔ آپ کی ہنسی میں شریک ہونے کے لئے...... میں جا رہا ہوں۔''

نربھے چودھری غصّے کے عالم میں ہنسی ٹھہاکہ کے بیچ کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

مگر...... جاتے کہاں؟

ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کیا سچ مچ رات جو کچھ ہوا وہ خواب نہیں تھا...... فریج میں سے عورت...... جیسے آسمان سے دودھیا چاند، خاموشی سے ایک رات آپ کے ساتھ رہنے کے لئے آ جائے...... نہیں نربھے چودھری، وہم ہوا ہے تمہیں...... وہم......!

OO

نربھے شام گئے تک آوارہ سڑکیں ناپتے رہے۔ سڑکوں پر ناچتی تتلیاں...... لیکن فریج والی تتلی...... شام کے گھنے سائے پھیل گئے تھے۔ ڈھابے میں کھانا کھایا...... تب تک رات کے نو بج چکے تھے۔ اب ایک ہی منزل تھی، گھر ـــــ پھر وہی راستے...... وہی کمرہ...... وہی تنہائی...... مگر......

دروازے کا تالا کھولتے تک، نئے احساسوں والا کپڑا بدل چکے تھے نربھے چودھری ـــــ کیوں؟ اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ بس دروازے...... اور تالا کھولنے تک کوئی پختہ ذہن کا آدمی ان کے اندر سما گیا تھا۔ کہیں سے خوشبو کا تیز ریلا اٹھا تھا۔ ایک جانی پہچانی سی خوشبو...... یہ خوشبو ان کے پورے جسم، پورے وجود کو معطر کر رہی تھی ـــــ لیکن کیوں؟ دل دھڑک رہا تھا۔ اس طرح کی بے چینی سے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا ـــــ اور یہ سب کل ملا کر ایسا تھا، جیسے ابھی حال میں ان کی شادی ہوئی ہو۔ گھر پر نئی نویلی دلہن انتظار کر رہی ہو......

وہ دروازہ کھول کر اندر گئے اور جیسے سہم گئے...... چھناکہ سا ہوا......

کمرے میں روشنی تھی۔ بتی جلی ہوئی تھی۔ ایک خالی میز جو کافی دنوں سے بیکار پڑی

تھی۔ صفائی کر کے اسے سنگھار میز میں بدلا جا چکا تھا۔ کمرے میں جیسے عطر کا چھڑکاؤ ہوا تھا۔ نیا بستر...... نئی چادر، چادر پر خوشبو دیتے پھول بھی بکھرے تھے۔ سنگھار میز کے پاس وہ دنیا جہاں سے بے نیاز اپنے سنگھار میں یوں ڈوبی تھی، جیسے نئی نویلیاں دلھے کے آنے کے انتظار میں دنیا جہاں سے بے خبر ہو جایا کرتی ہیں۔

اس نے نظر اٹھائی۔ مسکرائی ـــــ کان کے جھمکے کی کیل درست کی...... آئینے میں فخر سے اپنا چہرہ دیکھا...... پھر جیسے جل ترنگ کو دھیرے سے چھوڑ دیا گیا ہو......!

......'آ گئے تم؟'

......'میں......' نر بھے پسینے پسینے تھے......

......'ہاں تم...... تم'

وہ آہستہ سے ہنسی...... جسے موسیقی سناتی لہروں کو، موسیقار نے اچانک ایک نئی دھن دے دی ہو...... وہ آگے بڑھی...... آج اس نے ریشمی ساڑی پہن رکھی تھی۔ ہلکی، آسمانی رنگ کی...... اس پر سانولی دھوپ کے رنگ کی لکیریں جھلملا رہی تھیں ـــــ اس سے میچ کرتا بلاؤز تھا...... وہ اس کے بلکل قریب آ کر ٹھہر گئی...... اتنے قریب کہ وہ اس کے سانسوں کے سرگم سن سکتا تھا...... اتنے قریب کے وہ دھڑکنوں کا حساب لگا سکتا تھا...... وہ ہنس رہی تھی......

......کیا آج بھی تمہیں سب کچھ خواب سا لگ رہا ہے۔

......ہاں!

......'پاگل ہو...... دیکھو۔ میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ کہہ سکتے ہو، یہ وہی کمرہ ہے جہاں تم رہتے تھے۔'

......نہیں!

......'وہ پینٹنگس دیکھی؟'

......'پینٹنگس؟'

......''ہاں، وہ ہنسی...... وہ دیکھو...... 'ناریوفو'، کی پینٹنگس...... خواب دیکھتی عورت کے ہاتھ میں ایک مرا ہوا بچہ......''

......بچہ مر کیوں گیا ہے؟''

میں نہیں بتاؤں گی۔ تم بولو...... میں تو فریج سے آئی ہوں اور یہ پینٹنگ تمہاری دنیا،

تمہارے لوگوں کے لئے ہے...... لیکن سچائی یہی ہے کہ عورت خواب دیکھ رہی ہے اور بچہ...... بچہ مر چکا ہے......!'

......''بچہ مر کیوں گیا ہے......؟'' وہ پھر بوجھل آواز میں بولا۔

'اس لئے کہ عورت خواب دیکھ رہی ہے...... جانتے ہو...... ناریوفو نے یہ غیر معمولی پینٹنگ کب بنائی تھی؟ 1942ء کے آس پاس۔ جب تم دنیا کو دوسری عالمی جنگ میں جھونک چکے تھے۔ کیا نہیں......؟ یاد آیا اور خود تم لوگ کیا تھے...... آزادی مانگ رہے تھے۔ بھکاریوں کی طرح...... مٹھی بھر لوگ جو تمہارے گھر پر قبضہ کر چکے تھے۔ تم ان سے چلے جانے کی مانگ کر رہے تھے...... ہے نا، وہ بھی بھکاریوں کی طرح...... ایسے ہی ہو تم......' اس نے ٹھنڈا سانس بھرا......

''ایک پُراسرار تہذیبی شہر کی تعمیر کرنے والے اور ایک جھوٹی جذباتیت کا استقبال کرنے والے...... ہے نا......'' وہ کہتے کہتے پھر ہنسی......

......'لیکن یہ سب تم......؟'

......'تمہارے لئے لائی ہوں۔ گھبراؤ مت۔ چوری نہیں کی ہے۔ چوری کر بھی نہیں سکتی ہوں...... بازار سے لائی ہوں؟

......'تم بازار گئی تھی؟'

......ہاں، کیوں؟'

......نہیں میں سمجھ رہا تھا......'

......تم زیادہ سمجھنے کی کوشش مت کیا کرو...... سنو مجھے اس طرح گندے میں رہنا پسند نہیں ہے...... سنا تم نے۔ اس لئے میں صفائی کی...... عطر کا چھڑکاؤ کیا...... دیواروں پر پینٹنگس لگائی۔ پھر تمہارے آنے کی راہ تکنے لگی اور تم آ گئے......''

اس نے گلے میں بانہیں ڈال دیں......

شاید وہ دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی کی سب سے خوبصورت انگلیاں تھیں...... ایسی انگلیاں...... جن کے لئے الفاظ اور محاورے بھی کم پڑ جاتے ہیں۔

پشت پر اس کی گرم گرم ہتھیلیوں کا رقص، جسم میں عجیب سی سنسناہٹ پیدا کر رہا تھا۔ پھر جیسے 'تابڑ توڑ' اپنے گرم گرم بوسے سے اس نے نربھے کی آتما کے اندر تک، عجیب سی سنسنی پھیلا دی...... ایک لمحہ کو ٹھہری۔ پھر بارش کے آخری قطرے تک اسے شرابور کرتی چلی گئی......

'سنو!'

'کیا ہے..... نربھے کی آواز جیسے ہزاروں فٹ نیچے کنویں میں چھوٹ کر رہ گئی تھی......

'سنو! جب تم چلے جاتے ہو، تو بڑے یاد آتے ہو۔ اتنا انتظار کیوں کراتے ہو.....'

قسم سے۔ وہ دنیا کے سب سے مدھر، سب سے ذائقہ دار، سب سے حسین اور سب سے زیادہ جلتے ہوئے ہونٹ تھے..... جس نے اپنی تپش سے ایک بار پھر اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیے تھے......

''چلو منہ ہاتھ دھولو..... تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ گھبراؤ مت..... اب تمہارا پورا خیال رکھوں گی..... میں..... مگر.....''

''مگر..... مگر کیا.....؟''

'ابھی نہیں..... اوہ..... تم میں کچھ بھی جاننے کی بے چینی کس قدر ہے۔ شاید تم نہیں جانتے..... انہیں باتوں نے..... ہاں، انہیں باتوں نے تو..... اوہ..... آئی لو یو نربھے.....''

جیسے زمین چلتے چلتے رک گئی ہو..... آسمان تھم سا گیا ہو..... کوئی چونکانے والا، جذباتیت سے بھرا فلمی نظارہ ہو..... پہلی بار اس لڑکی کے ہونٹوں پر نربھے کا نام آیا تھا..... نر..... بھے ____ پہلی بار..... دلّی کے بازار، کنزیومر کلچر میں آہستہ آہستہ یہ نام کتنا عجیب، کتنا بے رس اور کتنا بدنما لگنے لگا تھا..... جیسے 'موتیاری کی ایک خاص خوشبو اس کے نام سے لپٹی ہوئی ہو..... وہ اس نام کو بار بار دلّی کے رنگ میں بدلنے کا خواہشمند تھا۔ مگر آج..... جیسے اس نام سے زیادہ خوبصورت کوئی دوسرا نام ہو ہی نہیں سکتا تھا......

'چائے'..... وہ اچانک جیسے خواب سے جاگا......

..... اتنی دیر میں اس نے چائے بھی بنالی تھی..... چائے نربھے کے ہاتھ میں کانپ رہی تھی..... وہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

'ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟' وہ مسکرائی

'کیا یہ خواب ہے؟'

'کیوں؟'

'سوچ رہا تھا' ہم جیسوں کے لئے خواب ہی کیوں ہوتے ہیں؟ زندہ رہنے کے لئے

بھی خواب...... محبت کرنے کے لئے بھی خواب......'

'لیکن یہ خواب نہیں ہے......'

'پتہ نہیں'

'خواب کا جسم نہیں ہوتا ہے...... اس کی نقرئی ہنسی کمرے میں پھیلتی چلی گئی...... وہ اٹھ کر سنگھار میز کے قریب کھڑی ہوگئی...... وہ جیسے اپنے عکس کو بے حد پُرکشش انداز میں دیکھنے کی کوشش کررہی تھی...... پھر جیسے کمرے کی تنہائی میں شعلہ بھڑکا...... رات اسٹوب گیس' کی طرح چیخی...... اور کمرے میں آگ کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں...... اس نے بلاؤز کے ہوک کھول دیئے تھے...... ریشمی ساڑی، دنیا کے سب سے حسین جسم سے الگ ہوکر، اس کے بستر پر، بے ترتیبی سے پھیل گئی تھی______ کمرے میں جیسے 'لیزرریز' کا رقص چل رہا ہو...... گداز بانہیں، صدیوں کی پیاس اور عقیدت کی حد تک، میناروں کے سفید گنبد کی طرح، تنے ہوئے مصفہ سینے...... یا...... دو قبہ نور...... دنیا کے سب سے حسین پاؤں...... اس کی آنکھوں کی کشتیوں میں اس وقت وہی کشش تھی جو شاید خالق دو جہاں کو، سب سے خوبصورت 'تصور' گڑھنے کے دوران ہوئی ہو______! اس نے اپنی بانہیں بچھائیں......

'آؤ......' اس کی آواز میں 'ہیجان' کی حد تک سنسنی خیزی، آگئی تھی______ '......آؤ......' اوہ...... تم دیر کررہے ہو...... آؤ۔ اس سچ کے لئے، جس کے لئے ہم پیدا ہوئے ہیں...... اُس سچ کے لئے جس کے لئے آخری سانس تک ہم اپنے جینے کی آس قائم رکھتے ہیں۔

اور نربھے چودھری۔ جیسے آنکھیں بند تھیں______ جیسے خوابوں سے جنت کی طرف ایک خوشبو لٹاتی، کھڑکی کھل گئی ہو...... جیسے ہوا میں تیرتا ہوا ایک رتھ ہو...... اور رتھ، زندگی کے سب سے خوبصورت ذائقے کو پور پور میں اُتارتا ہوا اڑتا جاتا ہو......

...... جیسے ہوا تھم گئی...... سانسیں رُک گئیں...... اُس کے بدن پر دنیا کا سب سے خوبصورت ننگا جسم اور...... تمام تر ہیجان خیزیاں لٹا کر تھکا ہارا...... اس کے جسم کے گوشت سے 'عبادت' کی ایک نئی عبارت لکھنے میں مصروف تھا______ اس کی آنکھوں میں شوخیاں تھیں......

'سنو۔'

اس کے بدن کی بے کراں موجیں، اس کے بدن کے ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں......

'سنو۔اب میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔' آواز میں تھرتھراہٹ تھی......

'ہاں پیسے۔جو تھے سب ختم ہو گئے۔پینٹنگس......عطر، چادریں اور......جو پیسے تھے۔ وہ تمہارے گھر کی خریداری میں لگ گئے......

'ہاں'

'مجھے چاہتے ہو تم؟'

'ہاں'

'میری سانسوں سے پیار ہے؟'

'ہاں'

'میرے جسم سے؟'

'ہاں؟

'اور مجھ سے؟'

'ہاں'

'اور یہ بھی چاہتے ہو کہ میں کہیں نہیں جاؤں۔میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں......''

'ہاں'

'تو پھر تمہیں میرا خیال رکھنا ہوگا۔'

وہ اپنے بدن کی 'بے کراں موجوں' کو سنبھالے، اس کے بدن کے ساحل سے ہٹ گئی تھی......

'سمجھ رہے ہونا، نربھے چودھری......تمہیں میرا خیال رکھنا ہوگا......''

وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی ریشمی ساڑی کی 'شکنوں' میں کھوگئی تھی______

'تمہیں مجھے خوش رکھنا ہوگا۔میری......میری فرمائشیں پوری کرنی ہوں گی......سن رہے ہو، نربھے چودھری......میرے لئے......'

اس کی نقرئی، لڑکھڑاتی آواز کا 'جل ترنگ' کمرے میں گونج رہا تھا......

'سوچو میں......ڈھل جاؤں تو؟ میں جیسی ہوں، ویسی نظر نہ آؤں تو______یہ سب کچھ تم پر ہے نربھے چودھری......تم پر______مجھے خوبصورتی پسند ہے۔اس کمرے کو جنت سے زیادہ خوبصورت بنادو......مجھے خوشبوئیں پسند ہیں......میرے لئے خوشبوؤں کا خزانہ لے آؤ______

میرے لئے تم بھی اپنے آپ کو بدلو گے نربھے چودھری...... بدلو گے نا......؟ خوشبو کو، خوشبو اور ایک حسین جسم کو ایک حسین جسم کی چاہت ہوتی ہے...... میرے لئے تم یہ سب کرو گے نا، نربھے چودھری، ورنہ...... ورنہ......'

OO

لفظ بجتے رہے...... بجتے رہے...... وہ اٹھا تو سورج کی شعائیں سیدھے کھڑکی سے ہوتی ہوئی اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھیں...... فریج والی لڑکی غائب تھی ____ رات کی سچائی کے احساس کے لئے وہ سب چیزیں، یہاں تک کہ 'ناریوفو' کی پینٹنگس تک کمرے میں موجود تھی۔ بستر پر وہ ننگ دھڑنگ پڑا تھا۔ ابھی بھی جیسے خوشبوؤں نے چاروں طرف سے، اسے اپنے دائرے میں لے رکھا تھا...... مسرت کا عجیب سا احساس اب بھی ہو رہا تھا۔

'یہ سب کیا ہے؟'

یہ کیا کیسا خواب ہے۔ وہ سمجھ پانے سے قاصر تھا۔ کپڑے پہن کر اس نے ڈرتے ڈرتے فریج کھولا۔ فریج خالی تھا...... مگر وہی رات والی خوشبوئیں فریج کے اندر بھی بسی ہوئی تھیں۔

(4)

اب نربھے چودھری نکلنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن کیا یہ وہی پرانے نربھے چودھری تھے۔ 'حلیہ پوری طرح سے بدلا ہوا۔ کالی آئرن کی گئی پینٹ پر، پوری آستین والی سفید شرٹ...... اور دنوں کی طرح جھٹ پٹ جو ملا پہن کر تیار نہیں ہوئے نربھے چودھری...... کپڑے ہی کتنے تھے۔ اس پر بھی ڈھلے ہوئے کپڑوں کی تعداد کتنی ہوتی تھی۔ لے دے کر ایک جوڑا...... کپڑے بھی خود ہی دھونے پڑتے تھے۔ لاجپت نگر مارکیٹ سے دو نمبر کا سستا سا آئرن مل گیا تو اٹھا کر لے آئے نربھے چودھری۔ لیکن کپڑے آئرن کون کرے۔ صبح صبح بس پکڑنے کے چکر میں آئرن بے چارا ویسے ہی 'کوٹ' کے ڈبے میں بند رہا لیکن...... دلّی آنے کے اتنے برسوں بعد جیسے سارے قاعدے قانون ان کے لئے بدل گئے تھے؟...... اور تو اور...... دو ایک ٹائی لوہے والے صندوق میں پڑی تھی۔ کبھی گفٹ میں ملی ہوگی۔ لیکن پہننے کی نوبت نہیں آئی۔ وہی موتیہاری کا چھیلا۔ اپنے یہاں عام دنوں میں وہ ایسے سوٹیڈ بوٹیڈ ہو کر نکل سکتے تھے؟ کیوں نربھے چودھری؟ پیچھے سے

''شاک'' سے کمینٹ پاس ہوتا...... ''نیا ہے'' کا ہے بھائی۔ موتیہاری کا چھیلا''۔

لیکن آج موتیہاری کے اسی چھیلے نے اپنی شکل وصورت بدل ڈالی تھی۔ اس پر پرفیوم۔ یہ پرفیوم کی شیشی اسے مادھری نے دی تھی۔ اپنے کریٹیو ریلس کی پرمانینٹ ایکٹریس۔ جس کے بارے میں یونٹ والوں کا کہنا تھا...... ارے مادھری کا ٹانکا اجے گوسوامی سے، کوئی آج سے 'بھڑا' ہے...... دیکھتے نہیں، ان کے ہر پروڈکشن میں کوئی نہ کوئی رول ضرور ہوتا ہے۔

'مادھری!'

ایک مخمور کایا...... بنداس۔ پتہ نہیں، اس دن کیا خاص بات تھی۔ کوئی خاص بات تھی، تو بس یہ تھی کہ مادھری اسے سیٹ پر تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ پھر اسے دیکھ کر مادھری کی آنکھوں میں جیسے چمک آگئی...... ''نربھے جی! آپ یہاں ہو''

''کیوں؟''

''ارے ہم آپ کو کہاں کہاں تلاش کر رہے تھے۔''

''کیوں؟'' اسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ مادھری جیسی لڑکی اسے تلاش کر سکتی ہے...... بیٹا یہ ہے فلم میں آنے کا مطلب...... کا؟ کہ مادھری جیسی لڑکیاں بھی...... ہے s s ہے s s اس نے کھیسیں پنوریں۔ اور مادھری نے پرفیوم اس کی طرف بڑھا دیا...... ''خاص تمہارے لئے۔ دارجلنگ گئی تھی شوٹنگ میں۔ دیکھو وہاں بھی تمہیں نہیں بھولی۔''

نازک سالمس۔ مادھری نے ہلکے سے پرفیوم کا چھڑکاؤ اس کی قمیض پر کیا۔ آنکھوں میں قوس قزح تن گئے۔ لیکن فوراً ہی الیا راجا کی فلم 'اپوّ راجا' کا وہ بونا اُسے یاد آگیا...... جسے فلم کی اداکارہ نے انگوٹھی دیتے ہوئے جلدی جلدی کہا تھا...... ''منگنی سمجھتے ہونا۔ کل صبح وقت پر پہنچ جانا۔ دیر مت کرنا......'' اداکارہ نے وہ انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی تھی۔ بونا کمل ہاسن اپنے بونے جوکر دوستوں میں منگنی کی اس انگوٹھی کو لے کر کتنا خوش ہوا تھا۔ گانا بھی گایا۔ دوستوں نے بھگوان کی طرف سے 'اچنبھے کے طور پر لکھی جانے والی تقدیر' کے لئے اُسے مبارکباد بھی دی۔ مگر آگے...... اس وقتی خوشی کا نتیجہ کیا نکلا تھا...... ''ارے اپوّ! انگوٹھی تو نکالو۔ دیر ہو رہی ہے۔' اور اداکارہ رجسٹرار کے پوچھے جانے پر ہنستی ہے...... ''گواہ یہ ہے اپنا اپوّ...... چلے گا......''

'چلے گا......؟' رجسٹرار ہنستا ہے......

پرفیوم لے کر دیر تک نربھے چودھری گم صُم کھڑا رہا...... لیکن وہاں اس پر ہنسنے کے لئے

کوئی رجسٹرار نہیں تھا۔ اسے لگا، الف لیلیٰ جیسی کسی کہانی کے اوراق اس کے سامنے کھل گئے ہوں...... مادھری بند اس ہے تو کیا ہوا...... لوگ غلط بولتے ہیں...... مادھری ایسی ہو ہی نہیں سکتی...... وہ بھی اجے گوسوامی......؟ کیا اس کے پاس اجے گوسوامی جیسے لوگوں کی کمی ہے......؟ اور پھر...... یہ تو میڈیا ہے میڈیا۔ یہاں تو ایسی کہانیاں روز بن جاتی ہیں۔

'مادھری!'

ہونٹوں تک آکر یہ نام جیسے 'رس شرنگار' سے بھرپور غیر معمولی شاعری میں بدل گیا ہو...... لیکن شاعری کتنی جلد باسی اور سڑاند دینے لگی تھی......

'مادھری'...... وہ اسے پکارتا ہوا میک اَپ روم میں چلا گیا...... دروازہ کے پٹ آن میں کھلے تو، وہ جیسے موتیہاری کا لمبے قد والا بونا بن گیا تھا...... اجے گوسوامی کی بانہوں میں قید مادھری۔ مادھری نے چلا کر آواز دی تھی...... 'ارے...... نربھے...... سنو تو......'

'جانے دو......' یہ اجے گوسوامی کی آواز تھی......

'تمہارے والے میں سے ایک پرفیوم میں نے ......'

اجے ہنس رہے تھے...... ''پرفیوم، اور یہ بہاری...... تم بھی پاگل ہو مادھوری......''

دونوں کا ایک ساتھ قہقہہ گونجا تھا۔ لیکن اب، کچھ بھی آگے سننے کو وہاں رُکا نہیں، نربھے چودھری۔ جیسے پیچھے ہزاروں کی تعداد میں کتے پڑے ہوں...... ڈیفوڈل ڈاگس...... ڈیفوڈل۔ جلتے ہوئے...... ان گنت تعداد میں۔ اداکارہ نے منو کو انگوٹھی دی ہے۔ مادھری نے نربھے کو پرفیوم دیا ہے...... 'اپو سمجھتا ہے کہ'...... 'نربھے کو لگتا ہے کہ......'

بونا اپو 'پست' ہوتے ہوتے ہوئے اپنے قد سے کتنا کم ہوا ہوگا؟ مگر...... نربھے...... وہ اپو سے زیادہ 'بے وجود' ہو گئے تھے ــــــ چھوٹا لمبے قد والا بونا...... پھر وہ پرفیوم کمرے کی کال کوٹھری میں پھینک دیا گیا۔ شاید اسی، نئی صبح کے انتظار کے لئے۔ اسی دھانی دھانی صبح کے انتظار کے لئے......

پرفیوم کپڑے میں مارتے ہوئے ایک عجیب سی خفیف ہنسی، نربھے کے ہونٹوں پر کھل رہی تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے پیسے گنے تھے اور پہلا کام کیا تھا...... اپنے قدم پاس والے بیوٹی پارلر کی طرف تیز کئے تھے۔

(5)

''تم نربھے ہو...... نہیں، یقین نہیں آتا۔'' اجے گوسوامی کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی تھی...... آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے نربھے کو غور سے دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے، ڈھنگ سے تراشے گئے بال...... بدن پر قاعدے کی پینٹ اور شرٹ......

''تو تم سچ مچ نربھے ہو؟''

''کیوں؟''

''یقین نہیں ہوتا۔''

''لیکن اس میں یقین نہیں ہونے کی......''

نربھے 'کہتا کہتا' ٹھہر گیا...... اجے گوسوامی اسے غور سے گھور رہے تھے۔ وہ جب بھی اس طرح گھورتے تھے۔ اسے ڈر لگتا تھا......

''رہنے دو۔ دیکھتے نہیں......''

''مطلب......؟''

''مطلب، آج یہ خود پروڈیوسر بن گیا ہے۔ ذرا بال تو دیکھو s s s''

''ذرا چال تو دیکھو s s s''

کمرے میں ٹھمکا لگ رہا تھا......

''بال تو دیکھو s s s گال تو دیکھو s s چال تو دیکھو s s s شرٹ تو دیکھو s s s پینٹ تو دیکھو s s s پھر پورا ڈسکو شروع ہو گیا......''

''دیکھو جی دیکھو...... نربھے کو دیکھو s ایک بار دیکھو s بار بار دیکھو۔''

نربھے گم صُم تھا۔ وہ جان رہا تھا۔ مذاق اپنی حدوں کو پار کر رہا ہے...... سب سوچ رہے ہوں گے...... سالا s بدلا بدلا سا لگ رہا ہے بہاری۔ بہاری مطلب......، اسے لگا، مادھری اُسے دیکھ رہی ہے......

لیکن فوراً ہی وہ عورت اس کی آنکھو کی اسکرین پر چھا جاتی ہے...... 'سن رہے ہو نا نربھے! خوشبو کو خوشبو اور ایک حسین جسم کو ایک حسین جسم کی چاہت ہوتی ہے...... میرے لئے تم یہ

سب کرو گے نا...... ؟ کرو گے نا، نربھے چودھری؟...... ورنہ s s s ورنہ......''

لفظ لگاتار چیخ رہے تھے......

اور ادھر ڈسکو جاری تھا......

''ذرا گھوم کے دیکھیو s s جے نربھے s s آگے سے دیکھیو s s جے نربھے۔''

اجے گوسوامی نے اس کے بدلے چہرے کی آگ کو پڑھ لیا تھا۔ 'ٹھہرو۔ ٹھہرو'۔ وہ چیخے...... یعنی حد ہوتی ہے۔ حد ہوتی ہے بے شرمی کی۔ آپ سب نے ایک سیدھے سادھے بہاری کو...... معنی...... ہنسئے مت...... بہاری کوئی گالی تھوڑے ہی ہے۔''

اجے خالص نربھے 'اسٹائل' سے بول رہے تھے......''بہاری بدل نہیں سکتا کا......؟ ضرور بدل سکتا ہے...... اور پوچھ کے دیکھو...... یقیناً، اس کے پیچھے بھی اُسی عورت کا ہاتھ ہوگا۔ کیوں نربھے؟

''جی s s s s''

کسی نے آواز لگائی...... 'فریج والی عورت کا'۔

''ہاں بالکل''۔

''لو دیکھو......''

ہنسی کا فوارا چھوٹا تو نربھے نے یکا یک سامنے والے آرٹسٹ کا گریبان پکڑ لیا......

''سالے''...... ماحول حیرت زدہ 'طبلوں' کی آواز رک گئی...... جیسے، سوئی بھی گرے تو آواز سن لو۔ یکا یک، بہتی ہوئی ہوا تھم گئی......''مذاق اُڑاتے لوگوں پر بجلی گر گئی...... نربھے کا سارا غصہ چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

اس نے جھٹکے سے بے چارے آرٹسٹ کا گریبان چھوڑا۔ ہتھیلیاں ابھی بھی گرم تھیں۔ وہ یکا یک پلٹا......

''سنو اجے گوسوامی! ایک بات جان لو۔ بہاری 'بزبک' بن سکتا ہے۔ تو گریبان بھی تھام سکتا ہے۔ مجھے نہیں کرنا تمہارے ساتھ کام...... کل پھر آؤں گا۔ پئی سا نکال کر رکھنا......''

پھر وہ ٹھہرا نہیں، واپس آ گیا۔

ماحول میں سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں تھا، وہیں آنکھیں نیچے کئے کھڑا رہا۔ یہ کیوں ہو گیا؟

یہ سارا کچھ ویسا تھا، جیسے دوستوفسکی کے 'ایڈیٹ' نے پرنسز کی پارٹی میں کیا تھا...... سناٹے کو بھنگ کیا اجے گوسوامی نے۔

''چلو چلو اسکرپٹ پر بیٹھتے ہیں......''

مگر وہ ابھی بھی اپنے چہرے کے احساس کو چھپا نہیں پائے تھے......

(6)

''زندگی سرکس نہیں ہے اور سنو ز بھے۔ تم اپو نہیں ہو۔ تم اپو ہو بھی نہیں سکتے۔ تمہارے ساتھ میں ہوں، میں...... سن رہے ہونا......؟''

کمرے میں خوشبو پھیل چکی تھی...... نقرئی قہقہہ پھر گونجا......

''دیکھو s s s s s آج میں نے نیا سنگھار کیا ہے، تمہارے لئے صرف تمہارے لئے لئے......''

عورت اُٹھتے ہوئے، آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ پور پور سے خوشبو کی لہریں پھوٹ رہی تھیں...... 'آئینہ' یقیناً حیران تھا کہ کبھی اس کے شیشے، جیسے وجود میں اتنا غیر معمولی 'عکس' بھی سما سکتا ہے۔

''پتہ نہیں مجھے...... مجھے کیا ہوگیا تھا s s پتہ نہیں۔ اب وہ......''

''ڈرتے ہو۔''

''ڈرنا پڑتا ہے...... گھر ہے...... پتا جی ہیں...... اور۔''

''میں s s'' ...... آئینہ نشے میں ڈوب گیا تھا......

''میں s s s تمہیں میری پرواہ نہیں۔ پتھر ہو تم۔ میری طرف دیکھو...... اُس کا 'سنگھار' ویسا تھا...... جیسے سارا عالم ہنسی رو کے ہو، کہ بادشاہ تو ننگا ہے......!

''کیا دیکھ رہے ہو......''

جسم سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

''تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا ز بھے۔ سمجھ رہے ہونا...... دیکھو تم مضبوط ہوئے...... اور یہ کمرہ پہلے سے زیادہ روشن ہوگیا۔ یقین کرو میں صرف تمہارے لئے بنی ہوں...... تمہارے لئے...... میں لہر ہوں...... جھرنا ہوں...... سنگیت ہوں...... خوشبو ہوں...... اور سب سے زیادہ میں

تمہاری ہوں...... تمہاری ہوں نر بھے...... s s"

پھر جیسے روشنی کا جھکا کہ ہوا......

"آواز میں سنگیت پیدا ہوا...... 'آؤ مجھ میں سما جاؤ s s سما جاؤ s s s"

اور......

قارئین!

ٹھیک اُسی لمحہ جو کچھ پیش آیا۔ نہیں جانے دیجئے۔ نہیں ٹھہریئے۔ یعنی، جو کچھ ہونے جا رہا تھا۔ نہیں ٹھہریئے۔ میں اپنا تبصرہ اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر اُسی لمحہ، اس جگمگاتے، روشن کمرے میں یکا یک بھگدڑ مچ گئی۔ یکا یک باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ عورت پہلے متحیر ہوئی۔ پھر سنگیت تھما۔ خوشبو اُڑی۔ لہریں گم ہوئیں۔

دستک بڑھتی گئی۔

کمرہ یکا یک چیخ و پکار کرنے لگا۔ عورت فریج میں چلی گئی۔

دروازے پر اج کے آدمی کھڑے تھے۔ لفافہ میں نر بھے کے پیسے پڑے تھے......

"گن لو......"

"گننے کی ضرورنہیں ہے"

"اور...... صاحب نے کہا ہے کل سے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک"...... نر بھے نے دروازہ بند کرنا چاہا۔

آگے والے 'مسٹنڈے' آدمی نے دروازہ چھیک لیا______

"سنئے، دروازہ مت بند کیجئے۔"

"کیوں؟"

"مزدور ساتھ میں ہیں...... صاحب نے فریج واپس منگوایا ہے!۔"

نر بھے حیرت زدہ کھڑے ہیں......

مزدور فریج اُتارنے اور لے جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

○○○

بیٹی

(اپنی بٹیا صحیفہ کے لئے، کہ یہ کہانی بھی اُسی کے
تصور سے پیدا ہوئی تھی)

خوف

بیٹی باپ سے ڈرتی تھی، اس کے برخلاف ماں کو اپنا دوست سمجھتی تھی ـــــــ
ماں بیٹی سے ڈرتی تھی، اس لئے کہ بیٹی دنوں دن تاڑ جتنی لمبی ہوتی جارہی تھی......
باپ کو بیٹی سے بالکل ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس لئے کہ باپ مصروف رہتا تھا ـــــــ اس لئے کہ باپ کا زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کاروباری قسم کے لوگوں کے پاس گزرتا تھا......اور اس لئے کہ بہت تھوڑے سے وقت میں، جو باپ اکثر اپنی بیٹی کے لئے چرا لیا کرتا تھا، اور باپ یہ لمحے اپنی بیٹی کے ساتھ ہی گزارنا پسند کرتا تھا ـــــــ یہ اور بات تھی کہ یہ لمحے سال میں کبھی کبھی ہی باپ کو میسر آتے تھے......

OO

بیٹی کی مٹھیوں میں راتیں دبی ہوتی تھیں......
بیٹی کی مٹھیاں اکثر تنہائی میں کھل جایا کرتی تھیں......اور نیلے آسمان سے اتری راتیں خاموشی سے اس میں سما جایا کرتیں......
پھر یہ راتیں چپکے چپکے اسے چھیڑنے پر آمادہ ہو جاتیں......
سنو......
وہ جیسے نشے میں ڈوبی آنکھیں لئے کسی اور دنیا میں گم ہو جاتی......

نیلے آسمان سے اتری راتوں میں شوخیاں سما جاتیں......
......اب تم ویسے نہیں ہنستی ہو جیسے......
......جیسے؟
ہاں، اب تم ویسے، پہلے کی طرح نہیں رہتی، جیسے......
تم بدل رہی ہو......

سُبک مسکراہٹ، فلک سے عربی نغموں کی سواریاں لے کر آ جاتیں......
تم بہت بدل گئی ہو...... کیا نہیں۔ ذرا اپنے آس کی ہواؤں کو دیکھوں...... باغوں کو____ دریا کو____ دریا میں ہولے ہولے تیرتی کشتیوں کو...... کشتیوں کے کھلے، ہوا میں لہراتے بادبان کو____ پھولوں کو، خوشبو کو...... اپنے اطراف اٹھی ہوئی عمارتوں کو____ اور اپنے اردگرد منڈلاتے بھونروں کو......
'بھونروں کو......' وہ چونک گئی۔

نیلے آسمان میں اترتی راتیں اچانک سہم گئی تھیں____ سب کچھ نیا، ہے نا۔ بالکل تمہاری عمر کے گھوڑے جیسا____ ایرانی گھوڑے جیسا____ شکر کرو کہ ابھی اس بارے میں تمہارے گھر والوں کو پتہ نہیں ہے۔
پھر کیا ہوگا......؟
وہاں ایک سویا، سویا سا ڈر جاگ جائے گا اور......
اور کیا؟
گھر کی آنکھوں نے ابھی تمہارے جسم کی سرگوشیاں نہیں سنی ہیں____ پھر...... پھر وہ اچانک بے چین ہو جائیں گی...... اور تم...... قید کر دی جاؤ گی۔

رات کا سناٹا...... گہرا سناٹا......
بیٹی نے ہولے سے جھولتے ہوئے، جھولے پر سے ایک پھول توڑ لیا۔ پھول بالوں کے گچھے میں لگالیا، اور لہراتی ہوئی کسی خیال میں گم ہوگئی۔

تیزی سے آتے ہوئے باپ نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔
باپ الٹے پاؤں واپس لوٹ گیا تھا____

OO

باپ حیرانی سے آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔
باپ کو اپنا 'زمانہ' یاد تھا...... باپ کو سب کچھ یاد تھا...... لیکن دنیا، اسٹیٹس سمبل، پیسوں کے لئے بھاگ دوڑ میں الجھے باپ کے پاس سے جذباتی آنکھیں، آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی تھیں...... پرانے منظر باپ کی یادوں سے پھسل کر غائب ہونے لگے تھے____ لیکن باپ اس لمحہ، اچانک، بیٹی، جوڑے اور پھول کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔

برسوں پہلے اس منظر کی زد میں کوئی اور تھا۔
سرسراتی ہوا، ہلتے ہوئے پیڑ____ جھولا____ جھولے پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی____ جھولتے جھولتے لڑکی کے ہاتھوں میں ایک پھول آجاتا ہے اور پھول......
باپ نے اس منظر کو وہیں فریز کر لیا۔
باپ پھر اس لڑکی کو گھر لے آیا...... بیوی بنا کر۔
پھر باپ، زمانہ، اسٹیٹس سمبل اور پیسہ کمانے والی مشین کا غلام بن گیا۔ باپ حیران تھا......
تو کیا بیٹی......؟
باپ کو تعجب تھا۔ لیکن ابھی تو...... گیلی گیلی پھلیاؤں، کے منظر تو____ آنکھوں کو ابھی بھی سہانے ہیں____ ننھے ننھے ہاتھ پاؤں۔ توتلی باتوں کی پچکاریاں____ وہ گود میں اٹھالیتا...... بھالو بن جاتا...... اور کبھی گھوڑا...... بیٹی کو جنگل پسند تھا اور جنگل میں رہنے والے۔
لیکن...... باپ کے پاس جنگل میں گھومنے کا وقت ہی کہاں تھا۔

OO

بھالو، گھوڑا...... بیٹی رات رات، سارا سارا دن باپ کا انتظار کرتی____ باپ جب کبھی گھر لوٹتا، مصروفیت کے بوجھ سے کندھے جھکے ہوتے____ پھر بھی وہ تازہ دم بنے رہنے کی

کوشش میں مصروف رہتا۔

بھالو، گھوڑا، جنگل...... باپ اچانک اس جنگل میں لوٹا تھا......اور حیرانیوں کی بارش لے کر وہ بیوی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

'تمہیں پتہ ہے' ہماری بیٹی اب......

ہاں پتہ ہے۔

پتہ ہے؟ باپ چونک گیا تھا۔

''ڈرومت......پچھلے چار برسوں سے......چار برسوں سے اس کا جسم میری آنکھوں کی دوربین میں ہے......غلط مت سمجھو...... میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اسے کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع نہیں دیا ہے۔''

''مطلب؟''

بیوی ہنسی......''مطلب وہ آدھا ہنستی ہے____ آدھا میں نے قبضہ کر رکھا ہے____ وہ آدھا اڑتی ہے____ آدھی اڑان میرے قبضے میں ہے____ اڑان، ہنسی، مسکراہٹ، خواب...... بڑے ہونے اور نافرمانی کرنے کے شک میں____ میں نے ایک آدھا جسم اس کے پاس رہنے دیا ہے____اور آدھا......''

بیوی ہنس رہی تھی۔

بیوی اپنا زمانہ بھول گئی تھی۔

بیوی نے پھر پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ جیسے بیوی کو، اس کا جواب، اس کی دلیل، کسی کی بھی ضرورت نہ ہو......

OO

بیٹی حیران تھی...... جیسے بہت سے پلاش کے پھول اس کی ننھی منی ہتھیلیوں میں سما کر رنگ بن گئے ہوں......رنگ......پھر اس نے آدھے رنگوں کو اپنی ہتھیلیوں سے کھرچ دیا......

تو اس کا مطلب؟

باپ برسوں بعد اپنی بیٹی سے شیئر کر رہا تھا۔

ہاں۔

توتم آدھا ہنستی ہو اور آدھا تمہاری ماں کی تحویل میں ہے۔

ہاں۔

اور تم آدھا اڑان بھرتی ہو۔

ہاں۔

پھر تم مکمل کہاں رہ گئیں...... آدھا آدھا...... بڑے ہونے سے اڑنے تک ـــــــ بچپن سے جوانی اور جسم سے روح تک...... گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک ـــــــ آنکھوں سے مسکراہٹ اور مسکراہٹ سے خواب تک......

ہاں۔

''راتیں...... پُراسرار راتیں...... تمہیں پتہ ہے ـــــــ تم ایک حسین زندگی کا صرف آدھا لطف لے رہی ہو...... ایک بے حد حسین کائنات کے صرف آدھے حصے کو تمہاری آنکھیں چھو رہی ہیں ـــــــ جب کہ......''

باپ افسردہ تھا......

''تم نے پریم کیا ہے......؟''

واپس لوٹنے سے قبل باپ کا جملہ نپا تلا تھا...... پریم آدھا نہیں ہوتا۔ پریم مکمل ہوتا ہے...... اور بیشک تم عمر کے اس حصے میں ہو، جہاں تمہیں پریم کے احساس سے...... یعنی میرا مطلب تو تم سمجھ رہی ہو نا......

بیٹی ایک لمبی چپ لگا گئی تھی......

لیکن بیٹی کو باپ میں پہلی بار ایک دوست نظر آیا تھا۔

OO

باپ کی باتیں اس رات بہت دیر تک بیٹی کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ وہ حیرت زدہ کرنے والی باتیں تھیں...... کسی بھی باپ کے منہ سے پہلی بار اس طرح کی باتیں اس کے کانوں میں گونجی تھیں۔ وہ ان جملوں کا ذائقہ ابھی بھی محسوس کر سکتی تھی......

'تم سن رہی ہو، نا اور تمہیں احساس ہونا چاہئے ـــــــ' باپ کا لہجہ کچھ کچھ برف جیسا سرد تھا۔ یعنی دنیا کہاں جا رہی ہے ـــــــ اور دنیا کہاں تک جا سکتی ہے۔ خوف اور ایٹھریکس

سے الگ بھی ایک راستہ جاتا ہے...... پریم کا راستہ...... ہم ہر برس کے خاتمے کے بعد اپنے لئے ایک اینتھر یکس کا خوف تلاش کر لیتے ہیں ـــــــ ہے نا کتنی عجیب بات ـــــــ اس مہذب دنیا میں اونچی اونچی عمارتوں کے درمیان ہمیں ڈرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے ـــــــ اور تم اپنے آپ کو دیکھو لڑکی...... تمہارا چہرہ کیسے ہو رہا ہے ـــــــ یعنی سچ پوچھو تو کتنی ڈری سہی دکھائی دے رہی ہو تم ـــــــ ؟

'ہاں' میں ڈر گئی ہوں۔

باپ چپ تھے...... باپ نے صرف اتنا پوچھا۔

اپنے آپ سے......؟

ہاں......

اپنی بڑھتی عمر سے؟

ہاں......

باپ کے ہاتھ کھلونوں کی طرح اپنی انگلیوں سے کھیلتے رہے......

'' کیوں ڈر جاتے ہیں ہم۔ اینتھر یکس وہ نہیں ہے جو ہر بار ورلڈ وار کے خطرے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ اور بھی ہے...... باپ کے ہاتھ کھیلتے کھیلتے ٹھہر گئے تھے۔ لیکن نہیں...... بیٹی! سن رہی ہو نا تم۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے...... لیکن کیا کرو گی...... سب ڈر رہے ہیں...... جیسے تمہارا چہرہ دیکھ کر لگتا ہے، تم اپنی ماں سے بھی ڈر رہی ہو گی۔ ماں، جو بیوی بننے تک ایک خوبصورت دنیا میں جیتی ہے اور ماں بنتے ہی ایک Cruel اور ایک کروسیڈر ـــــــ اس کے وجود میں پناہ لینے لگتا ہے......''

باپ نے نظر نہیں ملائی...... صرف اتنا کہا......

'تمہیں اپنی ماں سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ اپنی ماں کو سمجھانا چاہئے'۔

ماں

بیٹی اچانک بڑی ہونے لگی تھی ـــــــ اور اس بڑی ہونے کے خطرے کو ماں نے بھانپ لیا تھا ـــــــ ماں کمانڈوز کی طرح بیٹی کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ کہاں جا رہی ہو تم ـــــــ نہیں۔ فون ہمیشہ نہیں سننا ہے...... اتنی دیر تک کس سے باتیں کر رہی تھی...... ماں کبھی کبھی اسے

شکاری کی طرح گھیر کر بیٹھ جاتی ــــــ ماں ایک فلاسفر کی طرح نان اسٹاپ شروع ہو جاتی ...... اور اپنی ہر گفتگو میں ماں اتنی اوباؤ، اتنی بوجھل باتیں کرتی نظر آتی کہ وہ اندر ہی اندر ایک عجیب سے دکھ کا شکار ہو جاتی۔ اسے، بس یہ الجھن گھیر لیتی کہ ماں اپنا زمانہ بھول گئی ہے یا ــــــ ماں ...... کبھی بیٹی تھی ہی نہیں۔

'دیکھوتو ــــــ بدن پر کتنا گوشت آ گیا ہے۔'

'زیادہ سونا، لڑکیوں کے لئے خطرناک ہوتا ہے ــــــ چربی چڑھ جاتی ہے۔'

'ڈائٹنگ ...... ڈائٹ کنٹرول ...... بوائل ...... سب کچھ بوائل کھانا ہے تمہیں۔'

ماں کی ہر بات پر وہ اندر ہی اندر بوائلڈ ہوتی چلی گئی ...... کبھی ماں ایک چھتنار درخت کی طرح لگتی ــــــ جس کے سایہ میں اس کی زندگی محفوظ ہے۔

لیکن کتنی محفوظ ہے؟

ماں کیا چاہتی ہے، یہ آہستہ آہستہ اس پر منکشف ہو رہا تھا ...... یعنی ماں اسے دنیا کی نظروں سے بچائے رکھنا چاہتی تھی۔ ایک بے حد خاص موقع کے لئے ...... بے حد خاص ...... جیسا کہ اس کی ماں نے سوچ رکھا تھا ...... ایک بڑی تپسیا اور ...... ایک دن اچانک اسی، ان چھوئے پودے کو نمائش گاہ میں رکھ دینا۔

یعنی ماں کے لئے، اس کے بڑے ہونے کا عمل، سب کچھ سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق ہو رہا تھا ...... ماں، اس میں اپنے 'مستقبل' کو تلاش کر سکتی تھی۔ یعنی ایک ایسے برائٹ فیوچر کو، جہاں اس کے ساتھ ماں کی تقدیر بھی کھل سکتی تھی۔

'آہ، تم نہیں جانتی!'

یا پھر ...... آہ، تمہارے لئے میں نے کیا کیا سوچ رکھا ہے، نادان لڑکی ...... ماں کے ان جملوں کا مطلب تھا ...... دیکھتی رہو۔ تمہیں صرف اشارے سمجھنا ہے اور چلنا ہے۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔

ماں نے بہت زیادہ اس کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ ماں اس سے کہیں زیادہ اس کے بارے میں سوچ سکتی تھی ــــــ لیکن بیٹی ــــــ جیسے ہر بار معصوم چڑیا کی طرح اڑتے اڑتے وہ کسی خوفناک گدھ کو دیکھ لیتی ......

ڈائٹ کنٹرول...... لیکن نتیجہ کے طور پر کیا برآمد ہوا تھا...... آنکھوں میں پڑے گہرے حلقوں میں خواب کہیں گم ہو گئے تھے...... کسی مخملی فرش پر کیٹ واک کرنے والے اس کے پاؤں تھرتھرانے لگے تھے...... ماں اسے لے کر انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ اینڈ سروسز گئی تھی۔

ڈاکٹر موٹا برا سامنہ بنا کر بولی تھی۔ 'تم لڑکیاں...... کھانے کو دشمن کیوں بنا لیتی ہو......'
اس نے ماں کو دیکھا۔ ماں نے بیٹی کا ہاتھ دبا دیا۔
'اینوریکسیا۔ وزن میں کمی...... ڈاکٹر موٹا نے برا سامنہ بنایا ـــــ کیلشیم اور فاسفورس کی کمی سے کیا ہوتا ہے ـــــ جانتی ہو...... ہارمون، ڈس بیلنس ہو جاتے ہیں ـــــ اور امینوریا ـــــ سمجھتی ہو نا ـــــ پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے ـــــ عورتیں بانجھ ہو سکتی ہیں۔

○○

'بانجھ ہارمون کا ڈس بیلنس ہونا...... بیٹی دکھ گئی ہے۔ زندگی سے کیلشیم اور فاسفورس تو ماں نے لے لئے ہیں...... وہ سچ مچ ڈس بیلنس ہو گئی ہے ـــــ نہیں...... اس نے توازن کھو دیا ہے...... وہ لڑکھڑا رہی ہے۔ وہ کبھی بھی گر سکتی ہے...... وہ جیسے ایک ٹھونٹھ درخت ہے۔ بانجھ...... امینوریا کی شکار......

''ایک دن جب تم خود کو دیکھو گی تو...... ڈاکٹر تو بولتے ہی رہتے ہیں۔''
اس نے دیکھا۔ ماں کی آنکھوں کی سوکھی پڑی جھیل کو۔ لیکن یہ کیا...... اس جھیل میں کوئی ہے...... کوئی ہے، جو کیٹ واک کر رہا ہے......
کون ہے؟
وہ اس چہرے کو پہچان سکتی ہے۔
ارے، یہ چہرہ تو اس کے خود کا چہرہ ہے ـــــ لیکن یہ چہرہ اتنا مرجھایا ہوا کیوں ہے؟

پہلی بار بیٹی نے اپنا جائزہ لیا تھا۔ اپنے جسم میں وہ کتنی ہے...... اپنی روح میں ـــــ؟ اپنے وجود میں ـــــ؟ اور اپنے آپ میں ـــــ؟

اس نے ماں اور باپ دونوں کو اپنے آپ میں رکھ کر دیکھا ـــــ پھر مطمئن ہوگئی ـــــ باپ کو وقت کہاں تھا اور ماں...... روح سے جسم اور جسم سے وجود تک ماں نے کسی بھی حصے کو ـــــ اس کی اپنی آزادی کے نام نہیں کیا تھا...... آدھا بھی نہیں۔ وہ مکمل ماں کے قبضہ میں تھی۔

اس لئے پہلی بار ـــــ باپ کی باتوں میں اسے ایک دوست نظر آیا تھا۔ دوست، جس کے سہارے وہ اپنی جنگ لڑ سکتی تھی۔

باپ

لیکن شاید بیٹی ابھی بھی مطمئن نہیں تھی۔ یا پھر بانجھ ہونے کا ڈر اس کے اندر کچھ زیادہ ہی بیٹھ گیا تھا...... بانجھ۔ عورت کے لئے سب سے بڑی گالی...... ایک ایسی گالی، کم وبیش بیٹی جس کا سامنا کرنے کو تیار نہیں تھی...... وزن کم کرنے کے لئے وہ امینوریا کی پیشنٹ بننے سے خود کو روکنا چاہتی تھی۔ دراصل بیٹی، باپ کو آزمانا چاہتی تھی۔ شاید اسی لئے کسی ایک مضبوط لمحہ، وہ چپ چپ باپ کی آغوش میں سر چھپا کر بیٹھ گئی۔ باپ آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

''میں کچھ بھی کرسکتی ہوں؟'' ذرا دیر بعد بیٹی کے لب ہلے۔

......'ہاں۔'

......'کچھ بھی؟'

......'تمہیں شک کیوں ہے؟'

'شک نہیں...... ماں کہتی ہے، لڑکی پیدا ہوتے ہی اپنا ایک پنجرہ لے آتی ہے۔'

باپ ہنسا...... 'لیکن تم سے پہلے تمہاری ماں اس پنجرے کو توڑ چکی تھی۔ اس نے لو میرج کی تھی ـــــ'

ماں کہتی ہے 'اس کے باوجود، ہم پنجرے میں رہتے ہیں۔'

باپ نے مزاحیہ انداز اپنایا ـــــ 'پنجرے میں پنچھی بھی نہیں رہتے!'

بیٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ 'تو میں کچھ بھی کرسکتی ہوں۔ اڑ سکتی ہوں۔ باہر جاسکتی ہوں۔ ڈسکو۔ تھیٹر، اور......

باپ نے اسے غور سے دیکھا...... بیٹی کے کندھے تھپتھپائے ــــــ پھر بولا ــــــ
'سنو بیٹی۔ غور سے سنو...... تم پیدا ہوئیں، ہم نے سکھ تلاش کرلیا...... ڈھیر سارا سکھ ــــــ جو تمہارے رونے سے ہنسنے تک ــــــ کلکاری سے سوچنے سمجھنے تک ــــــ بولنے سے شرارت تک ــــــ کھڑے ہونے، گرنے سے انگلیاں تھامنے اور چلنے تک...... یعنی تم نے جو دیا، یا جو تم ہر لمحہ دیتی رہی ہو، کسی خزانہ سے بھی زیادہ تھا...... ہم تول مول نہیں کر سکتے تھے ــــــ باپ کو تول مول کرنا بھی نہیں چاہئے ــــــ کہ اس زندگی میں بچہ اپنے وجود کے احساس تک جو سکھ دیتا ہے ــــــ وہ امید کے خزانے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، ہے نا؟

باپ کو شاید اپنے باپ کی کہانی یاد آگئی تھی۔ یکلخت وہ ٹھہر گیا تھا۔ بیٹی کے ہونٹوں پر معصوم مسکراہٹ تھی۔

'اس لئے بیٹی'...... باپ نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ 'اس لئے جب تم اپنی جوانی کی زندگی شروع کرنے جارہی ہو۔ سمجھ رہی ہونا۔ اپنی اب کی زندگی...... تو اس زندگی پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے۔ اپنے حصے کا سکھ ہم لے چکے ہیں اور اس کے بعد کے سکھ پر......'

'تو پنجرہ......؟'

باپ لڑکی کے بڑا ہونے کے احساس سے دکھ گیا تھا۔

'پنجرہ کوئی بھی اپنے ساتھ نہیں لایا تھا ــــــ اور سنو بیٹی۔ اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ اپنے حصے کے خواب، خوشیاں ــــــ عمر ــــــ رونا، ہنسنا ــــــ سب کچھ اپنی ممی سے واپس مانگ سکتی ہو ــــــ اور بے شک تمہاری ممی کو تمہیں یہ سب واپس کر دینا چاہئے۔'

اس کے بعد باپ ٹھہرے نہیں۔ باپ کو آنکھوں میں امڈ آئے قطرے دکھانا گوارہ نہیں تھا۔ باپ واپس لوٹ گئے تھے۔

حسین شامیں

پھر بیٹی نے اڑنا شروع کیا۔
بیٹی کو اب ماں کے پنجرے پر یقین نہیں تھا۔
بیٹی کو اب کسی بھی ایسے پنجرے پر یقین نہیں تھا ــــــ
بیٹی کو صرف اور صرف اڑنے پر یقین تھا ــــــ

پہلی بار جب وہ رات کو دیر تک ڈسکو تھے کلب سے گھر لوٹی تو ماں اس کے کمرے کے دروازے پر آ کر کھڑی ہوگئی ــــــ ماں کے ہاتھوں میں ایک ٹوٹا ہوا پنجرہ تھا۔

'آہ! تمہارے باپ جیت گئے۔'

'اور اسی لئے تم نے پنجرہ توڑ دیا۔'

'ہاں...... اس پنجرے میں ایک Sea-gull تھا۔ اس، ہی گل کی کہانی سنوگی۔'

'مجھے کہانیاں اچھی نہیں لگتیں۔'

ماں مطمئن تھی...... 'کوئی بات نہیں۔ تم نے اپنے لئے راتیں چُنیں ــــــ اور رات سے انٹرنیٹ اور ڈسکو تھیے بنالیا ــــــ ہے نا۔ پھر بھی تمہیں یہ کہانی سننی ہوگی۔

اس نے نائیٹی پہن لی۔

ماں کی کہانی جاری تھی۔ بے چارہ ننھا سا سی گل ــــــ شام میں جب دوسرے پرندوں کے پر، اڑان سے خالی ہو جاتے تو وہ اپنی اڑان شروع کرتا ــــــ پاگل کہیں کا ــــــ تھوڑی تھوڑی اڑان اور ایک دن......

'تم یہ کہانی پہلے بھی سنا چکی ہو ماں۔'

ماں نے پہلے دھیان نہیں دیا...... ایک دن جوناتھن، یہی اس سی گل کا نام تھا ــــــ وہ اُڑا اور اپنے ننھے پروں سے آسمان ناپ لیا...... اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی ــــــ اتنی اڑان تو اس کے پروجوں میں سے بھی کسی نے آج تک نہیں بھری تھی...... اسے یقین تھا۔ وہ واپس لوٹے گا اور اس کی تاجپوشی ہوگی۔ سر آنکھوں پر بیٹھایا جائے گا۔ انعام سے نوازا جائے گا۔

'پور فیلو' بیٹی آہستہ سے بولی۔

ماں کی آنکھیں بند تھیں...... ''لیکن اس غریب کو کیا معلوم تھا، دھرتی پر واپس لوٹتے ہی، ضرورت سے زیادہ اڑنے کے جرم میں اسے......''

ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

بیٹی نے سر پر چادر کھینچنے سے پہلے کہا ــــــ 'جو اڑتے ہیں، وہ کسی بھی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔'

○○

انٹرنیٹ پر Chatting سے برآمد لڑکے نے ڈسکو تھے میں، اچانک اس کے سامنے آکر حیرت زدہ کردیا تھا۔

پھر بیٹی کی شاموں میں ٹوئٹرس کی لاطینی حسین شامیں لکھ دی گئیں...... پہلی بار وہ اداس تھی۔

لڑکا زور سے چیخا تھا......'Cry'

وہ پھر ذرا سا ہنسا______ 'چیخو، چلاؤ، ناچو۔ بھول جاؤ کہ عمر کے گھوڑے کی رفتار کیا ہے۔ آگے کیا ہے اور پیچھے کیا ہے۔'

'بھول گئی۔'

وہ دیر تک نائٹ اسپاٹ پر تھرکتے رہے۔ لانج میں کچھ دیر 'ڈام موریس' کی پوئٹری کا لطف لیا______ پھر کچھ دیر تک ٹوئٹرس کی آرٹ گیلری میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے رہے۔ بیٹی خاموشی سے کمرے کی پیلی چھتوں، نیلی دیواروں اور پینٹنگس کی آڑی ترچھی لکیروں کو گھورتی رہی۔ واپس آکر نائٹ اسپاٹ پر دونوں نے ایک ایک پیگ اور لیا۔ ریستوراں کی ڈم لائٹ میں 'چلڈ' یعنی ہر طرح کے پروگرام چل رہے تھے...... بیٹی نے اپنے جسم کو پورا پورا لڑکے کے بدن پر ڈال رکھا تھا۔ اطالوی کھانے سے فارغ ہو کر دونوں نے ایک دوسرے کو ریستوراں کی ڈم روشنی میں، چلنے والے چلڈ پروگرام کے حوالے کردیا۔

OO

رات گہری ہوگئی تھی۔ بیٹی ابھی تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ ماں نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔

......'دنیا بدل رہی ہے۔'

'دنیا ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے۔'

......'ہمارے زمانے کی دنیا اور تھی؟'

اس زمانے کی دنیا بھی وہی ہے۔'

......'کیا ہم اس طرح رات گئے......؟'

پہلے ہمارے شہر نے اس طرح رات پر قبضہ نہیں کیا تھا۔'

ماں گھبراہٹ میں ٹہل رہی تھی۔'

باپ مطمئن تھا۔ وہ اپنی فکر میں ڈوبا تھا۔ یعنی اس عمر میں...... اس عمر میں جب کہ اس کی بیوی کو، کوئی بھی ٹینشن نہیں لینا چاہئے...... 'وہ آہستہ سے مسکرایا۔

'بیٹی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔'

'کیوں؟'

کیوں کہ اب اس کی آزادی کا دور شروع ہو گیا۔'

'آزادی؟'

'ہاں، ایک عمر آتی ہے، جب ہمیں ایک دوسرے کو ازسرنو سمجھنا ہوتا ہے۔ ازسرنو ـــــ سمجھ رہی ہونا...... یہ وہ وقت ہوتا ہے، جب بچے اپنی عمر کے رتھ پر سوار ہو جاتے ہیں...... بیٹھو......'

باپ نے اسے اپنے بانہوں کے حصار میں لیا...... اب ہماری اپنی ایک نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ بیٹی کی اپنی...... اس عمر کو سمجھنا بڑا کام ہے۔ نہیں سمجھو گی تو بوڑھی ہو جاؤ گی۔'

ماں ڈر گئی تھی......

باپ ہنسے......''بچوں کی آزادی میں اپنا حصہ نہیں ہوتا ـــــ ان کی عمر کا حصہ ہوتا ہے...... بیٹی اپنی آزادی سے بندھی ہے۔ وہ سنبھلتی ہے یا گرتی ہے، یہ اس کا کام ہے۔ ہم نہیں سنبھلے تو؟ یا بچے اور اپنے بیچ ایک دیوار نہیں اٹھائی تو...... ہم اچانک بوڑھے ہو جائیں گے۔''

لیکن...... وہ بیٹی ہے......

'ہمارا کام ختم...... باپ کا لہجہ سخت تھا...... 'جتنی خوشیاں، جتنے سکھ اس سے حاصل کرنے تھے، کر چکے۔'

'اور اب اسے گرنے کے لئے......'

باپ مطمئن تھا...... 'یہ اس کی سمجھ داری پر منحصر ہے' باپ نے پھر موضوع بدل دیا تھا......

'کل سے میں نے دفتر کا کام کم کر دیا ہے۔ جلدی گھر آجایا کروں گا۔ صبح کی چائے ختم۔ ناشتے میں......'

ماں اب کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

کھلے دروازے سے بیٹی اندر آ گئی تھی۔
بیٹی کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔
بیٹی کی آنکھیں......
بیٹی کے پاؤں......
بیٹی کا جسم......
باپ نے ماں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا...... "سو جاؤ۔ اس نے اپنی آزادی خرید لی ہے۔"

ماں نے سہمے ہوئے میمنے کی طرح خود کو باپ کے حوالہ کر دیا۔

خاتمہ

قارئین!

کہانی ختم ہو چکی ہے۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں۔ کہانی کو یہیں پر ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ ایسی کہانیوں کا کوئی خوشگوار انجام نہیں ہوتا ہے۔ ایسی کہانیاں ہر تبدیلی اور تاریخ کے جبر کے ساتھ پیدا ہوتی رہتی ہیں...... زندگی نے اپنا دامن وسیع کیا تو لڑکیوں کے لئے سوچ اور فکر کے نئے دروازے بھی کھل گئے...... یعنی تاریخ کے اس مقام پر جہاں لڑکیاں آزادانہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہیں، ایسی کہانیوں کا انجام یہی ہونا چاہئے کہ......

- لڑکی نے اپنی ایک آزاد زندگی کا انتخاب کر لیا۔
- لڑکی پھسلتی چلی گئی اور بالآخر اس کی زندگی کا انت ہو گیا...... یا
- لڑکا اسے چھوڑ گیا اور لڑکی نے آتم ہتیا کر لی۔

قارئین!

ایسا کچھ بھی اس کہانی کے ساتھ نہیں ہے۔ اس لئے ـــــ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ـــــ تاریخ کے اس موڑ پر...... اس بے حد اہم موڑ پر...... بیٹی اچانک چونکتی ہے۔ جیسے کسی ڈراؤنے خواب سے جاگتی ہے اور کئی دن گھر سے غائب رہنے، بدن کے جبر کو سمجھنے کے بعد ـــــ ایک اندھیری صبح...... جس وقت سڑک پر اِکا دُکا سواریاں بھی نہیں چل رہی تھیں ـــــ وہ اپنے گھر کے دروازے پر آ پہنچتی ہے۔ اور...... بیل پر انگلی رکھتی ہے۔

تو قارئین یہ اس کہانی کا انت ہے...... اور اس انت کے لئے میں اپنے آپ کو کتنا مجبور محسوس کر رہا ہوں، یہ میں جانتا ہوں۔

○○

بیٹی کی آنکھیں نیم غنودگی میں ڈوبی تھیں۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ باہر کہرا چھایا ہوا تھا۔ اس کا بدن ابھی بھی اطالوی جن کے دھویں سے بھرا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ بیل بجانے والے ہاتھ سردی سے ٹھٹھر گئے تھے۔ اسے غصہ آرہا تھا۔ سب کہاں مر گئے۔ بیل کی آواز سن کر کھولنے کے لئے کوئی آتا کیوں نہیں......

اس نے قدموں کی آہٹ سنی......

'آزادی......' اسے باپ کے لفظ اب بھی یاد تھے۔ اپنے حصے کا سکھ ہم لے چکے ہیں اور اس کے بعد کے سکھ پر......'

وہ باپ سے لڑائی کرنے آئی تھی...... نائٹ اسٹاپ کی رنگینیاں اچانک تھم گئی تھیں۔ ڈسکوتھیے کے Cry,Cry نغموں نے اسے لہولہان کر دیا تھا۔ Chatting سے برآمد لڑکے نے اس کے بدن پر ہزاروں خونی لکیریں کھینچ دیں ـــــــ اور ایک نیپالی لڑکی کے ساتھ کسی دوسرے ٹوئٹرس کے چلڈ پروگرام میں کھو گیا تھا......

بیٹی نیند سے جاگی تو ماں کا پنجرہ ٹوٹا ہوا اس کے بازو میں پڑا تھا...... وہ چیخنا چاہتی تھی...... وہ لڑنا چاہتی تھی۔ پیسے ختم ہو گئے تھے......

وہ کئی دنوں سے گھر سے غائب تھی۔

اسے امید تھی۔ گھر پہنچتے ہی، جذباتی پاگل پن کے مظاہرے شروع ہو جائیں گے۔ شاید باپ نے پولیس میں ایف آئی آر بھی درج کی ہو ـــــــ ماں کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی ہوں اور......

ایک بے حد سرد صبح، کہرے میں ڈوبی ہوئی صبح...... وہ گھر پہنچے گی اور......

'کیلشیم فاسفورس...... ماں بولے گی...... وہ اسے ایک بے حد خاص موقع کے لئے تیار کر رہی تھی......

باپ کہیں گے...... تم کہاں چلی گئی تھیں بیٹی۔

اور ماں...... وہ اس جذباتی لمحے کی منتظر ہوگی، جب وہ اس کے بازوؤں میں گم ہو جائے گی......

○○

کوئی آ رہا ہے...... قدموں کی آہٹ...... بیٹی کا جسم سردی سے تھرتھرا رہا ہے۔ دروازہ کھولنے کی آواز...... باپ نے لائٹ آن کر دیا ہے۔ دروازہ کھولنے والی ماں ہے۔ لیکن......

وہ اچانک ٹھٹھک گئی ہے______

کیا یہ ماں ہے۔ سچ مچ ماں ہے۔ ماں ہے تو ماں جیسی کیوں نہیں لگ رہی۔ ماں اپنی عمر سے کتنی چھوٹی ہو گئی ہے۔ چھوئی موئی سی۔ اس کے چہرے پر، بیٹی کو لے کر مستقبل کے اندیشے یا فکر کی جھریاں نہیں ہیں______ یہ کوئی اور ہی ماں ہے______ تروتازہ______ ابھی ابھی جوان ہوئی اور لباس تو دیکھو...... ریشمی ساڑی۔ چہرے پر اتنا نکھار......

پیچھے باپ کھڑے تھے...... ہمیشہ کی طرح اسمارٹ...... اس وقت کچھ زیادہ ہی جوان......

ماں کی آنکھوں میں حیرانی اُمڈتی ہے......

'کون؟'

باپ کی آواز میں نشہ سا ہے......

'کون؟'

" 4/ اسکیم پار لے______ ماؤنٹ روڈ سے ذرا آگے______ تھرڈ لین۔ مسٹر آئی جے کے...... ریسیڈینس نمبر......' کہتے کہتے وہ ٹھہر گئی ہے۔ "ایک زمانہ میں یہاں ان کی بیٹی رہتی تھی۔"

ماں نے پیار سے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا______

'آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے...... اب وہ یہاں نہیں رہتیں......'

بیٹی نے انجانے راستوں پر ٹھٹھرتی ہوئی کہرے کی اس صبح، اپنے قدموں کو ڈالتے ہوئے ماں کا جملہ پورا کیا......

'کیوں کہ اس نے اپنی آزادی خرید لی ہے۔ اب وہ کہیں اور رہتی ہے۔'

○○○

بھورے بالوں والی لڑکی

کچھ ملاقاتوں کا ذکر

لمحہ جیسے ٹھہر گیا تھا ــــــ میری آنکھیں دور تک اسے تلاش کرتی رہیں ــــــ لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ ایسا ممکن نہیں تھا۔ ایسا ممکن اس لئے بھی نہیں تھا کہ وہ ان عام لڑکیوں جیسی نہیں تھی، جو وعدہ کر کے بھول جاتی ہیں۔ اسے اب تک آجانا چاہئے تھا۔ میں نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ پارک کی بنچیں سنسان پڑی تھیں...... ہوا کا ایک تیز جھونکا مجھے چھوتا ہوا چپ چاپ گزر گیا۔ میں خاموشی سے اس بنچ پر آکر بیٹھ گیا، جہاں اس سے قبل بھی کئی بار وہ مجھ سے ملی تھی اور ہر بار میری حیرتوں میں خوشگوار اضافہ ہوا تھا...... لڑکیاں کیا ایسی بھی ہوتی ہیں ــــــ!

نہیں، وہ عام سی لڑکی نہیں تھی۔ بھورے بالوں والی...... بھورے بالوں والی لڑکی...... شاید، اسی لئے چھوٹی چھوٹی چند ملاقاتوں کے باوجود مجھے اس کا نام پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی...... بس چہرے پر بے نیازی سے دور دور تک پھیلے ہوئے بھورے بھورے بال...... آنکھوں میں خرگوش جیسی معصومیت...... وہ ہنستی بہت کم تھی۔ ہونٹوں پر سوالات بہت ہوتے تھے۔ کچھ سوالات تو ایسے ہوتے تھے کہ میں جیسے سوالوں کے ان بھنور میں الجھ کر رہ جاتا تھا......

نہیں، یہ بتانا ضروری ہے کہ پہلی بار ہم کہاں ملے تھے...... وہاں...... نہیں، شاید اب وہاں اس کی موجودگی کے تصور سے ہی مجھے ہول آتا ہے۔ اسے وہاں نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ ایک عجیب سا ماحول تھا۔ پارٹی...... ہم اسے ٹھیک طرح سے پارٹی بھی نہیں کہہ سکتے...... شاید یہ تمام بڑے شہروں کا مزاج رہا ہے ــــــ تھکن اور اداسی مٹانے کے لئے زندگی، فحاشی کی نئی نئی موجوں سے اپنا تعلق قائم کر لیتی ہے...... شب سیہ کے نشہ میں ڈوبے ہوئے گھوڑے نے آہستہ

آہستہ ہنہنانا شروع کر دیا تھا۔ میرے لئے جیسے سب کچھ نیا تھا۔ کھلی کھلی لمبی چکنی ٹانگیں ــــــ مینی کیور سے سنورے ہوئے ہاتھ ــــــ کالج کے کچھ نوجوان لڑکوں نے لڑکیوں جیسے لباس پہن رکھے تھے۔

دوست نے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا۔ ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مت دیکھو۔ لوگ تمہیں اَن کلچرڈ سمجھیں گے۔ وہ دھیرے دھیرے سمجھا رہا تھا ــــــ ماچو مین کا زمانہ جا چکا ہے۔ ٹائٹینک کے ہیرو، لیونارڈو ڈی کیپریو سے بھی لوگ بور ہو چکے ہیں...... دیکھو...... دیکھو...... عورتیں مرد بننا چاہتی ہیں۔ مرد عورت...... وہ دکھا رہا تھا۔ دیکھو...... وہ عورت جو تمہیں نظر آ رہی ہے نا، وہ میک اَپ آرٹسٹ ہے۔ کارل سک ویرا۔

یعنی؟ ــــــ میں ایک دم سے چونک پڑا۔

دوست دھیرے سے ہنسا...... وہ مرد ہے۔ ہماری تمہاری طرح...... مرد۔ اس بار مرد کہتے ہوئے، اس کا لہجہ ذرا سا بھاری تھا۔ اس نے جو کچھ دکھایا، وہ شاید اب میں ٹھیک سے نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ دو ایک اسکرٹ پہنے ہوئے مرد ــــــ ان کے کپڑے شوخ رنگ کے تھے۔ آنکھوں میں رنگین لینس، ناخنوں میں نیل پالش لگی ہوئی۔ وہ بتا رہا تھا...... ان میں زیادہ تر مرد بلیچنگ، فیشیل، ویکسنگ اور بالوں کو رنگوانا پسند کرتے ہیں۔ دوست کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ 'حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کے مقابلے مرد اسکرٹ میں زیادہ خوبصورت لگتے ہیں۔'

اب میں کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اب میں کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ مگر وہ بھورے بالوں والی لڑکی...... وہ بے نیازی سے ایک تنہا گوشہ میں چپ چاپ، میری طرح یہ سارا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ ظاہر تھا، ایسے ماحول میں اسے بھی کوئی میری طرح پہلی بار لے کر آ گیا تھا...... اس کی خرگوش جیسی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

باتیں شروع کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی...... لیکن اس کے پہلے ہی جملے نے مجھے چونکا دیا تھا۔

'ہاں، میں یہاں آتی رہتی ہوں۔ ہمیشہ...... مجھے اچھا لگتا ہے۔ اور تمہیں؟'

'پتہ نہیں۔'

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اس میں برا کیا ہے۔ ایک مدت تک عورت مرد کی غلام بن کر رہی۔

نہیں؟ پتی ورتا؟ وہ ہنس رہی تھی۔ اب 'کارل سک ویرا' کو ہی دیکھو۔ کہہ سکتے ہو کہ یہ وہی مرد ہے جو کل تک عورتوں پر ظلم کیا کرتا تھا......

وہ قریب قریب میرے بدن پر باتیں کرتے ہوئے بے نیازی سے جھک گئی تھی۔ اس نے شفان کی قمیض پہن رکھی تھی۔ میں اس کے بدن کے ہر راگ سے واقف ہو رہا تھا۔ میری سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔

وہ اچانک چونک اٹھی......

کیا ہوا؟

کچھ نہیں......

لیکن شاید جو کچھ ہوا، وہ سمجھ چکی تھی۔ بھورے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔

''یہ عورت کا بدن چھوتے ہی تم مردوں کے بدن میں کرنٹ سا کیوں لگ جاتا ہے۔ مجھے دیکھو......اور اپنا چہرہ دیکھو۔ تم......تم کانپ رہے ہو۔ کانپ اس لئے رہے ہو کہ ایک لڑکی تم سے چھو گئی تھی۔ ہے نا......''

'شاید......' میں ہڑبڑا گیا تھا۔

'مان لو۔ میری جگہ کوئی تمہارا مرد دوست ہوتا۔ وہ بھی میری طرح باتیں کرتے ہوئے تم پر بے اختیاری میں جھک جاتا۔ تب بھی کیا تم ایسے ہی......؟'

'نہیں......'

'پھر۔ مجھ میں کیا خاص بات ہے؟ وہ غصہ ہو رہی تھی۔ یہ مردوں میں بار بار ایک انجان مرد چور بن کر کیوں آ جاتا ہے؟'

'یہ قدرتی ہے۔' میں نے سہمے ہوئے انداز میں کہنا چاہا۔

'نہیں' اس نے اپنا سیدھا فیصلہ سنا دیا......'ترقی کرتے ہوئے قدرت سے ہم نے ناطہ توڑ لیا ہے۔ قدرتی اب کچھ بھی نہیں ہے۔ سب کچھ Against nature چل رہا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا۔ Against nature ____ لیکن تم سے باتیں کرتے ہوئے مزہ آ رہا ہے۔' اس کی خرگوش جیسی آنکھوں میں چمک تھی۔

'مجھ سے ملو گے؟'

'کیوں نہیں۔' مجھے وہ بھورے بالوں والی لڑکی اچھی لگ رہی تھی۔ میں اب آہستہ آہستہ اس سے کھلنے لگا تھا۔ میں نے دھیرے سے کہا۔

'کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔'

'اس کی خرگوش جیسی آنکھوں کی چمک اچانک ماند پڑ گئی...... 'کیوں؟ کیا جاننا چاہتے ہو تو؟ تم مردوں میں اتنے سارے سوال و جواب کیوں چھپے ہوتے ہیں۔ نام کیا ہے؟ کہاں رہتی ہو؟ شادی ہوئی کہ نہیں...... ان باتوں کو جانے بغیر بھی تو دوستی ہو سکتی ہے۔ مجھ سے دوستی کرو گے......؟'

اس کی ہتھیلیاں چپ چپی اور گرم تھیں۔ رات کا رقص جاری تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے پارک والی جگہ کے بارے میں بتایا...... 'بس وہیں مجھے تلاش کر سکتے ہو۔ مل گئی تو مل گئی۔ نہیں تو۔ کوئی بات ہیں......'

گفتگو کے آخری موڑ پر، اسے لڑکیوں کا ڈریس پہننے والا وہ میک اَپ مین اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تھا۔

OO

دوسرے دن شام میں وہ مجھے پارک میں مل گئی۔ اسے تلاش کرنے میں مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ وہ ایک خالی بنچ پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جینس اور شرٹ پہنے۔ چہرے پر کسی طرح کا کوئی میک اَپ نہیں...... بھورے بال تیز ہوا میں لہرا رہے تھے۔

'مجھے یقین تھا......' اس کا لہجہ سرد تھا۔ 'تمہیں آنا چاہئے اور تم ضرور آؤ گے۔'

'کیا یہ Against nature ہے؟'

'نہیں۔' وہ دھیرے سے مسکرائی...... 'پہلی بار قدرت کا جادو مجھ پر چلا ہے۔ دیکھو۔ میں نے تمہارا انتظار بھی کیا۔ میری آنکھوں نے جگہ جگہ یہاں تمہارا پیچھا بھی کیا اور تم آ گئے۔ یہ بھی قدرت کا نظام ہے۔'

وہ ہنس رہی تھی...... 'کوئی ہوتا ہے یار، جس سے میرے جیسا ڈل آدمی بھی شیئر کرنا چاہتا ہے ——— تم نے کل پارٹی میں پوچھا تھا نا، کچھ اپنے بارے میں؟ کیا بتاؤں......

وہ ہنس رہی تھی...... چلتے چلتے، دوڑتے دوڑتے مشین بن گئے ہم......

'' آنکھیں کھلیں تو محبتیں رخصت ہو چکی تھیں۔ ایک گھر تھا جہاں، شوکیس میں سجے

ساما نوں کی طرح ممی اور ڈیڈی بھی تھے ـــــــ اور ایک روٹین لائف والا جانور تھا...... بس اتنا جان رہی تھی کہ دنیا کے پر لگ رہے ہیں۔ دنیا اڑ رہی تھی۔ پاپا ممی اڑ رہے تھے۔ میرے لئے سب کچھ ایک تماشہ تھا۔ پھر میں اس تماشہ کو ادھورا چھوڑ کر، اس جیل سے کب نکل آئی، پتہ بھی نہ چلا......''

وہ پھر ہنسی......'اور کیا جاننا چاہتے ہو؟'

'نہیں۔ کچھ نہیں......' مجھے صدمہ ہوا۔

'تمہارا چہرہ اچانک اتنا پیلا کیوں پڑ گیا۔' اس نے قہقہہ لگایا۔ یہ نہیں پوچھو گے، میں کس کے ساتھ رہتی ہوں......

اس کی خرگوش جیسی آنکھوں کی چمک بجھ گئی تھی۔ چہرے پر سختی آ گئی تھی ـــــــ یاد ہے، کل میرے چھوتے ہی تمہارے بدن میں ایک چور مرد آ گیا تھا۔ ہاں، اور تم نے کہا تھا، یہ قدرتی ہے...... کل ساری رات میں تمہارے اس لفظ پر غور کرتی رہی...... Against nature۔ زندگی سے سارے ایڈونیچر ختم ہو جائیں تو ہم اپنا سفر اگینسٹ نیچر شروع کر دیتے ہیں۔ میرے ساتھ بس یہی ہوتا رہا۔ ممی ڈیڈی کی جیل سے نکلنے کے بعد ایک نئی زندگی سامنے تھی۔

بھورے بالوں والی لڑکی کہتے کہتے ٹھہری۔ تم نے اس آدمی کو دیکھا تھا۔ وہ جو پارٹی میں مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا......

'جس نے اپنے بال رنگوائے ہوئے تھے۔ آئی مین کارل سک ویرا۔'

ہاں...... وہ ہنس رہی تھی۔ 'پتہ ہے، وہ رات میں میری برا اور انڈر ویئر پہن لیتا ہے۔ لیکن وہ کوئی دماغی مریض نہیں ہے...... ٹرانس ویسٹی ٹیز...... ایسے لوگوں کو لپ اسٹک اچھی لگتی ہے اور یہ آرٹی فیشیل بریسٹ لگا کر خوش ہو اٹھتے ہیں۔ دراصل یہ ٹرانس سیکسول مرد ہیں۔ ان کا جسم تو مرد کا ہے لیکن آتما عورت کی ہے......'

بھورے بالوں والی لڑکی نے سر جھکا لیا تھا۔

اب چونکنے کی باری میری تھی۔ میں زور سے اچھلا...... 'لیکن تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟'

'کارل میرا ہاسبینڈ ہے۔'

وہ نظریں چرانے کی کوشش کر رہی تھی...... یہاں سب کچھ Artificial تھا۔ سب کچھ نقلی۔ اپنے اپنے بوجھ سے تھکے ہوئے لوگ...... وہسکی کے گلاسوں میں اپنا اندر باہر بھول جانے

والے۔ایک نقلی دن۔ایک نقلی رات......ایک نقلی زندگی......

میرا لہجہ بوجھل تھا......'کیا یہ ترقی ہے؟'

'نہیں'اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا......اڑتے اڑتے پر ٹوٹ جاتے ہیں۔پھر اچانک ہی ہم اپنے آپ سے Out-cast کر دئے جاتے ہیں۔ہم سب وہ ہیں، جنہیں خود ہم نے آؤٹ کاسٹ کر دیا ہے۔'

وہ بینچ سے اچانک اٹھ کھڑی ہوئی تھی......اس کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا......'آگے ملوگے؟'

'کیوں نہیں؟'

'اتنا سب کچھ جاننے کے بعد بھی ملوگے؟'

'اس شہر میں سب ہی اپنے آپ کو آؤٹ کاسٹ کرتے رہتے ہیں——فرق یہ ہے کہ سب کی سطحیں الگ الگ ہیں۔'

'گڈ۔تم ملو نا ملو۔لیکن میں تم سے ملتی رہوں گی۔'

○○

چھوٹے چھوٹے شہروں کی زیادہ تر کہانیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔چھوٹی چھوٹی خواہشیں، چھوٹا چھوٹا آسمان......ایک چھوٹا سا گھر اور بہت سارا اڑنے کی خواہش۔چھوٹے سے گھر سے، اڑنے کی یہ خواہش ہی مجھے اس شہر میں لے کر آئی تھی۔لیکن کچھ لمحے کے لئے میں جیسے اڑنا بھول گیا تھا۔اس رات میں اپنے کرائے کے چھوٹے سے کمرے میں لگے آڑے ترچھے آئینہ میں دیر تک اپنے عکس کو نہارتا رہا۔

......کیا میں اڑنا چاہتا ہوں۔

......نہیں۔

......کیا میں اڑ رہا ہوں۔

......نہیں۔

سچ یہ ہے کہ میں آئینہ کے سامنے قلابازیاں کھاتا ہوا، عجیب عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔اچانک آئینہ میں وہ بھورے بالوں والی لڑکی آ گئی تھی۔لڑکی زور سے چیخی تھی......

'سنو، اتنا تیز نہیں اڑو......سنا نہیں۔گر جاؤ گے۔'

○○

دوسرے دن شام میں وہ بھورے بالوں والی لڑکی پھر وہیں بینچ پر بیٹھی ہوئی ملی۔
'آفس سے نکل کر میں سیدھے یہیں آجاتی ہوں۔' وہ مسکرائی۔
میں نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ آج اس نے پینٹ اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا......
'تم لوگ اپنے کپڑے کیوں نہیں بدل لیتے۔ میرا مطلب، تم ہی نے کہا تھا، کارل عورتوں والے لباس پہنتا ہے اور تم......'
اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ 'لباس بدل لینے سے آتمائیں بدل جائیں گی کیا؟
'آتمائیں؟'
'ہاں۔ اس کے اندر ایک عورت آگئی ہے۔ ہاں، اس نے اپنے بدن پر گودنے گدوائے ہیں۔ کانوں میں چھلّے بھی پہننے لگا ہے۔'
'اور تم؟'
وہ بجھ گئی تھی...... شاید، شاید مجھے دیر ہوگئی...... وہ ہنس رہی تھی۔ میں اب نیچر سے دوستی کر رہی ہوں...... مجھے آسمان اچھا لگنے لگا ہے...... چاند، چاندنی راتیں، بچپن میں پڑھی ہوئی فیری ٹیلس اور...... یہ پیڑ پودے......'
'کہیں تم نے کارل کو چھوڑنے کا فیصلہ تو نہیں کرلیا؟'
اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا...... 'تم نے ایسا کیوں سوچا......' وہ ایک بار پھر ہنسی......
'عورت مرد کے رشتے کو ہی اگر زندگی کہتے ہیں تو سنو، رات میں کارل بستر پر ایک عورت بن جاتا ہے اور میں مرد......'
میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پہلی بار وہ اپنے آپ کو چھپا نہیں پائی۔ وہ رو رہی تھی...... ذرا ٹھہر کر اس نے اپنے آنسوؤں کو خشک کیا۔
کل ملوگے...... کل میں پھر آؤں گی۔ کسی فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔
وہ اچانک اٹھی۔ اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

میری ڈائری کے کچھ پنّے

(جو میں نے کارل سک ویرا اور اس بھوری لڑکی کے بارے میں لکھے)

4-1-2001

شاید یہ سب کچھ میرے لئے نیا تھا۔شاید یہ سب کچھ میرے لئے نیا نہیں تھا۔دنیا تیزی سے بدلی ہے، مجھے اس کا خیال تھا۔دنیا اس سے بھی زیادہ تیزی سے بدلے گی، میں سوچ سکتا ہوں۔کلوننگ، انٹرنیٹ اور جینوم سے آگے نکل کر ـــــ ممکن ہے مرد اور عورت اپنی نئی نئی تعریفیں بھی ڈھونڈنے لگیں تو مجھے حیرت نہیں ہوگی۔حیرت مجھے کارل سک ویرا کی تبدیلی پر بھی نہیں ہوئی۔ٹھہریے۔مجھے اس کا چہرہ یاد ہے۔فیشمیل نے اس کے چہرے کو اور حسین بنا دیا تھا۔مردوں کو لبھانے والی اس کی حسین ادائیں......ایسا کیوں کر ہوا ہوگا؟سوچ کی سطح پر لگتا ہے، یہ کوئی بہت پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔دراصل، تہذیب اور قدروں کی نہ ختم ہونے والی سرنگ میں، اپنے آپ کو چھپائے رکھنے کا اخلاقی دباؤ ہم پر کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا......صدیوں کی مسافت کے بعد اس اندھیری سرنگ سے باہر نکلنے کا راستہ ملا تو ہم بہت تیزی سے نئی ہواؤں کا شکار ہو گئے اور ویسے دکھنے لگے، جیسا کہ ہم ہمیشہ سے تھے......

(دن) 5-1-2001

کارل سک ویرا......ایسے آدمی کا تجزیہ کرنا میرے لئے کوئی بہت مشکل کام نہیں تھا۔جسم ایک درخت ہے اور یہ درخت جب یکسانیت کے پت جھڑ کا شکار ہوتا ہے تو جسم کا الٹا پہاڑا شروع ہو جاتا ہے ـــــ جیسے عورت مرد بننے کے لئے پہلے سے ہی تیار رہتی ہے اور مرد عورت بننے کے لئے......(کچھ سطریں کٹی ہوئی) 'بچپن میں' میں نے ایک دوپہر ایک مرغی پکڑی تھی۔میں مرغی میں عورت جیسے 'سینہ' کو تلاش کر رہا تھا......کیا یہ مرد میں ایک عورت کی موجودگی تھی؟

(رات) 5-1-2001

آج وہی دوست مجھ سے ملنے آیا تھا، جس نے پہلی بار اس پارٹی سے مجھے متعارف کرایا تھا......وہ دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔پھر بولا......

'تم آج کل کچھ زیادہ ہی اس سے ملنے لگے ہو؟'

'کون؟'

'وہی مسز سک ویرا۔'

'مسز......سک......' میرا ہنستے ہنستے برا حال تھا۔ کیا تمہیں مسز کہتے ہوئے کچھ اٹ پٹا سا......'

دوست سنجیدہ تھا۔ 'تم کچھ زیادہ ہی تیرنے لگے ہو۔'

'تیرنے لگے ہو؟'

'اوپر اوپر تیر کر نکل آؤ۔ اندر جاؤ گے تو جل جاؤ گے۔'

'کیوں؟'

'اندر تیزاب ہے۔ جسم کے ساتھ روح بھی جل جائے گی' وہ کافی سنجیدہ ہو چلا تھا......
'انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ اپنی سوسائٹی کے ساتھ وہاں پہنچ چکے ہیں، جہاں ہم تم نہیں جاسکتے۔'

میں نے دوست کی بات کاٹتے ہوئے کہا...... 'غلط سوچ رہے ہو تم...... ہم ان لوگوں سے بہت زیادہ پیچھے نہیں ہیں...... ایک بار ہی سہی، ہم اس سوسائٹی میں شامل ہوئے ہیں......'

دوست نے خوفزدہ ہو کر میری طرف دیکھا۔

'وہ لڑکی تم میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ جانتے ہو کیوں؟'

'نہیں۔'

'اس نے تم میں ایک مرد کو دیکھ لیا ہے۔ مرد کو۔ سمجھ رہے ہو نا' اس کا لہجہ جھنجھلاہٹ سے بھرا تھا____ 'جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس شہر کی آب و ہوا میں ہم اس مرد کو گنوا چکے ہوتے ہیں۔'
اس کے بعد وہ ٹھہرا نہیں۔ فوراً چلا گیا۔

6-1-2001 دوپہر (آفس)

آج پہلی بار اس سے فون پر باتیں ہوئیں۔ اس کے لہجے میں تھرتھراہٹ تھی۔ اس نے میرے بارے میں سک ویرا سے باتیں کی تھیں۔ سک ویرا نے مجھے آج شام گھر کھانے پر انوائٹ کیا ہے۔ کیا مجھے جانا چاہئے؟

(کچھ سطریں پھر کٹی ہوئی)

کیوں جانا چاہئے مجھے۔ اُف، اندر عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی ہے۔ کیوں؟ میں نہیں

جانتا...... مگر وہ بھورے بالوں والی لڑکی......

Chestity Belt کی قید سے 'کرشمہ' کے 'سیکسی سیکسی' گانوں تک ــــــ اپنی پہچان کرانے کا جائزہ لیں تو عورت لگاتار اپنے آپ کو بدلتی آئی ہے۔

مجھے لگتا ہے کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ عجیب سا۔ دوست کے الفاظ یاد آتے ہیں......

'اندر تیزاب ہے...... اس نے تم میں ایک مرد کو دیکھ لیا ہے...... حقیقت یہ ہے کہ اس شہر کی آب وہوا میں ہم اس مرد کو گنوا چکے ہوتے ہیں......'

ماں کی چٹھی ملی تھی۔ مجھے بے غیرت لکھا ہے۔ باہر جا کر اپنی ذمہ داریوں کو بھول جانے والا...... لیکن میں یہ کیوں لکھ رہا ہوں......

مجھے وہ بھورے بالوں والی لڑکی یاد آ رہی ہے...... کیا میرے پر لگ گئے ہیں......

(اس کے بعد کی ڈائری کے صفحے اب تک خالی پڑے ہوئے ہیں)

ایک پری کتھا چور مرد کی

دروازہ کھولنے والی وہی تھی۔ وہی بھورے بالوں والی لڑکی۔ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ نہیں تھی۔ دروازہ کھولنے کے بعد اس نے مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔

'آجاؤ'

وہ فل شرٹ اور جینس میں تھی...... شاید، دور سے دیکھنے پر یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ ایک خوبصورت سی لڑکی ہوگی......

'کارل کہاں ہے؟'

سوال پوچھتے ہی ایک ٹھنڈی، نسوانی آواز مجھ سے ٹکرائی......

'میں یہاں ہوں۔ ابھی آیا'

میں نے گردن گھما کر دیکھا...... جھینے جھینے پردوں کے درمیان اس کا سراپا روشن تھا۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھا اپنے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہا تھا۔ آج اس نے ایک ریشمی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس نے پلٹ کر دو انگلیوں کی جنبش سے مجھے وش کیا...... 'ہائے۔'

'وہ دو گھنٹے سے سج رہا ہے۔'

بھورے بالوں والی لڑکی کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔

'دو گھنٹے سے؟'

'ہاں۔ تم اس کے لئے سیلی بریٹی ہو...... ایک ایسا سیلی بریٹی، جسے اس کی وائف پسند کرنے لگی ہے۔'

مجھے چکر آرہے تھے......

کارل پھر نسوانی آواز میں چلایا...... 'دومنٹ۔ پلیز۔ غصہ مت ہونا ــــــ ڈارلنگ! یہ پہلی بار ہمارے گھر آئے ہیں۔ ویلکم ہوم۔

کیٹ واک کرتا ہوا وہ اپنی جگہ سے اٹھا...... اس کے ہونٹ سرخ تھے۔ انگلیوں کی نیل پالش ابھی بھی گیلی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے، عورت جیسے انداز میں شرماتے ہوئے کہا ــــــ

''نو ــــ نو ــــ ڈونٹ لک ایٹ می۔ آئی ایم ناٹ لسبین (Lesbian)۔'

'سنا تم نے۔ یہ لسبین نہیں ہیں۔' بھورے بالوں والی لڑکی چیخی۔ 'سنا تم نے......' اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں ...... 'میں نہیں جانتی، تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے۔ لیکن، دوستو فسکی کے ایڈیٹ کی طرح اس پارٹی میں تم پہلے آدمی لگے، جس کے لئے دل سے آواز نکلی کہ اس آدمی کے ساتھ شیئر کیا جاسکتا ہے۔'

'نو نو ــــ ڈونٹ بی ایموشنل۔ گھر میں مہمان ہیں۔ ڈرالنگ......' سک ویرا کی نیل پالش لگی انگلیاں تھرک رہی تھیں۔

بھورے بالوں والی لڑکی سے چیخی۔ 'ڈونٹ ٹچ میں...... دور رہو مجھ سے ــــــ میں نے اس آدمی سے شادی کی تھی ...... 'وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی۔ وہ لمحے کیسے رہے ہوں گے، بتا سکتے ہو۔ اس آدمی سے ...... نہیں۔ اس مرد سے۔ مرد......؟

''کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے ڈارلنگ۔ باتوں کے لئے تو......'

سک ویرا کا جسم ایک بار پھر تھرکنے پر آمادہ تھا۔ وہ میری طرف گھوما ــــــ 'اس کی بات کا بُرا مت ماننا۔ میری وائف کو غصہ بہت آتا ہے۔ لیکن یہ تم کو چاہنے لگی ہے۔ کیوں ڈارلنگ؟''

سک ویرا کی انگلیوں نے شرارت سے میرے کندھے کو چھوا ــــــ بلیوی۔ مجھے بُرا

نہیں لگا۔ میں نے کہا۔اسے بلالو...... دیکھو تم آئے تو یہ لڑنے لگی...... نائی گرل۔گندی بات ہے نا......؟'

بھورے بالوں والی لڑکی زور سے چیخی۔غصّے میں اس نے انگریزی میں گندی گالیوں کا استعمال بھی کیا تھا۔لیکن سک ویرا، وہ تو جیسے بے نیازی سے اپنی اداؤں میں کھویا ہوا تھا۔وہ اسے اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

'اتنا غصّہ، مائی ڈارلنگ، اچھا نہیں ہے۔'

'Get lost' وہ زور سے چیخی...... 'میں نے اسے بلایا ہے۔میں دو منٹ اس سے اکیلے میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔کیا تم مجھے اکیلا چھوڑ سکتے ہو۔'

'وہائی ناٹ...... وہائی ناٹ ڈارلنگ۔'

سک ویرا کمر مٹکاتا ہوا جھینے پردے کو ہٹا کر اندر چلا گیا تھا۔

لڑکی اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

'تم بتا سکتے ہو، صدیوں کی تہذیب نے ہمیں کیا دیا ہے۔یہ...... یہ، ہجڑا...... میں چاہتی تھی، اس کہانی کا کوئی نہ کوئی گواہ ضرور رہے...... یہ گھر میں سڑنے گلنے والا جانور بھی نہیں ہے جسے گولی ماری جا سکے......'

'لیکن اس آدمی کو کسی نے تم پر Impose نہیں کیا تھا۔'

'اس نے ٹھنڈی سانس بھری...... ''سچ کہتے ہو۔لیکن اس شہر میں سب کچھ پہلی بار ہوتا ہے۔پہلی بار ہم ہیروئن لیتے ہیں۔پہلی بار 'ماری جوانا' پیتے ہیں۔پہلی بار سک ویرا جیسا ایک ایڈز ہم سے ٹکراتا ہے اور پہلی بار دروازے سے اپنا سر پھوڑ کر ہم مر جاتے ہیں۔لیکن اب نہیں مروں گی...... تم...... تم کیا کر سکتے ہو میرے لئے......؟''

اس نے اپنی نم آنکھوں کو، اپنی ہتھیلیوں سے پونچھا۔شاید وہاں آنسو تھے ہی نہیں۔اگر تھے بھی تو سوکھ چکے تھے......

'میں...... میں کیا کر سکتا ہوں...... 'میری آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی......

'تم......' اس کی آواز بوجھل تھی...... 'تم۔نہیں۔تم بھی کچھ نہیں کر سکتے۔اس لئے کہ تم بھی بزدل ہو۔پاراسائٹ...... لیکن سنو...... وہ جگہ یاد ہے۔میں تم سے ایک بار اور ملوں گی۔ایسا

کرنا کل آجانا ..... کل میں ملوں گی تم سے۔ کل میں وہاں آنے کی کوشش کروں گی...... اس لئے کہ آج رات مجھے کچھ فیصلے لینے ہیں۔ زندگی اور موت کے فیصلے ...... یہ دنیا سک ویرا اور بزدلوں کے سہارے نہیں گزاری جا سکتی۔ سن رہے ہو تم۔ چلو اب کھانا کھاتے ہیں، وہ بغیر رکے میرا ہاتھ پکڑ کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔

شاید میں کچھ نہیں سن رہا تھا۔ کب میں نے کھانا کھایا، کب اٹھا۔ کب گھر آیا۔ جیسے ایک اکڑی ہوئی لاش میرے جسم میں رکھ دی گئی تھی اور جسم کے الیکٹرک فرنس میں وہ لاش لگاتار جلتی جا رہی تھی۔

اے غم دل

زندگی کے سمندر میں، واقعات کی ایسی چھوٹی چھوٹی موجیں آیا کرتی ہیں۔ پھر جیسے موجیں آپس میں ٹکراتی ہوئی گم ہو جاتی ہیں ..... بھورے بالوں والی لڑکی بھی اچانک گم ہو گئی۔ اس شام وہ پارک میں ملنے نہیں آئی ..... میں دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ دوسرے تیسرے دن بھی نہیں آئی۔ ممکن ہے اس کے ساتھ کوئی واقعہ ہو گیا ہو۔ ممکن ہے اس نے کارل کو چھوڑ دیا ہو۔ ممکن ہے، اس نے یہ شہر ہی چھوڑ دیا ہو۔ لیکن چوتھے دن ایک عجیب سا واقعہ میرے ساتھ ہوا ..... شام جب وہ پارک میں نہیں ملی تو میرے قدم خود بخود لیڈیز شاپنگ سینٹر کی طرف اٹھ گئے ......

کمرے میں رات کا رقص شروع ہو چکا تھا۔ میں آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔ جھومتے جھومتے میں نے ٹیپ ریکارڈ میں انگریزی گانوں کا ایک کیسٹ لگا دیا ..... میں کپڑے اتار رہا تھا۔ نہیں۔ میں کپڑے بدل رہا تھا۔ غلط، میں کپڑے اتار رہا تھا ......

لیکن نہیں ..... میں کپڑے بدل چکا تھا ......

آئینہ میں اب ایک بے ڈھنگی اور بے ڈول عورت آگئی تھی۔ جو بھورے بالوں والی لڑکی نہیں تھی۔ جو کارل سک ویرا بھی نہیں تھا۔

اور جسے ..... میں نے بھی آج تک نہیں دیکھا تھا۔

○○○

کاجو

چار بج گئے تھے۔ ماسٹر گردھاری لال تیز تیز لپکتے ہوئے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دھوپ میں کافی گرمی آ گئی تھی۔ دائیں ہاتھ میں چھتری پکڑے، بائیں ہاتھ سے دھوتی کی چُنٹن برابر کرتے، پلاسٹک کے برساتی جوتے کو جھاڑتے، جوان کی ذرا سی غفلت سے کیچڑ میں سن گئے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ گردھاری لال سنبھل گئے، ورنہ اس عمر میں تھوڑی سی اونچ نیچ ہو جائے تو جسم کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بُرا سا منہ بناتے ہوئے گردھاری لال نے ایک بار پھر اپنے پلاسٹک کے جوتے کو دیکھا، جس پر چمار کی لگائی ہوئی ہزار کترنیں اور جگہ جگہ کی گئی سلائی اب اس کے دن ختم ہونے کی کہانی سنا رہے تھے۔ بائیں ہاتھ سے دھوتی کا ڈھکوا کھونستے ہوئے گردھاری لال نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کچھ پیسے ٹھنٹھنائے تو انگلیوں سے من ہی من میں گنتی کی کہ شام کے وقت کیا کیا آئے گا ــــــ کراسن تیل، کڑوا تیل، دال چینی، تھوڑی کھلی پتی، نہیں نہیں ان پیسوں سے تو اتنا کچھ آ ہی نہیں سکتا۔ کچھ کٹوتی کرنی پڑے گی۔ آخری مہینہ ہے...... چاہ (چائے) میں ہی کمی کرنی پڑے گی...... دو وقت چائے نہیں پی تو کا ہو جائے گا۔ مگر جوتا؟ پلاسٹک کے جوتے دس پندرہ روپے میں مل جاتے ہیں۔ جوتا سب سے ضروری ہے۔ یوں بھی اسکول کے دوسرے ماسٹران کا مذاق اڑاتے ہیں...... گردھاری بابو اب اس جوتے کو میوزیم میں رکھوا دیجئے۔ تاریخی جوتا ہے۔ کوئی کہتا خاندانی جوتا لگتا ہے، گردھاری بابو...... تبھی تو اتارتے نہیں بنتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ''پشتینی'' ہو ــــــ پشتینی چیزیں تو بس چلی آتی ہیں خاندان در خاندان۔ تھوڑے پیسوں میں آدمی کیا کرے کیا نہیں کرے۔ یہ لائے کہ وہ لائے...... تھوڑے سے پیسے میں تو گزارہ ہی مشکل ہے...... جوتے کا کیا ہے؟ یہ جوتا ابھی کچھ دن اور گھسٹ سکتا ہے۔ اس بار کی برسات بھر تو چل ہی جائے گا۔ پھر دیکھا جائے گا...... رام کا نام لے کر سب ہو جائے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں، خیر یہ جوتا ہے مگر کاجو......

آج برسوں بعد کاجو اچانک ان کے ذہن پر چھا گیا تھا۔ اب تو جیسے اس نام کے میوہ کو بھولے ہوئے بھی انہیں مدت ہو گئی تھی...... کاجو...... یاد کریں تو چاند کے چھوٹے شکل کا، سفید رنگ کا یہ ڈرائی فروٹ۔ ڈرائی فروٹ کے نام پر ہنسی آتی ہے گردھاری لال کو۔ یہ سوکھا اور گیلا پھل تو بس بے چارے انگریز ہی جانیں...... یہاں تو کھانے کو پھل ہی نہیں ہے...... کیا گیلا کیا سوکھا...... زیادہ مال آنے پر جب پھیری والا نارنگی چار چار روپے کلو بیچتا ہے تب بھی سوچنا پڑتا ہے...... فروٹ ہے، لے لیا جائے...... فروٹ کا مطلب اسٹیٹس سمبل۔ پلاسٹک کے برگونے (برتن) میں رکھ دو۔ بال بچوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ...... چھیلو...... کھاؤ...... بات کرو...... تب ایک عجب سا سکھ ملتا ہے...... بے پناہ لطف...... اچانک لڑکپن کا عجب سا احساس اندر کوند جاتا ہے...... جیسے وہ اچانک ہی خط غربی توڑ کر آگے بڑھ آئے ہوں...... کوئی مذاق ہے۔ پھل کھا رہے ہیں۔ ایسے میں کوئی مہمان یا ملنے والا آجائے تو کیا کہنے...... ادھر پوچھا نہیں کہ کیا کر رہے ہیں۔ گردھاری بابو...... فوراً سینہ تان کر جواب دیا، پھل کھا رہے ہیں، پھل...... آپ بھی آئیے نا...... دیکھنے والوں کو بھی ایک منٹ کے لئے جھٹکا لگتا ہے...... کیا بات ہے...... گردھاری بابو پھل کھا رہے ہیں...... یہ ہوئی نا بات...... اب وہ من ہی من سوچے گا...... گردھاری بابو کو کیا کمی ہے۔ کیسے بچا لیتے ہیں اتنا...... ماسٹر گردھاری لال دل ہی دل میں ہنستا ہے...... مگر کاجو کی یاد اچانک اس ہنسی کو توڑتی ہوئی انہیں فوراً ہی "سنک سیتا رام" کر جاتی ہے...... کاجو...... اب تو مزہ بھی یاد نہیں رہا...... کیسا ذائقہ ہوتا تھا...... پرانی یادوں میں کہیں اس ذائقے کو یاد کرنا چاہتے ہیں، گردھاری لال...... لیکن کچھ یاد نہیں آتا...... بس اتنا یاد ہے کہ بچپن میں بابو جی لایا کرتے تھے...... تب زمانہ ہی کچھ اور تھا...... وہ بھی اچھے کھاتے پیتے گھر کے تھے...... بابو جی ماسٹر تھے...... خاص خاص لوگوں کے یہاں پڑھانے جاتے تھے۔ اس وقت کھاتے پیتے لوگ ہوا کرتے تھے۔ پیسے تو دونوں ہاتھوں سے خرچ کیا کرتے...... آج کے لوگ کھانا جانتے ہی نہیں ہیں۔ لاکھ پیسہ آجائے لیکن رہیں گے وہی کنجوس کے کنجوس...... اور کیا کھانا پینا...... جیسا کہ اس زمانے میں ہوتا تھا...... اصلی گھی...... پیور گھی...... گھی چھن رہی ہے...... پوریاں بن رہی ہیں۔ جو بھی ملنے والا ہوتا، کھانے بیٹھ جاتا...... اب اصلی گھی کہاں...... ہر چیز نقلی ہو گئی ہے...... تب بابو جی کبھی کبھی شام میں لوٹتے وقت کاجو جیب میں بھر بھر کر لاتے...... اور پھر بڑے پیار سے بلواتے ——— گردھوا...... کہاں ہے...... آ...... رے...... ہوا......

وہ کسی کونے میں دبکا ہوتا تھا۔ کھیل رہا ہوتا...... بابو جی کی آواز پر دوڑا دوڑا آتا...... کا ہے...... پتا جی؟ دیکھ کا لائے ہیں تیرے لئے...... اتنا کہہ کر پتا جی دونوں ہاتھ جیب میں لے جا کر کھول دیتے...... دیکھ...... اتنا سارا کاجو...... لے کھا...... ارے کھا...... نا...... بڑی طاقت کی چیز ہے۔ لے سب کھالے......، پھر وہ مائی کو آواز لگاتے...... گردھوا کی میا...... او گردھوا کی میا...... ذرا سنیو...... ذرا ادھر ائیو...... مائی رسوئی سے دوڑتی ہانپتی چلی آتی...... بات کا ہے؟ دیکھ کا لایا ہو...... ارے کاجو ہیں...... پھر پتا جی اس سے کہتے...... دے...... دے...... تھوڑا مائی کو بھی چکھا...... لے کھا تو بھی...... کاجو ہے...... کاجو...... فائدہ کرے گا...... مائی تو جیسے چڑ جاتی...... اب کا فائدہ کرے گا اس عمر میں...... ہم بھی کہیں، سٹھیا گئے ہو تم اب...... میری تو دال جل جائے گی...... اتنا کہہ کر مائی تیز قدموں سے پھر رسوئی میں لوٹ جاتی...... بابو جی دل کھول کر ہنستے...... اور وہ مٹھی مٹھی کاجو پھانکتا ہوا بابو جی کے بڑ بول سنتا رہتا...... ''میری کافی دھاک ہے رے...... سب بڑے لوگ مانتے ہیں...... ای زمیندار صاحب سے لے کر چودھری صاحب...... کوتوال صاحب...... سارے لوگ...... رہ رہ کر وہ پوچھتے...... اچھا ہے نا کاجو...... صحت بنا بیٹا...... ای ہے...... سی...... ہت کل کام آوے گا...... سب سے ضروری چیز سیحت ہے۔''

چونکتے ہیں گردھاری لال...... اپنے دبلے پتلے جسم پر ایک نظر ڈالتے ہیں...... وقت نے کتنا کچھ بدل دیا...... کل اناج تھا، بھری رسوئی تھی تو طاقت بھی تھی...... اور آج خالی رسوئی ہے...... پھوٹی جیب ہے تو طاقت کیسے آئے گی...... ہڈی چمڑا ہو رہے ہیں...... درگاوتی بھی کیسی ہو گئی ہے! جب، بیاہ کر آئی تھی تب کیسی تندرست ہوا کرتی تھی...... اور کیسی سندر...... سب وقت کی مار ہے...... نہیں وقت کی نہیں...... قسمت کی۔ نہیں قسمت کی بھی نہیں...... پیسے کی...... سب سے بُری مار پیسے کی ہوتی ہے...... پیسہ ہوتا تو سب کچھ آتا...... پہلے تو وہ اپنا گھر ٹھیک کرتے۔ برسات میں تو گھر کی درگت بن جاتی ہے...... ہر جگہ سے ٹپکنے لگتا ہے...... کہاں رہے آدمی...... کہاں سوئے...... کہاں کھانا بنائے...... ایک دقت ہو تو بتائیں...... یہاں تو دقت ہی دقت ہے...... سوچا تھا...... کچھ ٹیوشن مل جاتا تو کم سے کم چھپر ہی ڈلوا لیتے...... مگر اب مزدوری کتنی بڑھ گئی ہے...... چھپر میں بھی کم و بیش پانچ سو لگ ہی جائیں گے۔ باپ رے باپ پانچ سو...... یہ پانچ سو تو بس خواب ہے اس کے لئے...... پانچ سو کہاں سے آئیں گے...... نہ پانچ سو آئیں گے نہ چھپر ڈلے

گا..... نہ جوتا آئے گا..... نہ کاجو.....

کاجو ایک بار پھر ان کے راستے کو کاٹ گیا تھا۔ کیسا ذائقہ ہوتا ہے..... کاجو کا..... نہیں ذائقہ کیسا..... بس اچھا لگتا تھا..... اس لئے کہ صحت کے لئے فائدہ مند تھا..... اب کہاں کاجو، کہاں کشمش، کہاں اخروٹ..... وہ تو بھلا ہو ان کے کلیگ ماسٹر دینا ناتھ کا..... جس نے بیٹھے بیٹھے انہیں پرانے دنوں میں پہنچا دیا..... صبح پہنچے تو دیکھا..... ٹیچرز روم میں دینا ناتھ بیٹھے پنکھا جھل رہے ہیں..... بجلی نہیں تھی..... انہیں دیکھ کر دینا ناتھ نے تیز آواز لگائی تھی..... آؤ گردھاری بابو.....، دینا ناتھ انہی کی عمر کے تھے..... جب سے یہ پرائمری اسکول شروع ہوا تھا، تب سے تھے دینا ناتھ..... شروع میں لوگ ہی کتنے تھے..... اشونی پرساد ان میں سب سے بزرگ تھے، سو ہیڈ ماسٹر تھے وہ..... اب رہ گئے پرانے لوگوں میں، سو گپتا جی تو مر ہی گئے..... حساب ٹیچر..... اب پرانے لوگوں میں ایک دینا ناتھ جی ہی رہ گئے ہیں..... دوسرے تو نوجوان ہیں..... ان سے نہیں بنتی گردھاری لال کی..... ایک تو عمر کا فرق ہے..... دوسرے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں..... نئے زمانے کی نئی نئی باتیں..... کہا کچھ تو ہانکیں گے کچھ..... جیسے سارے زمانے کو یہی پڑھا رہے ہوں..... بولیں گے'' کچھ خبر معلوم ہے آپ کو گردھاری لال جی..... دیس میں کیا کیا ہو رہا ہے؟''

اب آج ہی کا قصہ ——— اس جمعہ جمعہ آٹھ دن کے لونڈے تیواری نے پھبتی کسی تھی..... ٹیچر کیا بحال ہوا، اتراتا پھرتا ہے..... کہنے لگا..... دیکھ رہے ہیں دیش کا حال..... اس دیش کی لڑکیاں اب دوسرے دیش کو بھی اپنے اشاروں پر نچانے لگی ہیں..... کچھ حال چال معلوم ہے پامیلا بوڑز کا..... اب اس کا اتنا کہنا تھا کہ اس کے ساتھ کے ایک دوسرے ٹیچر نے قہقہہ لگایا تھا..... ابے زبان سنبھال کر بولنا تیری بھابھی لگتی ہے..... کل مجال تھی کہ بات چیت میں بھی کوئی اونچ نیچ ہو جائے؟ آپس میں بھی عزت ہوتی تھی..... مگر آج دیکھئے..... یہ ٹیچر ہیں۔ کیا پڑھائیں گے بچوں کو، جب خود ہی نہیں پڑھ پائے..... گردھاری لال کی آنکھوں میں جلن ہوتی ہے..... پھر یاد آتا ہے۔ دینا بابو نے انہیں بلا کر دکھایا تھا..... دیکھئے تو کیا ہے..... ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا..... پھر ہنسے تھے..... دیکھ کیا رہے ہو..... ارے ماسٹر..... بوڑھے ہو گئے ہو تم اب..... چشمے کا پاور چیک کرا لو..... ایک جھٹکے سے وہ ٹوٹے ہوئے، کمانی والے چشمے کو برابر کرتے ہیں جو دوسرے

کنارے پر کان میں دھاگے سے بندھا ہوا تھا......

''کیا مطلب......ارے یہ تو کاجو ہے۔'' ''ہاں......مگر ڈرائی فروٹ نہیں......یہ بھنا ہوا ہے......نمکین کاجو......تیل کا چھنا ہوا......سستا مل جاتا ہے......سات روپے کا یہ پیکٹ ملا......کسی بھی بنیے کی دکان میں مل جائے گا...... کہہ کر ہنسے تھے، دینا ناتھ بابو۔ کیا زمانہ آگیا ہے گردھاری لال......یاد ہے تمہیں......بچپن میں کاجو کشمش ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی......جب تب گھر میں آجاتا......کھالیتے......مگر آج خرید سکتے ہو......؟ ارے اتنے پیسے جڑیں تو دوسرے میں نا خرچ کروں......خریدنے سے کیا سروکار......اب سوا سو......ڈیڑھ سو روپے کلو کیا خریدے گا آدمی......کیا کھائے گا......دکھ تو یہی ہے گردھاری لال جی کہ نئی پیڑھی کو سب کچھ دیا مگر منہ کا ذائقہ چھین لیا......نہ اب وہ زمانہ ہے......نہ کھانا ہے......یہ بے چارے کیا جانیں کاجو، کشمش......آج چلتے وقت بنیے کی دکان سے لائف بوائے خرید رہا تھا کہ اس پر نظر پڑی...... بھنا کاجو، کہہ کر ہنسے تھے دینا ناتھ......بس لے لیا کہ پرانی یاد تازہ کی جائے...... گھر جا کر دکھا تو سکتا ہوں......بچوں کو......کہ دیکھو......ایسا ہوتا ہے کاجو......تم مانو نہ مانو...... نئے چھوکروں نے تو کاجو کا نام بھی نہیں سنا......شکل بھی نہیں دیکھی......کہہ کر دیر تک ہنستے رہے تھے دینا بابو......اور سچ مچ ایک منٹ کو اُن کی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی گردھاری لال سوچ میں پڑ گئے تھے......حقیقت میں کل آج میں کتنا فرق آگیا تھا......اس سطح پر اس فرق سے تو وہ بالکل ہی انجان تھے۔

''نہیں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے'' کہہ کر خود کو تسلی دی تھی۔

تم مانو نہ مانو، کہہ کر بولے تھے دینا ناتھ......اچھا یہ بتاؤ کب سے اس اسکول میں ہو؟ عمر بیت گئی ہے۔ ایمان سے کہنا کبھی اپنے پیسے سے اپنے بچوں کو کھلایا ہے کاجو......آں......بولو؟''......''ہاں، یہ تو سچ ہے۔ بس اسی بات پر زمین میں گڑ سے گئے تھے گردھاری لال۔ یہ تو سچائی تھی......نہ نو من تیل ہوا نہ رادھا ناچی......قصور ان کا کیسے......؟ کل کھاتے پیتے لوگ تھے تو وہ بھی چکھ لیا کرتے تھے......مگر اب کہاں کا کاجو......کہاں کا کشمش......'' یہی سوچ کر گردھاری لال چپ ہوگئے۔

یہ ایسی سچائی تھی جو آسانی سے ان کے گلے کے نیچے نہیں اتر رہی تھی......ہاں، سچ مچ بچوانے تو کبھی اپنی زندگی میں کاجو کھایا ہی نہیں......کاجو تو چھوڑو مشکل سے کسی کسی موسم میں آم،

امرود، جامن، لیچی، سیب یا سنترے مل جاتے...... وہ بھی بس من مار کے ایک یا دو بار...... اتنی اوقات کہاں؟ مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رام سرنوا نے کاجو کا نام ہی نہیں سنا ہو...... ای جھوٹ بولے ہیں...... دینا ناتھ...... مگر آج کے بڑھتے دائرے میں انہوں نے من ہی من میں آج کی پالیٹکس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی...... سالی...... مہنگائی ہے۔ آج...... دو وقت کی روٹی نہیں جڑتی...... جینا حرام...... ارے اس سے تو انگریزوں کا زمانہ اچھا تھا...... جب کم سے کم کھانے کا تو آرام تھا...... پہننے کا آرام تھا...... سستی تھی...... اور آج...... آدمی پھل کھا ہی نہیں سکتا۔ وہ بھی ڈرائی فروٹ...... کاجو، کشمش، بادام، اخروٹ...... اچانک ان کے دماغ میں ایک نئی بات آئی —— پتہ نہیں اب یہ چیزیں ملتی بھی ہیں یا نہیں...... وہ بھی کہیں دیکھتے نہیں ہیں...... کسی سے تذکرہ نہیں سنتے ہیں۔ مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب مہنگی چیزوں کا نام لیتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے...... جیسے کرنٹ لگ جائے گا...... ہوش گم ہو جائیں گے...... نہیں...... ملتا ہوگا...... ملتا کیسے نہیں ہوگا...... مہنگائی ہے تب بھی دکانوں پر لوگ تو ٹوٹتے ہی ہیں...... اسری کی دکانوں پر...... فیشن کی دکانوں پر...... تب مہنگائی کہاں چلی جاتی ہے...... مہنگائی وہاں نہیں ہے...... وہ تو پیسے والے ہیں...... مہنگائی صرف ان کے لئے ہے...... ان جیسوں کے لئے...... جن کے ہاتھ میں نہ پیسے آئیں گے...... نہ کاجو آئے گا...... نہ بادام آئے گا......

گھر آ گیا تھا۔ دور سے ہی ایک نظر گھر پر ڈالی باہر دروازے پر ہی رام سرن 'گوڑ' (پاؤں) میں منہ دیے بیٹھا تھا...... چپ چاپ۔ ایک لمحہ کو دل دھک سے کر گیا گردھاری ماسٹر کا! یہ کھیلنے کھلانے کی عمر اور اتنا ڈھیلا بدن! کھانے پینے کا آرام ہو تب تو جسم بڑھے...... بچپن سے اب تک رام سرنوا کو مارنے پیٹنے کے علاوہ وہ دیتے ہی کیا رہے ہیں...... ہاں۔ ان کے زمانے کی بات اور تھی۔ بابو جی پیٹتے تھے تو پھر رس ملائی بھی آتی تھی...... حلوے بنتے تھے۔ تب سستی تھی۔ تھوڑے پیسوں میں ہی سب کچھ خرید لو۔ گھر آتے آتے تھکاوٹ سی آ گئی تھی...... دروازے کے قریب پہنچتے پہنچتے ہمیشہ کے بندھے ٹکے اصول کی طرح چھتری بند کی۔ رام سرن انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا...... انہوں نے دھیرے سے پوچھا...... "طبیعت تو ٹھیک ہے تیری......؟"

"ہاں" کہہ کر رام سرن ایک طرف کھڑا ہو گیا...... ایک لمحے کو گردھاری لال دھک سے ہو گئے۔ جیسے سب کاجو نہ ملنے کا قصور ہو...... چودہ پندرہ سال کا لڑکا اور اتنا ڈھیلا ڈھالا۔

پاؤں سے پلاسٹک کے جوتے نکالے۔ دروازے پر کھڑے کھڑے چھتری بند کر کے ایک طرف رکھی۔ دروازے کے اندر دھول میں لپٹی انجر پنجر ڈھیلی سائیکل کی طرف ایک نظر ڈالی۔ اب تو مہینوں بیت گئے تھے، اسکول سائیکل سے گئے ہوئے...... دھیرے دھیرے، ایک ایک چیز خراب ہوتی چلی گئی۔ سائیکل کی پہلے گھنٹی خراب ہوئی، پھر بریک خراب ہوئے، پھر ایک دن پیڈل بھی نکل گیا—— ہینڈل ترچھی ہوگئی اور ایک دن جب رکشے سے بچتے بچاتے سائیکل بجلی کے ایک کھمبے سے ٹکرا گئی تو اس دن سے سائیکل باہر برآمدے میں رکھ دی گئی...... کہ جب پیسے آئیں گے، تب بنے گی سائیکل۔ پھر نکلے گی سائیکل کی سواری۔ اس دن تو بس بھگوان نے جان بچالی، ورنہ سائیکل سے گرنا کوئی مذاق ہے کیا؟ وہ بھی اس عمر میں جب پھل پھلوڑی نہ ہو، سو کیا بھلا چنگا ہو آدمی...... ایک بار پھر ہنسے گردھاری لال...... آج تو ان کے ساتھ غضب ہو رہا تھا...... ہر معاملے کو لے کر وہ سیدھے کا جو تک پہنچ جاتے۔

چھاتا، ایک طرف رکھ دینے کے بعد وہ رام سرن سے بولے، جا بٹوا، مائی سے پانی کا لوٹا باہر بھیج دینے کو بول...... پھر وہیں انتظار کرتے رہے...... کچھ ہی دیر بعد ان کی سن گن لے کر رام سرن کی ماں لوٹے میں پانی بھر لائی...... وہیں کھڑے کھڑے پاؤں بھگویا۔ منہ ہاتھ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ان سب سے نمٹ کر اندر آ گئے۔ تب تک رام سرن کی ماں دوبارہ چوکے میں جا چکی تھی۔ باہر نکلی ہوئی چارپائی پر کچھ سوچتے ہوئے بیٹھ گئے...... گردھاری لال۔ ادھر ادھر دیکھا —— ایک کونے میں رام دلاری بیٹھی تھی...... سوکھی مریل سی۔ رام سرن سے تین سال چھوٹی۔ آج کا دن تو جیسے پچھتاوے کا دن لگ رہا تھا۔ وہ کیوں آ گئے دنیا میں...... اور جیسے وہ کا جو خریدنے کے لائق ہوتے تو ان پریشانیوں سے نجات پا جاتے۔ رام سرن کی ماں جب تھالی میں کھانا پروس کر گئی تو سر جھکا کر بولے۔ ''رام سرنوا کہاں چلا گیا؟''

''بھگوان جانے۔'' مشینی ہاؤ بھاؤ سے کام کرتی رہی درگاوتی...... دوڑ کر پانی کا گلاس بھر لائی...... چارپائی کے نیچے ایک طرف گلاس ڈال کر ہاتھ میں پنکھا لے کر انہیں جھلنے بیٹھ گئی...... گرمی کافی تھی...... ایک تو راستے بھر چلنے کے بعد ہی بدن گرم ہو جاتا ہے۔ ہاتھ...... منہ دھونے کے بعد تازگی محسوس کر رہے تھے گردھاری لال...... آہستہ سے ایک لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے رام دلاری سے بولے...... جا دیکھ باہر رام سرنوا کو...... اور تو بھی آ جانا......'' ماں نے اسے باپ بیٹے کا دلار سمجھا۔ پنکھا جھلتی رہی۔ کچھ دیر بعد بھاگ کر رام سرن آ گیا۔'' آپ نے بلایا، پتا جی؟''

''ہاں رے......''

''کا بات ہے پتا جی؟'' رام دلاری نے دوبارہ آ کر اپنا کونا سنبھال لیا تھا...... درگاوتی باپ بیٹے کے پیار کے بارے میں سوچ رہی تھی...... بات کیا ہے...... دفتر سے آتے ہی پیار جتایا جا رہا ہے۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ بس پنکھا جھلتی رہی...... نیا لقمہ بناتے، منہ میں ڈالتے ہوئے وہ رام سرن سے بولے...... کچھ پڑھا لکھا بھی ہے یا نہیں؟ رام سرن چپ رہا۔

''دیکھ کا سکل بنالی ہے۔ کتنا دبلا پتلا......'' وہ جیسے اپنی بات پر آنے کا راستہ تلاش کر رہے تھے...... کوئی کچھ کہے تب تو من کی بات بولیں...... ایسے کیسے کہہ دیں۔

''بیمار رہتا ہے کا؟''

''ہاں'' رام سرن نے اس بار سر ہلایا تو جیسے انہیں من کی بات کہنے کا موقع مل گیا۔ ایک دم سے بول پڑے......

''کاجو کیوں نہیں کھاتا ہے رے......؟''

''کاجو!'' ایک دم سے چونک پڑی درگاوتی ______

''کاجو!'' رام سرن بھی جیسے اس نام پر چونک پڑا۔

کونے میں اپنے کام میں مگن رام دلاری بھی یک ٹک اسی طرف دیکھنے لگی۔ آخر درگاوتی نے بات کاٹی...... ''سٹھیا گئے ہو اس بڑھاپے میں کا؟ میں بھی کہوں کہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اس بڑھاپے میں دو وقت کا اناج تو جڑتا نہیں، بچوں کو کاجو کھلاؤ گے ______ کہاں سے لاؤ گے کاجو۔ یہ کاجو تمہارے دماغ میں آیا کیسے...... کہیں سے بھانگ وغیرہ تو نہیں چڑھالی؟

کاجو...... آہستہ سے دہرایا اس نام کو رام سرن نے۔

درگاوتی کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے، کھانے کا ایک اور لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے وہ رام سرن سے بولے۔

''کبھی کھایا ہے کاجو؟''

''نا''

''نام سنا ہے؟''

اس بار بھی رام سرن چپ رہا اور دھک سے رہ گئے گردھاری لال۔ دل مسوس کر رہ گیا...... چودہ سال کی عمر ہو گئی۔ چودہ سال کی عمر میں نام نہیں سنا کاجو کا...... کا نام سنے بے چارہ جو

کھائے اسی کے بارے میں تو جانے —— جو نہ کھایا ہو نہ دیکھا ہو پھر نام کیا جانے...... تعجب ہوا۔ انہیں اتنا تعجب پوری زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا...... غور سے رام سرن کا چہرہ دیکھا۔

''نہیں سنا ہے نام کاجو کا؟'' اس بار بھی رام سرن نے سیدھے انکار میں سر ہلا دیا۔

''ارے تو نے رے...... رام دلاری —— وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے رام دلاری کو بھی آواز لگائی......''

''نا''...... اس کا بھی سر ہل گیا......

''ای سب کا پوچھ رہے ہو، کوئی نیا کھیل مل گیا ہے کیا —— یا لائے ہو کاجو؟'' درگاوتی سے برداشت نہیں ہو سکا۔

''کاجو......؟ وہ طنز سے مسکرائے...... اب کون دے گا کاجو...... بابو جی کا زمانہ تو رہا ہی نہیں کہ پڑھانے گئے تو لوٹتے وقت جیب بھر بھر کر کاجو لیتے آئے۔ وہ ہنسے اور رام سرن کو بتانے لگے۔

''بہت مہنگا ہوتا ہے کاجو...... بہت زیادہ جو مالدار ہوتے ہیں نا، وہی کھاتے ہیں کاجو...... بچپن میں ہمارے بابو جی نے بھی بہت کھلایا تھا...... اب کہاں کاجو، اخروٹ، تو...... کھائے گا؟''

''ہاں......'' رام سرن کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''کوئی ٹیوشن ملا کا؟'' درگاوتی نے اچانک پوچھ ڈالا تو وہ جیسے سپنوں کی چھت سے برآمدے میں گر پڑے —— مایوسی میں گردن ہلائی...... ''نہیں''

''کسی بچے سے ذکر کیا؟''

''بچے سے ذکر کر کے کا ہوگا......؟''

''ہوگا کیسے نہیں، اپنے باپ سے کہیں گے وہ —— تمہیں پڑھانے پر رکھنے کے لئے۔ اس سے پہلے بھی تو دو جگہ پڑھایا تھا۔ مگر کیا ملا؟ کبھی دہی چلی آرہی ہے تو کبھی چوڑا۔ ایک مشت پیسہ تو کسی نے نہیں دیا —— تم ہی ہو اس معاملے میں ڈھیلے۔ رام دلاری کو دیکھو۔ بڑی ہو رہی ہے۔ ہمارے زمانے میں تو اس عمر میں لڑکی کا گونا ہو جاتا تھا...... یہاں ایک لڑکی مہنگی پڑ رہی ہے۔ تمہیں تو جیسے کوئی فکر ہی نہیں ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئے۔اس بات چیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ رام سرن پھر باہر کی طرف بھاگ گیا۔''ارے میں کہتی ہوں۔دو چار ٹیوشن کر کے ابھی سے پیسے جوڑو۔ان پیسوں سے گھر گرہستی تو چلتی نہیں۔بیٹی کے ہاتھ کیا خاک پیلے کرو گے؟'' ایک لمبی اداسی اوڑھ لی گردھاری لال نے...... تھالی صاف تھی...... اب کہاں کا کاجو...... سامنے کونے میں بیٹھی رام دلاری کا پیلا چہرہ تھا...... تھالی لے کر درگاوتی پھر چوکے میں لوٹ گئی۔چارپائی سے اٹھ کر برآمدے میں آ گئے۔گلاس سے منہ میں پانی لے کر کلی کی۔ہاتھ دھویا۔پانی ڈکارا۔پھر واپس لوٹ آئے۔ذہن اب بھی بوجھل ہو رہا تھا۔رہ رہ کر کاجو پر ہی پہنچ جاتے۔کتنی عجیب بات ہے، ان کے بچوں نے کاجو کا نام تک نہیں سنا —— یعنی حد ہو گئی...... کہتے ہیں دنیا نے ترقی کی ہے...... خاک ترقی کی ہے! چیزوں کے دام آسمان چھو گئے...... اچھی بھلی چیز کا مزہ بھول گیا آدمی —— بس یہی ترقی کی ہے۔

رام رام کر کے لیٹ رہے تھے۔اسی بیچ بیوی گھر میں کم پڑتی چیزوں کی لسٹ سناتی رہی۔چینی نہیں ہے۔چاہ کی پتی بھی ختم ہے۔دال تھوڑی سی ہے۔آٹا بھی لانا ہوگا۔چاول مہنگا ہے۔چھوڑو۔روٹی سے کام چل جائے گا۔کچھ پیسے ہوں تو آلو بھی لے آنا۔دال روٹی پیٹ میں اترتی نہیں —— آلو کی بھاجی ہو تو چل جاتا ہے۔سن رہے ہو...... وہ تو کانوں میں جیسے روئی ڈالے بیٹھے تھے —— بیچ بیچ میں اچھا اچھا کہتے رہے۔تھوڑا لیٹنے بھی نہیں دیتی سسری —— یہ بھی نہیں کہ پڑھا کر آئے ہیں۔تھوڑا آرام کر لیں۔یہ لے آؤ، وہ لے آؤ کی رٹ...... کہاں سے لائے وہ؟ جمن میاں کی بادشاہت تو رہی نہیں کہ سوچا اور حاضر۔الٰہ دین کا چراغ بھی ڈھونڈنے پر نہیں ملتا۔آنکھوں میں اب بھی رہ رہ کر چاند کی طرح کے کاجو کی شکل ناچ رہی تھی۔حیرانی تھی انہیں —— کمال ہے بچوا کاجو کا نام تک نہیں جانتا۔

تھوڑا ستا لینے کے بعد۔شام کے وقت ڈیڑھی جلانے کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔کراسن تیل، کڑوا تیل، چاہ پتی...... سوچتے سوچتے بیوی کو آواز لگائی، جھولا اٹھایا۔بوتل، تھامی۔بھاری قدموں سے باہر آئے۔ڈیوڑھی میں پڑے جوتوں میں پاؤں گھسایا...... دھوتی کی چُنن ٹھیک کی۔پھر گیٹ کھول کر باہر آئے۔باہر نکلے تو پان کھانے کی خواہش ہوئی۔یوں پان کے عادی نہ تھے۔لیکن کبھی کبھی کھا لیتے تھے۔جب جب موج میں ہوتے، وہ تو بھلا ہو بن پان والے کا، جو ان کے گھر سے دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ٹاؤن تھانہ سے تھوڑا سٹا ہوا —— نالی پر نکلی خالی جگہ پر

گمٹی کی دکان ـــــــ ببن کے لڑکے کو تیسری کلاس تک پڑھایا تھا۔ اس کے بعد اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگا تو ببن نے پڑھائی چھڑوا دی۔ لیکن اتنی عزت باقی تھی کہ انہیں دیکھتے ہی ماسٹر جی کہہ کر دکان میں بلوا لیتا اور ایک مسالہ دار پان کھلانا نہیں بھولتا۔ تھوڑی بہت ادھر ادھر کی گپ شپ بھی ہو جاتی۔ موج میں نکلے گردھاری لال تو ببن پان والے کی گمٹی کی طرف بڑھ گئے۔ مگر یہ کیا۔ دکان تو تختوں سے بند تھی۔ تالا جھول رہا تھا۔ وہیں تختے کی آڑ لئے ببن کھڑا تھا ـــــــ دھوپ اب تک لوٹ گئی تھی۔ کوئی چھ بجنے والے ہوں گے۔ تیز قدموں سے لپکتے ہوئے آگے بڑھے گردھاری لال۔ ببن نے انہیں دیکھتے ہوئے بے دلی سے سر ہلایا۔ ''نمستے، ماسٹر جی۔''

''بات کیا ہے، دکان کیوں بند ہے؟''

''زمانہ ہی خراب ہے، ماسٹر جی کیا کہیں؟'' ببن نے برا سا منہ بنایا۔

''کوئی خاص بات ہوئی کیا؟''

کوئی بات کرنے والا ملا تو ببن تھوڑا نرم ہوا...... ''اب کا بتائیں ماسٹر جی۔ ای دیش میں غریب کا جینا مشکل ہے۔ اب پاس میں تھانہ کیا ہوا، مصیبت آ گئی۔''

''مگر ہوا کیا؟'' گردھاری لال نے جھولا اب دوسرے ہاتھ میں تھام لیا۔

''صبح میں ایک انسپکٹر آیا۔ کہاں پان کھلاؤ۔ کھلا دیا۔ پھر پیسہ مانگا۔ تب سے یہ سنکٹ آیا ہے ـــــــ کہنے لگا تم نے ناجائز جگہ پر گومٹی بنا رکھی ہے۔ شام تک ہٹا لو ورنہ تڑوا دوں گا۔ اب تم ہی بتاؤ ماسٹر جی۔ ای کونو بات ہوئی کا۔ اب تھانہ پاس میں ہے تو رات بہ رات انسپکٹر بابوؤں کو پان تو کھلانا پڑتا ہے۔ کھلاتا اور بھیجتا بھی تھا۔ اس سے کونو خطرہ بھی نہیں تھا۔ جب تب کوئی کام ہی نکل آتا۔ دکان الگ محفوظ۔ اب کا معلوم کہ ای کونو نیا انسپکٹر ہے۔ آدمی کی زبان پھسل پڑی تو لو بھگتو...... سات بجے کا وقت دے گیا ہے۔ اب کہاں لے جاؤں ماسٹر جی یہ ڈیوڑھی۔ آپ تو جانتے ہیں آج سے نہیں، زمانے سے ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' ماسٹر گردھاری لال سوچ میں پڑ گئے۔

''کونو آپ ہی اپائے بتائیے ماسٹر جی؟''

ماسٹر گردھاری لال نے ٹھنڈی سانس بھری...... ''ای پولیس کی قوم قاعدہ قانون تو جانتی ہی نہیں ہے۔ اپنی من مانی کرتی ہے۔ آئے تو کہہ سن کر معاملہ رفع دفع کراؤ یا پھر...... وہ ٹھہرے، مسکرائے، پھر بولے...... ''کا جو کھلاؤ انسپکٹر کو۔''

''کاجو......'' ببن ایک دم سے چونک گیا...... ''آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے ماسٹر جی، ای کا کہہ رہے ہیں آپ؟ کاجو؟ ہوس میں تو ہیں آپ؟''

ماسٹر گردھاری لال کو اچانک لگا جیسے وہ کوئی غلط بات کہہ گئے ہوں۔ کاجو کی بات کرنے کا ابھی کون سا موقع تھا۔ زبان نہ ہوئی، پھسل پڑی۔ دھیرے سے بولے۔

''کاجو کا مطلب مسکا ببن بھائی ـــــ تھوڑا مسکا لگاؤ انسپکٹر کو۔ کیسے نہیں مانے گا۔ پان سان جب مانگیں، ڈھیر سا بنا کر کھلا دیا کرو۔''

''اوہ، وہی ہم کہیں......'' ببن بھی اس بات پر تھوڑا ہلکا ہوا ـــــ ''ویسے آپ بات ٹھیک کہے...... ماسٹر جی۔ بچپن میں، ہم چھونڑا لوگ جب کھیت ون میں ملیا توڑت رہے نا تو پہرے دروا کے پو چھیک پر کی کا کر رہل ہو، کہت رہیں کاجو کھاوت ہئیں۔''

ہنستا ہے ببن ...... ''ویسے خوب یاد دلایا آپ نے بھی کاجو کا ـــــ اب کا کاجو ماسٹر جی اتنی مہنگائی ہے کہ کچی بتاوں۔ رام قسم ہم نے بھی زندگی میں کبھی وہ نہیں کھایا...... کیسن ہوت ہے؟''

''تم نے بھی نہیں کھایا؟'' ماسٹر جی کو حیرت تھی۔

''نہیں''

''سچ میں نہیں کھایا؟''

''نہیں ماسٹر جی اب آپ سے کا چھپانا؟ اور غریب آدمی کا جانے کاجو، کشمش...... کون خریدتا ہے اب۔ سب سے کا پھیر ہے۔ ماسٹر جی میری بات کا یقین نہ ہو تو دس دکان دیکھ جاؤ ـــــ ملاؤ کاجو کا بھاؤ، اتنا مہنگا بھیئل ہے کہ کون خریدے گا، کھائے گا۔''

''یعنی اب ملتا بھی نہیں ہے......'' ماسٹر جی کو حیرت تھی۔

''کا ہے ملے گا ماسٹر جی۔ کسی کو کون کتا کاٹس ہے کہ ای مہنگائی میں کاجو کھائے گا۔''

''ہاں، یہ تو ہے لیکن ـــــ ماسٹر جی کی فکر اب بھی دور نہیں ہوئی تھی ـــــ لیکن ملتا نہیں ہو ایسا کیسے ہو سکتا ہے......'' ''یقین نہ ہو تو بازار کا بھاؤ پتہ کر لیں۔''

ببن نے جیسے ایک نئی توپ چھوڑ دی تھی۔ ماسٹر جی تو چکر میں آ گئے، دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ زمانہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کاجو نہ ملے۔ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر امیر لوگ بھی تو پڑے

ہیں۔ بڑے لوگ تو میوے پر ہی ٹکتے ہیں۔ بیماری ہوئی تو بادام۔ نہیں بھی ہوئے تو صبح کا ناشتہ، پھل، پھلوڑی، میوہ۔ ایک دم سے بازار میں نہ ملنے کی بات پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔ سودا سلف لے کر لوٹتے ہوئے اچانک خیال آیا، دکان دار سے پوچھتے چلیں۔ سچ مچ کاجو ہے کہ نہیں۔ یوں بھی سب سامان لے لینے، پیسہ دے دینے کے بعد بھی کامیشور بنیے نے پوچھا اور کچھ لینا ہے ماسٹر جی۔

نہیں، بس ہو گیا۔ کہہ کر دو قدم پیچھے لوٹے تھے ماسٹر۔ اب جیب میں تھا ہی کتنا جو لیتے۔ لیکن دو قدم پیچھے ہٹنے کے بعد اچانک ہی بہن کی بات ان کا راستہ روک گئی تھی۔ یقین نہ ہو تو بازار میں مول تول کر لیں۔ اندر کشمکش چل رہی تھی۔ اگر ہوا تو؟ کیا کریں گے وہ؟ کہہ دیں گے ابھی دام پوچھ رہا تھا۔ بعد میں آئیں گے۔ ہاں یہ ٹھیک ہوگا۔ کہہ کر پھر دو قدم آگے بڑھ گئے ماسٹر گردھاری لال۔ کامیشور دکاندار نے انہیں دیکھتے ہی گردن سیدھی کی، مسکرایا...... کچھ بھول گئے نا...... مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔''

''نہیں، بھولا نہیں۔ ویسے...... وہ ہنسے...... کاجو ہوگا آپ کے پاس؟''

''کا...... جو......'' اس بار کامیشور چونکا تھا۔ پل میں ہی انہیں لگا جیسے کامیشور کی ترچھی نظر اچانک ان کے پورے جسم کو ٹٹول رہی ہو۔ من ہی من میں ماسٹر جی خوش ہوئے۔ جیسے خود سے کہہ رہے ہوں۔ دیکھ لو بابو...... غور سے دیکھو...... ہوگا آپ کے پاس؟ گردھاری لال نے پھر ہمت کی......

''نہیں ماسٹر جی......'' اس بار کامیشور نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے منہ بنا لیا۔ ''اب کاجو کون خریدتا ہے ماسٹر جی کہ رکھوں، سال میں دو ایک بار تھوڑا تھوڑا نکل جائے تو بہت...... جیسے آج آپ نے پوچھ لیا۔'' وہ ذرا ٹھہر کر بولا...... ''حلوہ بنانا ہے کیا؟''

''ہاں'' گردھاری لال اس بار مضبوط آواز میں بولے۔ یہ کہنا زیادہ سچ ہوگا کہ جیسے وہ اسی جواب کے انتظار میں تھے۔ وہ دل ہی دل میں مسکرائے۔ خیر کہیں اور دیکھتا ہوں۔

جھولے کو مضبوطی سے پکڑ کر آگے بڑھنا چاہا تو اچانک ماسٹر دینا ناتھ کی صبح والی بات یاد آ گئی...... یہ کیا ہے؟...... نمکین...... بھنا ہوا کاجو...... کسی بھی بنیے کے یہاں مل جائے گا۔ کوئی سات ایک روپے میں۔ اب تو ہر چیز نقلی ملتی ہے۔ بچے نقلی کھا کر خوش رہیں گے۔ کبھی موقع ملا تو اصلی کاجو کی شکل دکھا دوں گا، کہہ کر زور سے ہنسے تھے دینا ناتھ...... ایک لمحے کو پھر اپنی جگہ پر ٹھہر

گئے ماسٹر گردھاری لال...... جیسے چمبک (مقناطیس) نے اچانک ان کے پاؤں کو روک لیا ہو۔ کہاں جارہے ہو۔ پہلے خریداری کرلو، بائیں ہاتھ میں جھولا پکڑتے ہوئے، دائیں ہاتھ سے کرتے میں بچی ریزگاری ڈھونڈی تو نو روپے کچھ پیسے نکل آئے۔ اب خوش تھے ماسٹر گردھاری لال۔ کم پڑے گا تو کل کسی سے قرض لے لیں گے۔ کیا ہوگا؟ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ جیسے منہ مانگی دولت مل گئی ہو۔ ایک بار پھر کامیشور بنیے کی دکان پر گئے۔ دکان پر اس وقت کچھ اور بھی کھڑے تھے۔ کامیشور نے ماسٹر جی کو دیکھتے ہی گردن سیدھی کی۔ تپاک سے بولا۔ ''کاہے، ماسٹر جی؟''

ماسٹر جی ایک لمحے کو ٹھہرے...... انہیں لگا جیسے کامیشور میں اچانک کوئی تبدیلی آگئی۔ دوسرا دن ہوتا تو وہ دوسرے لوگوں کو سامان دینے میں لگا رہتا۔ اُن کی طرف منہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا____ لیکن یہ کاجو کا اثر تھا۔ ماسٹر جی بھانپ رہے تھے۔

''ہاں، تو کیا ہے ماسٹر جی'' کامیشور نے پھر پوچھا۔

''وہ...... تھوڑا اٹکتے ہوئے ماسٹر جی نے لفظوں کی مضبوطی اوڑھی اور جیسے سانس سانس جوڑ کر پورے جملے کی ادائیگی کی۔''

''ایک نمکین کاجو آتا ہے...... پیکٹ میں......''

''ہاں ہے ماسٹر جی'' ...... کامیشور مسکرایا...... ''لینا ہے...... ابھی چاہئے۔''

''ہاں کتنے کا ہے۔''

''سات روپے کا ماسٹر جی۔'' ''ٹھیک ہے۔'' کامیشور پیکٹ نکالنے لگا تو ماسٹر گردھاری لال نے اطمینان کی سانس لی۔ پیسے دینے اور جھولے میں پیکٹ ڈالتے تک وہ صبح سے ذہن میں لئے پھر رہے ایک بوجھ سے آزاد ہوگئے تھے۔ اب وہ تیز تیز چلتے ہوئے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گھر کی ڈیوڑھی پر قدم رکھتے ہوئے بھی ان پر نشہ سوار تھا____ اندر گھستے ہی تیز آواز لگائی، ''ارے کہاں ہو؟ رام سرنوا۔ رام دلاری۔ ''؟ دیکھ کالایا ہوں؟''

رام سرن کے آتے آتے کاجو کا پیکٹ نکال چکے تھے اور خوشی سے چمکتا چہرہ لئے کہہ رہے تھے...... ''یہی کاجو ہے۔ کھا بیٹا کھا...... اب اصل چیز ملتی کہاں ہے۔ ہر چیز نقلی ہوگئی ہے۔ یہ بھی کاجو ہے۔ بھنا کاجو...... نمکین کاجو...... کھا بیٹا...... کھا...... کھا......''

○○○

انارکلی، عمر 54 سال

(ایک کہانی صبا اکرام کے نام)

"لارڈ ماؤنٹ بیٹین نے ہندوستان کی آزادی کے لئے 15 راگست کا دن مقرر کر دیا تھا۔ نجومیوں اور ستارہ شناسوں نے ہندوستانی سیاستدانوں کو صلاح دی تھی کہ 15 راگست کا دن ہندوستان کی نئی تاریخ مرتب کرنے کے لئے مناسب نہیں ہے۔ یہ بے حد منحوس دن ہے۔ اس کے مقابلے میں 14 راگست ستاروں کی حالت بہتر کہی جا سکتی ہے۔ ہندوستانی سیاست دانوں نے اس پر غور کرتے ہوئے، وائسرائے سے مل کر اس مسئلہ کا حل ڈھونڈ نکالا۔ یہ فیصلہ کیا گیا — کہ ہندوستان اور پاکستان 14 راگست 1947ء نیم شب کے سناٹے میں آزاد ہو جائیں گے۔"

......فریڈم ایٹ مڈنائٹ (کولنس اینڈ لیپیر)

OO

(اس کہانی کے سارے کردار فرضی ہیں۔ اس لئے ان کرداروں کی صداقت پر یقین نہ کیا جائے)

۳۸

OO

13 راگست 2001ء

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ مجھے خبر ملی تھی کہ پاکستان سے صبا اکرام آئے ہوئے ہیں۔ کہاں ٹھہرے ہیں، اس بارے میں مجھے کوئی معلومات نہیں تھی۔ ہم لکھنے والوں کا مذہب بھی کیسا جذباتی ہوتا ہے ــــ خود غرضی، بازار اور مشین کے اس عہد میں صرف یہ جان کر کہ کوئی ہماری برادری سے آیا ہے، یعنی لکھنے والوں کی برادری سے ــــ تو ایک نامعلوم خوشی راکٹ اور گرینیڈ کے خوف کو دلوں سے یوں نکال دیتی ہے ــــ جیسے ہم کسی رام راجیہ میں ہوں۔

صبا اکرام سے کوکبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن ملاقات کا ایک رشتہ ہجرت کے کرب سے بھی ہو کر گزرتا تھا۔ ہجرت ہم دونوں نے کی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ میں اپنے ہی وطن میں آرہ کی خوشبو چھوڑ کر دلی آ گیا تھا ــــ دلی، جو سیاست کا اکھاڑہ تھا اور صبا ــــ مٹی کی خوشبو چھوڑ کر جوانی میں ہی پاکستان چلے گئے۔ میری ملاقات ان کی تحریروں کے ذریعہ ہی ہوئی تھی۔ مٹی کی خوشبو کا درد ایسا تھا کہ 13 راگست رات کے دو بجے بھی، میں صبا اکرام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن میں کیا سوچ رہا تھا ــــ!!

سرحد پر چلتی ہوئی گولیاں ــــ کشمیر کا مسئلہ ایک ایسا ناسور بن گیا تھا کہ ہم لکھنے والے بھی اس کی زد میں آ گئے تھے ــــ سنا تھا، پڑھا تھا، قلم آزاد ہوتا ہے۔ لکھنے والا بے باک اور نڈر ہوتا ہے ــــ لکھنے والوں کو توپ اور گولیوں کی فکر نہیں ہوتی۔ لیکن فکر کے نہیں تھی۔ انتظار حسین سے علی امام نقوی تک ــــ اپنے اپنے کشمیر کی بساط بچھاتے ہوئے قلم انگارے برسانے لگتا تھا ــــ کیا نہیں؟

پچھلے دو برسوں میں صورت حال بھیانک ہو گئی تھی۔ ملک کے نقشے پر ہندوستان اور پاکستان دو خطرناک دشمنوں کی طرح آمنے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ خوشی اس بات کی تھی کہ ۴۷ء کے پہلے کے غلام ہندوستان میں بھی روس کی طرح 'ڈوئل' کا رواج نہیں تھا۔ مگر ہم لکھنے

والوں کو تھی ـــــ لکھنے والے جو تہذیب، رنگ، قوم اور مذہب سے بلند ہوتے ہیں۔ ہم اس خوف کے تانے بانے میں الجھے ہوتے کہ پاکستان اپنی تحریریں کیسے بھجوائیں ـــــ سرحد پر توپیں بارود اگل رہی ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف اب عالمی سطح پر بیان بازیاں اور نفرتوں کا بازار گرم ہو چکا ہے۔ لیکن......

صبا اکرام آئے تھے۔ مٹی کی خوشبو پکار رہی تھی......
نعمان شوق نے پوچھا تھا۔ ''کیا آپ ان سے ملے ہیں؟''
''نہیں''۔
''پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ـــــ؟'' تعجب کا اظہار۔
''کبھی نہیں ہوئی ـــــ''

سرحد پر جس رفتار سے توپیں گرج رہی تھیں ـــــ ادھر اسی رفتار سے، پاکستان سے، امن کے نام پر آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ مجھے ہالی وُڈ میں بننے والی فلم 'مارس اٹیک' یاد تھی۔ امن کے نام پر مارس (مریخ) سے آنے والے لوگوں نے امن کی علامت کبوتر کو لہولہان کر دیا تھا اور نفرت کی جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔

نعمان کی آواز کمزور تھی ـــــ ''ملنے کے بعد ٹھہرا ہوا ایک درد جاگ جاتا ہے۔''
''دشمنی زندہ ہو جاتی ہے!''
''ہاں لگتا ہے، سامنے بیٹھا ہوا آدمی، لکھنے والا ہے تو کیا ہوا۔ پاکستانی ہے تو دشمن ہے۔''
''پتہ کیجئے۔ ہم ایک دشمن سے ملنے کی تیاری کریں گے۔''

14/اگست 2001ء

صبح ہلکی ہلکی بارش ہوئی تھی ـــــ پھر بارش بند ہو گئی۔ دلّی کی سڑکوں پر ٹریفک کا شور شروع ہو گیا تھا۔ باہر پولیس کا اچھا خاصا بندوبست تھا۔ یہ بندوبست 15/اگست کے لئے تھا۔ 15/اگست یعنی آزادی کا جشن۔ میں باہر آیا تو ٹریفک سے پریشان لوگوں کے چہرے پر جشن آزادی کی الگ ہی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جھنجھلاہٹ اور منزل پر وقت پر نہیں پہنچ پانے کا خوف۔ پھر

صبح میں ہونے والی بارش۔ 15؍اگست کے لئے ٹریفک کے رولز بدل جاتے ہیں۔ احتیاط لازمی ہے۔ پچھلے ایک ماہ سے ـــــــ آگرہ گفتگو ناکام ہونے کا غصہ اب بھی لوگوں کے چہرے پر جھانک رہا تھا۔ شاید اسی لئے آتنک وادی سنگٹھنوں کے خوف سے دلّی میں پولیس بڑھادی گئی تھی ـــــــ یا پوری دلّی فوجی چھاؤنی میں بدل چکی تھی۔

میں واپس گھر آیا تو نعمان کا فون میرا منتظر تھا۔

''صبا اکرام کا پتہ چل گیا۔''

''کہاں ہیں؟''

ارتضیٰ کریم کے گھر ابھی پاسپورٹ کے سلسلے میں تھانے گئے ہیں۔ شام میں ملاقات ہوگی۔

''شام......'' میں چونک گیا۔ ''نعمان! کیا شام میں جانا مناسب ہوگا؟''

''کیوں؟''

''کل پندرہ اگست ہے۔''

اس طرف سے ہنسی کی آواز آئی۔ کہا گیا۔

''گھبرایئے مت۔ ہم کل آزاد ہوں گے۔ جبکہ......''

''میں سمجھا نہیں۔''

آج 14؍اگست ہے۔ آج صبا اکرام آزاد ہو چکے ہیں۔ ہماری آزادی میں ایک دن باقی ہے۔''

نعمان ہنس رہے تھے۔ میں نے خاموشی سے فون رکھ دیا۔ شام تک تو آدھا دن گزر جائے گا۔ دلّی یونیورسٹی کے آس پاس کا علاقہ تو یوں بھی اندھیرے میں ڈوبا رہتا ہے۔ پھر قدم قدم پر گشتی پولیس۔ چیک پوسٹ۔ سوالات۔ گھورتی ہوئی پریشان کرنے والی آنکھیں اور ایک عجب طرح کی گھبراہٹ ـــــــ منع کردوں۔ صبا اکرام کا کیا ہے ـــــــ آئے ہیں چلے جائیں گے۔ تحریریں اپنی قسمت کے پالنے میں سوتی جاگتی رہتی ہیں۔

تو قارئین!

یہ کہانی ایک چھوٹے سے واقعے کے ساتھ آپ ہی آپ شروع ہوگئی۔ ایک چھوٹا سا واقعہ ـــــــ جو پتہ نہیں واقعہ تھا بھی یا نہیں۔ مگر مجھے اتنا عجیب وغریب لگا کہ کالنس اور لیپیئر کو

'فریڈم ایٹ مڈنائٹ' لکھتے ہوئے بھی برمنگھم پیلس، یا دس ڈاؤننگ اسٹریٹ بھی نہیں لگ ہوگا۔

تو یہ کہانی خود بخود شروع ہوئی۔14/اگست، شام 8 بجے۔ دلّی یونیورسٹی ـــــــ ارتضیٰ کریم کے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے۔صبا اکرام کی آزادی ختم ہونے میں چار گھنٹے رہ گئے تھے اور چار ہی گھنٹے بعد ہماری آزادی شروع ہونے والی تھی......

○○

بارش تیز ہوگئی تھی۔سڑک پر،دو ایک موڑ پر کافی پانی جمع تھا ـــــــ ڈرائیور ببلو نے مڑ کر دیکھا۔

''جلدی واپس آجائیں گے نا؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟'' نعمان پوچھا۔''

''رات میں پولیس والے پریشان کرتے ہیں۔''

ببلو نے زور سے بریک لگایا تھا۔ہم چیک پوسٹ کے پاس کھڑے تھے۔برساتی پہنے اور فیلٹ ہیٹ لگائے پولیس والے نے ہمیں اشارے سے روکا۔ میں نے شیشہ اُٹھایا۔گاڑی کے آگے لکھا ہوا 'PRESS' اشارے سے پولیس والے کو دکھایا۔ پولیس والا شریف آدمی تھا۔ پوچھا۔''کہاں جارہے ہیں آپ؟''

یہ رسمی سا سوال تھا۔اس سوال میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی۔لیکن یہ سوال اہم اس لئے تھا کہ آج 14/اگست کی شام ہے ـــــــ اور چار گھنٹے بعد 15/اگست کی شروعات ہونے والی ہے۔

میں مسکرادیا۔''سچ بتادوں۔''

پولیس والے کے لئے اب چونکنے کی باری تھی ـــــــ

''ایک پاکستانی دوست سے ملنے جارہا ہوں۔''

''میرا بھی سلام کہئے گا۔میرے باپ بھی لاہور کے رہنے والے تھے۔''

پولیس والا ہٹ چکا تھا۔ میں سناٹے میں تھا۔ میں نے نعمان کو دیکھا، پھر شیشہ اگر دیا۔

نعمان آہستہ سے بولے۔ ''دشمنی صرف سیاست کی کتابوں میں اگتی ہے۔ سیاست کے باہر سب ایک ہیں۔''

ٹھیک پانچ منٹ بعد ہم ارتضیٰ کریم کے ڈرائنگ روم میں تھے۔ وہ شفیق، مہربان چہرہ میرے سامنے تھا اور میں ہر پل حیرتوں کی بارش کر رہا تھا۔

'' آپ صبا اکرام ہیں۔ نہیں، آپ مسرور بھائی ہیں۔ میرے بڑے بھائی آرہ والے۔ پروفیسر مسرور آروی۔ آپ تو ہندوستان کے کسی بھی شہر کے رہنے والے ہو سکتے ہیں۔ بڑے بھائی، باپ، دوست......''

''پاکستانیوں کے سینگ نہیں ہوتی ــــــ'' ارتضیٰ ہنستے ہیں۔

''سینگ بنادی گئی ہے ــــــ'' نعمان کے چہرے پر سناٹا ہے۔

باہر بارش ہو رہی ہے۔ ڈرائنگ روم سے چار قدم کے فاصلے پر کھڑکی ہے۔

'' کیا ہم سنگیت کی لہروں پر تیر سکتے ہیں!''

میں کھڑکی کے قریب آیا ہوں۔ '' صبا بھائی، بارش آپ کے یہاں بھی ہوتی ہے؟''

وہ چونکتے ہیں، چہرے کا رنگ ذرا سا بدلا ہے۔

''میرا مطلب، 14/اگست، آپ کے یہاں بارش نہیں ہو سکتی۔''

'' کیوں؟''

' کیوں کہ آپ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی......' اس وقت کی چالیس کروڑ آبادی کا غلط حل نکال کر چلے گئے۔''

ارتضیٰ دھیرے سے بولے۔ ''تیس کروڑ ہندو اور دس کروڑ مسلمان۔ مسلمان اسلامی حکومت کی مانگ کر رہے تھے۔ مسلم لیگ کا کہنا تھا، کانگریس تیس کروڑ ہندوؤں کے لئے بنی ہے۔ برٹین دو مختلف نظریے کی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ اور بالآخر......''

نعمان نے آنکھوں پر پڑی ہوئی گرد صاف کی ــــــ ''اس رات بھی بارش ہوئی

تھی۔ آدھی رات۔ آدھی رات کا سناٹا جب دو قومی نظریے پر دو مختلف ملکوں کی مہر لگا رہا تھا......"
"آپ نے محبتیں ختم کر دیں......"

باہر بارش کی رم جھم جاری رہی۔ میں جذباتی پاگل پن کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ "ہم لکھتے ہیں۔ ہر بار سوچتے ہیں ــــ لکھنے سے دنیا بدل جائے گی۔ سچ کہئے گا صبا بھائی، دنیا بدلی؟ کتنی بدلی دنیا۔ ہندوستان میں؟ پاکستان میں؟ آپ بھی تو لکھتے ہیں۔ دلوں کو جوڑنے میں ہر بار ناکام رہے ہیں ہم...... آپ آتے ہیں، ہم دل بچھانا چاہتے ہیں مگر...... آزاد ہوتے ہوتے ایک غلام احساس ہم پر حاوی ہو جاتا ہے۔ دل، دماغ کی سننے لگتا ہے اور دماغ کہتا ہے ــــ دشمنوں کی طرف محبت کی نظر ڈالنا بھی جرم ہے۔"

"ملک تقسیم کیا ہوا۔ ہم تقسیم ہو گئے۔ دل تقسیم ہو گیا۔ رشتے ختم ہو گئے۔ ارتضیٰ ٹھنڈا سانس بھرتے ہیں۔

صبا آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس بڑھتے ہیں۔

"آپ کو، ارتضیٰ کو، ایک مدت سے سب کو پڑھتا رہا۔ سب سے ملنے کی خواہش ہوتی تھی۔ سب سے بڑھ کر ہندوستان سے...... اپنی خوشبو سے...... مٹی سے......"

وہ ہتھیلی کھڑکی سے باہر لے جاتے ہیں۔ بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ ہتھیلیوں پر گر رہی ہیں۔ ایک لمحہ کو سناٹا چھا جاتا ہے۔ صبا بھائی پھر شروع ہو جاتے ہیں۔ "ہندوستان تو ہر بار، ہر لمحہ نظروں کے آگے ہے۔ فلم کی بات چلتی ہے تو 'مغلِ اعظم'......"

نعمان درمیان میں بات کاٹتے ہیں ــــ اکبر ہم نے رکھ لیا، انارکلی آپ لے گئے۔ غالب ہم نے رکھ لیا...... اقبال کو تو آپ لے گئے...... کمبختوں نے ادب کو بھی نہیں بخشا۔

ارتضیٰ اداس ہوتے ہیں۔ سیاست نے 'مغلِ اعظم' کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے۔ اکبر کو آگرہ میں چھوڑ دیا اور زنجیروں میں جکڑی سلیم کی محبت انارکلی کو آپ لاہور لے گئے۔"

"لاہور...... انارکلی...... انارکلی بازار......" بھیگی ہوئی ہتھیلیاں شرٹ میں پونچھتے ہوئے صبا واپس آ کر اپنی کرسی سنبھالتے ہیں۔

"لاہور دیکھا ہے آپ نے۔ مغل بادشاہوں کی آدھی نشانیاں یہاں رہ گئی ہیں ــــ

آدھی۔ جیسے الف لیلوی حسن ہوتا ہے۔ مغل دستکاروں اور کاریگروں نے لاہور کی تعمیر میں اپنا فن دل کھول کر لٹایا ہے......

آواز کمزور ہے۔ صبا تقسیم کے کرب سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ اورنگ زیب کی جامع مسجد، اکبر کے قلعے۔۔۔۔۔۔ نور جہاں کا مزار اور معصوم، محبت کی یادگار اور انارکلی کا مقبرہ۔ شہزادے سے محبت کرنے کے جرم میں، جسے دیوار میں چنوادیا گیا تھا، اور شالیمار باغ کے گنگناتے فوارے...... لیکن اب یہ فوارے چیخ رہے ہیں۔ ان میں کشمیر کا لہو اتر آیا ہے۔

کشمیر۔۔۔۔۔۔ ایک بار پھر سناٹا ہے۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر کوئی بھی بات کرنے کو تیار نہیں۔ ہم میں سے ہر آدمی اپنی اپنی حب الوطنی کے قصیدے پڑھنے کے لئے مجبور ہے۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے......'' میری نظریں جھکی ہیں۔ ''ہم پہلے بھی آگے بڑھے۔ دوستی کی بس لے کر۔۔۔۔۔۔ ہم نے آگرہ میں دعوت دی۔ میزبانی کی حد سے تجاوز کر گئے۔ آپ معزز مہمان تھے۔ سر آنکھوں پر بٹھایا۔ آپ کو نہرو والی حویلی بھی دکھائی اور آپ ناکامی کا تحفہ دے کر چلے گئے۔''

ارتضیٰ آگے بڑھتے ہیں۔ بارش رک گئی ہے۔

نعمان نظر اٹھا کر مجھے دیکھتے ہیں۔ مجھے احساس ہے۔ ہم سیاست کی ان خبروں پر ایک دوسرے کی ایمانداری نہیں خرید سکتے۔ نعمان ایک بار پھر مسکراہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ''کچھ دیر بعد ہم آزاد ہو جائیں گے۔''

''مطلب؟'' صبا چونکتے ہیں۔

''گھڑی دیکھئے۔ آزاد ہونے میں ایک گھنٹہ رہ گیا ہے۔''

''اوہ یعنی ہماری آزادی ختم ہونے میں......''

ارتضیٰ پریشان ہیں۔ ''ملازم ابھی تک نہیں آیا۔''

''کیوں؟''

''وہ...... آج منگل ہے نا۔ منگل کے روز دلّی میں گوشت نہیں ملتا۔ ہوٹل بھیجا ہے گوشت لانے کے لئے۔ آپ سب کھانا کھا کے جائیں گے۔''

''گوشت۔'' صبا مسکراتے ہیں۔ ''گوشت کی تکلیف کیوں کی۔ گوشت تو وہاں ہم کھاتے ہی رہتے ہیں۔ اب تو انسانی گوشت بھی سستے ہو گئے ہیں......'' کہتے کہتے صبا ٹھہر گئے

ہیں۔

نعمان قہقہہ لگاتے ہیں ـــــ پاکستان اپنے ساتھ گوشت لے گیا۔ سبزیاں ہمارے حصہ میں چھوڑ گیا۔"

"گوشت کی ہزار قسمیں ہوٹلوں میں مل جائیں گی۔ مگر اچھی سبزی کے لئے......" صبا اکرام مسکراتے ہیں۔

"ملازم نہیں آیا۔ آپ لوگوں کو جانا بھی ہے۔"

"جانا ہے تو کیا ہوا۔ میں چھوڑ دوں گا۔"

نعمان یاد دولاتے ہیں۔

'15/ اگست...... جشن آزادی کی 54 ویں سالگرہ...... دہشت گردی کا خوف۔ دتی پولیس چھاؤنی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ قدم قدم پر پولیس۔ کسی پولیس والے نے پوچھ لیا تو...... ساتھ میں کون ہے؟ جواب سننے کے بعد اس کے چہرے کا رنگ بدل جائے گا۔ پا...... کس...... تا...... نی؟ جس کی وجہ سے دتی میں ریڈ الرٹ کردی گئی ہے۔ آتنک وادی۔ کشمیر کے گھس پیٹھیے......'

"چلنا چاہئے۔" نعمان کے قہقہے آہستہ آہستہ کمزور پڑ رہے ہیں ـــــ باہر بارش بند ہو چکی ہے۔ رات کافی ہوگئی ہے۔ ارتضیٰ کا ملازم واپس آچکا ہے۔ اس نے مژدہ سنا دیا۔ 15/ اگست کی وجہ سے گوشت نہیں ملا۔

ارتضیٰ کہتے ہیں ـــــ سبزی پر گزارہ کرنا ہوگا۔

OO

آہ! سب بے معنی ہے۔ سب کچھ کتنا الٹا ہے۔ کیوں ذوقی؟"

کھانے کی میز پر نعمان کے اس اچانک سوال نے خاموشی کا قتل کردیا ہے ـــــ نگاہیں نعمان کے چہرے پر جم گئی ہی۔ نعمان نے یکلخت سب کے چہرے کو دیکھا۔ آواز میں کپکپی شامل تھی۔" جو ہم نہیں چاہتے، وہی ہمیں دیا جاتا ہے اور جو ہم چاہتے ہیں......"

صبا کی نگاہیں اٹھتی ہیں، پھر جھک جاتی ہیں ـــــ

نعمان کی بات جاری ہے ـــــ کتنی عجیب بات ہے۔ ہے نا! دو ملکوں کے درمیان

صرف تقسیم نہیں ہوئی، گوشت اور سبزی کا بھی فرق آ گیا۔ وہاں گوشت ہی گوشت ہے اور صبا سبزی کھانا چاہتے ہیں ــــــ ارتضیٰ اس بات کو جانتے ہیں مگر مہمان نوازی کا طریقہ ہے یا...... وہ گوشت منگانے کے لئے باہر آدمی بھیجتے ہیں۔ آدمی خالی ہاتھ لوٹ آتا ہے ــــــ ہم ہر بار خالی رہ جاتے ہیں۔ کیا نہیں! آہ، ہم محبت چاہتے ہیں ــــــ محبت مانگتے ہیں۔ مگر ہر بار سرحد پار سے ہمیں وہ چیز بھیجی جاتی ہے جو قبول نہیں......!

ماحول میں ایک لمحہ کو سناٹا چھا گیا ہے۔

صبا کے ہاتھ کھاتے کھاتے ٹھہر گئے ہیں۔ یہاں آنکھوں میں، بنتے بنتے آنسو کا ایک موٹا قطرہ کانپ گیا ہے......

''منگل کے روز گوشت نہیں ملتا۔'' صبا آہستہ سے دہراتے ہیں۔

مجھے غصہ آتا ہے۔ ''گوشت ملنا نہیں چاہئے۔ گوشت کا بازار بند ہونا چاہئے۔''

پھر کسی نے کچھ بھی نہیں بولا۔

ماحول میں سناٹا چھا گیا ہے۔

OO

بارش رک گئی ہے۔ سڑک سناٹے میں ڈوبی ہے۔ کبھی کبھی کتوں کا شور، رات کے اندھیرے میں گونج جاتا ہے ــــــ ببلو گاڑی ڈرائیو کر رہا ہے۔ ہم سب خاموش ہیں۔ صبا کو ان کے ہوٹل چھوڑنا ہے۔ پھر......

سڑک ابھی بھی بارش سے بھیگی ہوئی ہے۔ آگے وہی چیک پوسٹ ہے۔ شیشہ گراتا ہوں۔ انسپکٹر نے کیپ اتار لیا ہے۔ لیکن یہ وہی انسپکٹر ہے۔ میں ببلو کو ایک منٹ کے لئے گاڑی روکنے کو کہتا ہوں۔ انسپکٹر میری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ میں صبا کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

''یہ وہی صاحب ہیں جو......''

''پاکستان سے......'' انسپکٹر کے ہاتھ سلام کو اٹھ گئے ہیں۔ ''لاہور کو میرا سلام پہنچائیے گا۔''

صبا چونک کر میری طرف دیکھتے ہیں۔

نعمان گھڑی پر نظر ڈالتے ہیں۔" مبارک ہو، ہم آزاد ہو گئے۔"

صبا کا ہوٹل آ گیا ہے۔ صبا بجھے بجھے سے لگ رہے ہیں____ گاڑی سے اتر کر میں اور نعمان صبا کے گلے لگتے ہیں۔

"انشاء اللہ ملاقات ہوتی رہے گی......"

"شاید......شاید نہیں......"

"ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔" صبا کے الفاظ تھرتھرا رہے ہیں____ "گاندھی جی ملک کی تقسیم کے خلاف تھے۔ ایک بار ایک مسلم خاتون نے گاندھی جی کو برا بھلا کہتے ہوئے پوچھا...... اگر دو بھائی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، اور پھر الگ ہو کر دو الگ الگ گھروں میں رہنا چاہیں تو کیا آپ انہیں ایسا کرنے سے روکنا چاہیں گے؟"

صبا نے میرا اور نعمان کا چہرہ دیکھا____ پھر سر جھکا لیا____ گاندھی جی نے فرمایا۔

"کاش ہم دو بھائیوں کی طرح......دو بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہو سکتے۔"

صبا ٹھہرے نہیں۔ مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ ہوٹل کی لابی میں تیز تیز دوڑتے چلے گئے۔

آسمان میں پھر چھید ہو گیا تھا۔ ٹپ سے ایک بوند گری تھی۔ بوند میں نے ہتھیلی میں جمع کر لی تھی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

گاڑی اندھیرے میں بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

ooo

الرجی بنام ہوڑہ کے سوپن رائے

ہوڑہ اور سیم کے لئے

"چلتے چلتے ہم اچانک الرجی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ کیا نہیں؟ جیسے مٹی کے ڈھیر۔ سر سراتی ہوا میں تیرتی ہوئی دھول اور...... سامنے والا آدمی۔"

وہ ہنس رہا تھا۔ ہنسنے کا عمل اتنا بھونڈا تھا کہ اس کی ناک ایک بار پھر سے لال سرخ ہو اٹھی تھی۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ پانچ فٹ، دو انچ۔ ناک لمبی تھی۔ الرجی کے شدید حملے سے وہ اتنی زیادہ سرخ دکھنے لگتی کہ احساس ہوتا، لال رنگ سے پینٹ کردی گئی ہو۔ ایسی ناک عام طور پر امریکن کی ہوتی ہے اور وہ بھی زیادہ تر ایسے موقعوں پر ہو جاتی ہے، جب ورلڈ ٹریڈ سینٹر یا پنٹاگن پر دہشت پسندوں کا حملہ ہو گیا ہو۔

وہ امریکن نہیں تھا۔ ہندوستانی تھا۔ بنگال قحط کے دنوں کی پیداوار۔ ہنستے ہنستے بنگال قحط کی کہانیاں وہ کچھ اس طرح سناتا کہ سامنے والا ہونٹ گول گول کر کے ہنستا رہتا تھا...... ہوڑہ، فیل خانے کی بے شمار گلیوں میں سے ایک، یعنی گلی نمبر 13 میں اس کا ایک چھوٹا سا ایک منزلہ مکان تھا۔ بچپن انہی گلیوں کے درمیان گزرا۔ گھر میں ایک دادی تھیں۔ آخروٹ کی طرح جھرّی دار چہرہ۔ وہ اس مہربان شفیق چہرے میں سما گیا تھا۔

'ارے سوپن کہاں ہے رے......'

سوپن دادی کی جھریوں کو غور سے دیکھتا ہے۔ کھانے کی تھال لے کر دادی اس کے پیچھے پیچھے دوڑتی ہیں۔ وہ آگے آگے۔ پھر اس لکا چھپی میں اس کی شرٹ کا کوئی حصہ دادی کے ہتھیلیوں میں الجھ جاتا ہے۔

"کیوں رے بدمعاش......"

دادی غصہ ہو رہی ہیں۔ وہ دادی کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ ٹھہاکہ لگاتا ہے۔

''کیوں ہنسا رے......؟''

''تیری جھریاں دادی۔ چہرے کی جھرّیاں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ پورا گھنا جنگل بن جاتی ہیں۔ میں اس جنگل میں چھپ جاتا ہوں۔''

''اچھا۔ آ۔ کھانا کھالے۔ درخت کاٹے جارہے ہیں۔ ایک دن یہ درخت بھی...... تیرا جنگل چھپ جائے گا۔''

OO

اور ایک دن دادی کی جھرّیوں کا جنگل کھوگیا۔ گھر کے پچھم دروازے، مٹی کی ایک کوٹھری تھی۔ دادی کی خاص کوٹھری۔ گھر کے دروازے نیچے تھے۔ دادی کی، مٹی کی کوٹھری ہمیشہ ٹھنڈی رہتی۔ بارہ ماس۔ کوٹھری کے آگے اوسارا تھا۔ اوسارے میں سیم کے لتر نے چاروں طرف اپنی ڈالیاں ڈال رکھی تھیں۔ جھریوں کے جنگل گم ہونے کا صدمہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ وہ باہر نکل آیا۔ ذرا فاصلے پر 'امرائیوں' کے ہرے، تاڑ کے جھنڈ پھیلے تھے۔ وہ آگے بڑھ کر، بانس کے جھنڈ سے ہوتا ہوا، ندی کے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ گیا۔ پہلی بار اسے اپنا ہوڑہ بالکل بیکار نظر آیا۔ لوگ چلے کیوں جاتے ہیں؟ وہ بھی دادی جیسے لوگ۔ ندی کے پانی میں اس کا چہرہ غائب تھا۔ ندی کے پانی میں اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ ناک کبھی لال غبارے کی طرح پھول جاتی۔ کبھی پچک جاتی۔ وہ ندی میں اس وقت تک لال غبارے جیسی ناک کو، پھولتا پچکتا دیکھتا رہا، جب تک کہ آس پاس کے مینڈکوں نے ٹرّانا بند نہیں کردیا۔

OO

وہ گھر آیا تو جیسے بہت سارے مینڈک گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ مینڈک سارے گھر میں پھدک رہے تھے۔

''ہٹو...... ہٹو...... ابھی دادی ہوتی تو......!''

سوپن رائے نے جھوٹی ہنسی ہنسنے کی کوشش کی۔ دھت تیرے کی...... مینڈک کہاں ہیں۔ وہ تو بدبو آرہی ہے۔ سدیپ رائے باسی پھلوں کا کاروبار کرتے تھے۔ فیل خانہ نمبر ایک کے

پاس ایک ساتھ، چار پانچ پھلوں کی دکانیں تھیں۔ ان میں سے ایک دکان سدیپ رائے کی تھی۔ پھلوں کے ٹوکرے اکثر اُسارے کے پاس والے اسٹور میں رکھے ہوتے۔ اسے یاد آیا، دادی چرا چرا کر ایسے کئی پھل صاف کر جاتی تھیں۔ بعد میں سدیپ رائے ان پھلوں کی گنتی کم پڑ جانے پر کافی شور مچایا کرتے۔ مگر دادی سے کون پنگا لیتا۔ کس کی ہمت تھی؟

دادی کی موت ایک بہانہ تھی۔ دراصل سوپن رائے اور الرجی کی ہلکی ہلکی شروعات بھی یہیں سے ہوئی تھی۔ دادی کی موت کے بعد یکا یک تین باتیں سامنے آئی تھیں۔ پہلا، اسے گھر میں مینڈک پھدکتے نظر آئے۔ دوسرا، پھلوں کی ٹوکری سے بدبو اٹھتی محسوس کی۔ لیکن تیسری بات کا تعلق ہوڑہ چھوڑ دینے کے خیال سے تھا۔ جیسے سوپن رائے کو پہلی بار احساس ہوا، دادی زندہ کب تھیں؟ اور اگر دادی چلی گئی ہیں تو اس گھر میں زندہ کون ہے؟ جوانی کی دہلیز پر کھڑی تین بہنیں۔ اور 'اپنے آپ' کے حجرے میں گم سدیپ رائے۔ دبلے پتلے۔ جھکی ہوئی کمر۔ دادی کہتی تھیں...... جینا ایک آرٹ ہے۔ ہمیشہ خود کے لئے جیو۔ کیونکہ لڑنا بھی تمہیں ہے۔ جیتنا اور ہارنا بھی۔ ہاں! ہارنے والی بات کدیکا کو دیکھ کر اسے قبول نہیں ہوتی تھی۔

اس رات کی ایک ایک بات اسے یاد ہے۔ گیارہ بجے کے قریب بارش نے ذرا سا رنگ دکھایا تھا۔ دو چار چھینٹے برسے۔ پھر بارش تھم گئی۔ رک رک کر تین چار بار ایسے چھینٹے پڑے۔ پھر آسمان صاف ہو گیا۔ سوپن رائے کئی بار اُسارے میں گیا۔ پھر، باہر کا کواڑ کھول کر باہر بھی چلا گیا۔ کتوں اور سوئے پڑے آدمیوں میں فرق نہیں کر سکا تو لوٹ آیا۔ کواڑ بند۔ پیٹھ پر چبھتی ہوئی آنکھیں محسوس کیں تو مڑ کر دیکھا۔ سدیپ رائے کھڑے تھے۔

''باہر کیوں گیا تھا؟''

''ایسے ہی!''

''ایسے ہی مطلب؟''

''مینڈک ٹرا رہے تھے۔ پھل سڑ رہے تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ ناک پر شاید کسی مچھر نے کاٹ لیا تھا۔ دیکھئے تو ناک پر پھنسی......''

سدیپ رائے نے دیکھا۔ ناک پھولی ہوئی اور سرخ تھی۔

''ہاں مچھر نے کاٹ لیا ہے۔ اُسارے میں سیم کے لتر پھیلے ہیں۔ مچھر تو آئیں گے

ہی۔''

پھر سوپن رائے نے انتظار نہیں کیا۔ سیم کے لتر کاٹ دیئے۔ ہوڑہ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ کہاں جانا ہے، یہ بھی طے کرلیا۔ دادی کی آخری بات ذہن کے پردے پر گونج رہی تھی ــــــ ہر آدمی خود کے لئے جیتا ہے......

سوپن رائے مطمئن تھا۔ اب صرف کنیکا کو اپنے فیصلے کے بارے میں بتانا بھر رہ گیا تھا۔ کنیکا ــــــ کنیکا رائے۔ تب ہوڑہ برج سے فیل خانے تک، شبو گھاٹ سے علی پور، چائے کے ڈھابے تک ــــــ قد چھوٹا تھا۔ اس کے جتنا ہی۔ کچھ کچھ جیا بھادری سے ملتی ہوئی۔ شرمیلی، فکرمند اور ــــــ جوٹ ملس میں کام کرتی تھی۔ باپ بوڑھا تھا۔ بھائی پڑھ رہا تھا۔ گھر کنیکا کی آمدنی سے چلتا تھا۔

کنیکا کی ایک عادت اور بھی تھی۔ وہ دل دکھانے پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ کہتی تھی۔ دل بہت 'سینسیٹو' ہوتا ہے۔ جتنا چھپا سکتے ہو، چھپانا چاہئے۔

مگر اس دن کنیکا دل نہیں چھپا پائی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔

'تو تم جارہے ہو؟'

......ہاں۔

'دلّی والوں کے پاس دل نہیں ہوتا ہے!'

'......جانتا ہوں۔'

'واپس آؤ گے؟'

'......کہہ نہیں سکتا۔'

'یعنی، نہیں آؤ گے۔'

'......یہی لگتا ہے۔'

'میں یاد......' وہ کہتی کہتی ٹھہر گئی۔

'چائے پیو گے......؟'

دونوں بس پر چڑھ گئے۔ علی پور کا وہی، چائے کا ڈھابہ۔ چائے کے ڈھابے تک دونوں چپ چپ رہے۔ چائے کا پیسہ دینے کے لئے سوپن نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کنیکا نے

روک دیا۔

'نہیں۔ رہنے دو۔ آج اصول مت توڑو.....'

'اوہ!'

اسے یاد آیا۔ چائے کا پیسہ ہمیشہ کنیکا ہی دیا کرتی ہے۔ جیسے اس نے کنیکا سے دوستی کر کے اس پر احسان کیا ہو۔ ہمیشہ مول تول کرنے والا۔ کنیکا باقی پیسے پرس میں ڈالتی ہوئی اس کی طرف مڑی......

'چٹھی نہیں لکھو گے۔ آؤ گے نہیں۔ ابھی سے 'دی اینڈ' سمجھ لوں۔ ٹھہرو۔ ہم 'بائے بائے' نہیں کہیں گے۔ بس، آگے موڑ سے اجنبیوں کی طرح الگ الگ راستوں پر مڑ جائیں گے۔ ویسے بھی ہماری بس الگ الگ روٹ کی ہے کیو؟ اتنا ہی ساتھ تھا نا ہمارا۔'

وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ سوپن رائے نے بھی آواز لگانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

آہستہ آہستہ دلّی آئے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا۔ نوکری، پروموشن سے لے کر الرجی، ناک کو بار بار سرخ ہونے اور پہلی بار دوست بنے کرشن ریڈی سے ملاقات کی 'تفصیل' کوئی خاص نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا، پرندے اڑنے کے لئے ہوتے ہیں اور دادی کہتی تھیں ____ اڑنے گرنے کے لئے پرندہ خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ دلّی آنے کے بعد 'الرجی' کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ پہلے پہل دھول سے ____ پھر بارش ____ پھر پھول ____ پھر دوست ____ پھر جذبے۔ پھر.....سوپن رائے کو الرجی کی یہ 'تفصیل' اس لئے بھی پسند نہیں ہے کہ اس سے ناک کے، بھیانک طور پر سرخ ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

سوپن رائے کو ہنسی آتی ہے۔ پہلی بار نئی دلّی ریلوے اسٹیشن پہنچنے پر یہ ناک اتنی سرخ ہو گئی تھی کہ کچھ لوگ گھبرا کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ ناک پر چبھتی ڈھیر ساری آنکھوں سے گھبرا کر، وہ تیزی سے ویٹنگ روم کی طرف بھاگا تھا۔ بیسن پر لگے آئینے میں چہرہ دیکھا۔ منہ پر پانی کے دو ایک چھینٹے مارے۔ مگر یہ کیا.....؟

ناک کے پاس لال رنگ لگ گیا ہے کیا؟

لیکن لال رنگ آیا کہاں سے؟ جیب میں لال رنگ کا رومال بھی نہیں۔ جس کا کچّا رنگ منہ پونچھنے کے بہانے، ناک پر اپنے ہونے کی چغلی کھا دے۔ ناک کے پاس چھوٹی سی 'پھنسی'

نکل گئی تھی۔ پہلے اسے احساس ہوا، شاید اسے زکام ہوگیا ہے۔ سردی لگ گئی ہے۔ کولکاتا سے دلّی۔ دوالگ الگ جگہ کا ٹمپریچر۔ مگر نہیں۔ نہ سردی لگی تھی۔ نہ کھانسی تھی۔ ہاں، ناک سرخ تھی۔

'کھوں...... کھوں......' سوپن رائے نے زبردستی کھانسنے کی کوشش کی، تاکہ سرخ ناک کے لئے اچھی سی تسلی جمع کی جاسکے۔

لیکن...... ہوڑہ برج، سیم کے لتر سے دلّی میں جمنے رمنے تک ناک کے سرخ ہونے کا سلسلہ بڑھتا رہا۔ دفتر کے لئے اس کی ناک مذاق سے الگ، اڑتی شخصیت کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ کرشنا کو چھوڑ کر دفتر کی لڑکیوں اور دوستوں نے بھی سرخ ناک کے نام پر چڑانا بند کردیا تھا۔ دراصل رات کے اندھیرے میں اس کی ناک ریڈیم کی طرح چمکتی تھی۔ ناک کے پاس کی پھنسی بڑی ہوگئی تھی، کرشنا اس 'نکسیر' کے بارے میں کہتا تھا۔

'خوش قسمت ہو۔ نکسیر کبھی بھی پھوٹ سکتی ہے!'

'لیکن اس میں قسمت کو......؟'

'ناک قسمت سے ملتی ہے۔ کرشنا کا چہرہ سپاٹ تھا...... ساری جنگ ناک کے لئے ہے۔ وہ بھی ایسی موٹی، پھولی اور سرخ ناک...... تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ تمہاری ناک......'

'ہاں ناک......؟'

امریکیوں سے ملتی ہے۔'

'امریکیوں سے؟'

کرشنا کھٹے بیر کھا رہا تھا...... 'اس معاملے میں خوش قسمت ہو۔ روسی یا انڈین نہیں۔ سیدھے امریکی۔ چینیوں کی ناک بھی سرخ ہوتی ہے اور سنو، چینی اور امریکی زیادہ جذباتی نہیں ہوتے۔ ہماری طرح۔'

'مطلب......؟'

'یہاں بھی خوش قسمت ہو۔ ناک کٹوا کر بھی آجاؤ تو فرق نہیں پڑے گا۔ مذاق کیا یار۔ بُرا مت مان۔ لیکن دیکھنا۔ تو ایک دن کافی اونچا اڑے گا۔'

سوپن رائے نے مذاق میں کرشنا کا ہاتھ تھاما۔ پکڑے پکڑے دفتر کی چھت تک لے آیا۔ وہ دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتا ہوا تیز تیز چیخ رہا تھا......

'دیکھ...... دیکھ...... میں اڑ رہا ہوں......'

'بس...... سالا......'

'گالی کیوں بکی۔'

'کولکتیا۔ ہر جگہ منافع دیکھتا ہے۔ اُڑ تو ایسے رہا ہے جیسے ابھی اپنا ٹکٹ لگا کر پیسے وصول کرے گا......'

آئس کریم کھا کر ٹہلتے ہوئے کچھ دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی رہی پھر اس خاموشی کو سوپن رائے نے توڑا۔

'کیا میں ایسا ہی ہوں؟'

'مطلب۔'

'مطلب، جیسا کہ تو سوچتا ہے۔'

'میں کیا سوچتا ہوں......' کرشنا کی آئس کریم بہہ گئی تھی۔ اس کی آواز سپاٹ تھی۔

'تیری ناک سرخ ہے۔ نکسیر ہے۔ سرخ ناک والے ہمیشہ دھوکہ دیتے ہیں اور......'

'اور کیا......'

'کچھ نہیں......'

'کچھ کیسے نہیں......' سوپن رائے کو الرجی محسوس ہو رہی تھی...... ڈسٹ ہے نا، ڈسٹ سے مجھے الرجی ہے۔ ناک پھول جاتی ہے...... اور......'

'سرخ ہو جاتی ہے' کرشنا نے بتایا...... گھر سے چٹھی آئی ہے۔ ماں بیمار ہے۔ وہ بغیر بتائے گھر جانا چاہتا ہے۔ تو میرا کام سنبھال لے گا نا۔ بیماری کا بہانہ بنا دینا۔ بول تو، میں دو ایک کاغذ پر دستخط چھوڑ جاؤں۔ ضرورت پڑے تو میرے نام سے اپیلی کیشنز لکھ کر جمع کر دینا...... کر دے گا......؟

'ہاں۔'

'وہ چپ چاپ ابھی بھی آئس کریم چوس رہا تھا۔

○○

دلّی کی دو تین برسوں کی زندگی میں اس نے جان لیا تھا ـــــ اُڑنا ہے، تو اُڑنے کے 'ڈیکورم' کو سمجھنا ہوگا۔ اُڑنا سب سے مشکل کام ہے۔ اُڑتے ہوئے آدمی کی نظر صرف اُڑان پر رہتی ہے۔ اڑتے ہوئے آپ بہت سے قاعدے قانون توڑتے ہیں۔ اس لئے کہ توڑنا پڑتا ہے...... اور اس نے بھی بہت پُر امید ہو کر اپنے اڑنے کے راستے کو آسان کر دیا تھا۔ یعنی پہلی کامیابی قبول کرتے ہوئے......

کرشنا حیدر آباد سے واپس نہیں لوٹا......

یہ اس کی پہلی جیت تھی۔ کرشنا اس سے دو سال سینئر تھا۔ کرشنا کے اپلی کیشنز کا استعمال اس نے اپنے اڑنے کے راستے میں کیا......

پہلی جیت سے اُس نے کئی نتیجے نکالے تھے۔ پہلے جیت سے اس نے کامیابی کا نسخہ پالیا تھا...... جیتنا ہے تو...... ارے زندگے اسی کا نام ہے۔ ایک چھوٹی سی کامیاب زندگی میں احساس اور جذبات کے تھپڑے نہیں ہونے چاہئیں ـــــ اور جسے اُڑنا ہوتا ہے، وہ صرف اپنی اُڑان پہچانتے ہیں......

'دیکھو...... دیکھو۔ میں اڑ رہا ہوں......'

سوپن رائے جیسے قطب مینار کی بلندی پر کھڑے چیخ رہے تھے......

'سنو بھائی...... سنو...... دیکھو میں اڑ رہا ہوں۔'

○○

جنگل کٹ رہے ہیں

دادی کی جھریوں کا جنگل، پچھم دروازہ، مٹی کی کوٹھری ـــــ اُسارے کی سیم اور آم کی امرائیاں...... وقت گزرنے کے ساتھ، وقت کی ندی سے یہ سارے چہرے، یادیں اوجھل ہوتے رہے...... دلّی میں صرف جمنا ندی رہ گئی تھی۔ ہوڑہ برج غائب تھا۔ ہوڑہ کے گھاٹ، ندیاں، نالے غائب تھے...... باسی پھل اور مینڈک سب غائب تھے...... چہرے پر کھجلی ہو رہی تھی...... نہیں، ناک کے پاس......

سوپن رائے کو جھنجھلاہٹ ہوئی......

بارش ہوئی تھی کیا۔ آندھی چلی تھی۔ ضرور گرد اڑی ہوگی۔ لیکن عجیب بات...... ہوڑہ میں تو کبھی الرجی کا احساس اس طرح نہیں ہوا ـــــ باسی پھل، مکھیاں، سیم کے لتر اور گلہری......

بس، دلّی کی طرف کوچ کرتے ہوئے پہلی بار...... اندر، سارے بدن میں اینٹھن ـــــ نہیں 'کھجلی' ہونے لگتی ہے۔ سر بھاری اور بوجھل۔ دماغ میں ہلکا سا درد...... ایک ہلکی سی کھانسی اٹھتی ہے۔ اور ناک کے پاس تیز جلن...... وہ بار بار ناک کھجاتا ہے اور...... ناک لال سرخ ہو جاتی ہے......

لال سرخ، کولکاتا کے سلام کی طرح...... بابو مشائے...... لال سلام...... الرجی سے بچنے کے لئے وہ ڈاکٹر کے پاس بھی گیا۔ ہومیو پیتھ سے ایلوپیتھ کی طرف...... حکیمی، یونانی سے آیورویدک کی طرف......

ہر بار اڑنے کے نتیجے میں یہ کھجلی بڑھ جاتی تھی......

سدیپ رائے نے اس درمیان دو تین بار اسے بلانا چاہا۔ فون سے خط تک۔ "آ جاؤ۔ پھل کی دکانداری چوپٹ ہو گئی ہے۔ ہاتھ تنگ ہیں۔ کچھ پیسے ہوں تو......"

مگر الرجی۔

ایسا نہیں ہے کہ سدیپ رائے کی یاد نہیں آتی تھی۔ مگر ایسے ہر موقع پر الرجی کی گلہری کچے پھلوں پر اپنا نشان چھوڑ جاتی تھی......

اور بس خط کی چند لائنیں...... "کیسے آؤں۔ پریشانیاں ہیں۔ میں ہر بار آنا چاہتا ہوں۔ آخر، آپ ہی نے تو پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے...... بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں آپ کے لئے۔ مگر دلّی تو دلّی ہے۔ دلّی میں سب کچھ ہے دل نہیں ہے...... میرے لئے بھگوان سے پرارتھنا کیجئے۔ پھلوں کا بزنس چوپٹ ہو گیا تو کیا۔ اب آپ کے آرام کا سمے ہے۔ آخر اپنا گھر ہے آپ کے پاس۔ بھگوان بھروسے آرام کیجئے۔"

'مکھی......'

سوپن رائے لکھتے لکھتے چونکتے ہیں ـــــ کم بخت مکھی کہاں سے آئی۔ ہٹ...... ہش...... ہا...... ہا...... مکھی...... بھاگ......

کھجلی بڑھ رہی ہے......

مکھی تنگ کر رہی ہے......

سوپن رائے ایک بار پھر آئینہ کے سامنے کھڑے ہیں......

ناک۔ سچ مچ ناک کتنی لال ہوگئی ہے......

وہ آئینہ کے سامنے کھڑے ہیں...... لیکن آئینے میں سوپن رائے کہاں ہیں۔ یہ تو ایک جوکر کا چہرہ ہے۔ جیسے جوکر وہ سرکس میں دیکھتے رہے ہیں۔ لال لال گول پھولی ہوئی ناک والے جوکر...... سوپن رائے نے گنتی گنی۔ دلّی میں کتنا عرصہ گزر گیا۔ سوپن رائے سے جوکر بنتے ہوئے۔ کتنا عرصہ......؟ آخری بار سدیپ رائے کا خط ملا تھا۔ ''ٹھیک ہے مت آؤ۔ کسی زمانے میں یہاں تھے۔ اس لئے گھر کی جانکاری تمہیں دینی ضروری ہے۔ شاید یاد کرنے سے یاد آجائے، کسی زمانے میں یہاں تمہاری تین بہنیں ہوا کرتی تھیں۔ اب نہیں ہیں۔ کہاں گئیں؟ یہ سوچنا، پوچھنا تمہاری ذمہ داری میں شامل نہیں ہے...... ہو سکے تو گھر میں اپنا حصہ لینے کے لئے آجانا۔ یقیناً، مجھے معاف کرنا۔ لیکن میں پورا گھر تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ تمہاری جگہ میں کسی ٹرسٹ کو دینا پسند کروں گا۔ مگر ایک زمانے میں تم سے رشتہ بھی تھا۔ اس لئے، میں اپنی زندگی تک تمہیں تمہارے حصہ سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔ آخری جملے کڑواہٹ بھرے تھے۔ نہیں معلوم تمہیں یہ خط کیوں لکھ رہا ہوں......'' اس کے بعد کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ یہاں تک کہ تمہارا پتا یا بابا جیسے لفظ۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا، جذباتی ہوا۔ پھر خط چاک کر دیا۔

یہ سب کچھ ویسا تھا، جیسے دلّی آنے کے بعد...... یعنی دلّی، فتح کے ارادے سے آئے ہوئے ایک بنگالی موشائے کا ایک چھوٹا سپنا۔ چھوٹا سا قد اور قد سے قطب مینار ناپنے کا ارادہ...... پتا کا خط پھاڑتے ہوئے اسے کرشنا کی یاد آئی۔ ''تم سیدھے امریکی ہو۔ چینی یا امریکی زندہ جذباتی نہیں ہوتے......''

''س...... سالا......'' سوپن رائے کہتے کہتے ٹھہرا۔ ایک لمحے کو جذبات کی بدلیاں بھی منڈرائیں۔ زندگی کے معاملے میں اس نے کچھ غلط مہرے تو نہیں چلے۔ نہیں۔ مہرے ٹھیک چلے۔ فیل خانے سے ہوڑہ کی گلیوں اور ہوڑہ برج تک، زندگی کے راستے ہی کہاں تھے۔ سیم کی لتر، باسی پھلوں کی بدبو اور بھنبھناتے مچھر...... کیا یہ سوارتھ ہے؟ خود غرضی......

سوپن رائے پہلی بار فلسفوں کے ننگے تار پر چل رہا تھا۔ سوارتھ کیا ہوتا ہے۔ تخلیقی

عمل......ہم ایک 'تخلیق' کر ڈالتے ہیں۔ چلیے ٹھیک ہے۔ پھر اس 'تخلیق' سے اپنے آپ کو ایک سوارتھ یا غرض کے دھاگے سے جوڑتے ہی کیوں ہیں کہ حاصل ہی حاصل ہونا ہے......! اسدیپ رائے اور فیل خانے کے گھرنے یہی کیا تھا۔ لیکن کیوں......اور اگر وہ اپنی ملی ہوئی یہ ایک زندگی خود غرضی سے الگ گزارنے کا خواہشمند ہے تو اس میں غلط کیا ہے۔ غلط یہ ہے کہ وہ خود ایک 'تخلیق' کرے اور اس پر اپنا جذباتی دباؤ بھی بنائے رکھے۔ اس نے صرف اور صرف زندگی کو جذبات سے الگ کیا ہے......

آپسی کشمکش اور ادھیڑ بن میں کئی مہینے اور گزر گئے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ سوپن رائے گھر میں ملنے والے حصے کے لالچ کو چھپا نہیں پائے تھے۔ ٹرسٹ میں کیوں۔ پورا کیوں نہیں؟ ان کے پاس 'لاجک' تھی۔ منطق تھی اور اسی لاجک اور منطق کے رتھ پر سوار ہو کر پتا نہیں کتنے برسوں بعد، ایک بار پھر وہ کولکاتا کی طرف اڑ گئے تھے۔

وہ لڑکی اور کولکاتا

سوپن رائے قدم قدم پر چونک رہا تھا......

روکو......روکو رکشے والے۔

بہاری رکشے والے نے دوڑتے دوڑتے سوپن کا بوجھ اتار پھینکا۔

'اُترو صاحب......'

پیسہ دینے کے بعد بھی وہ پریشان سا اپنے شہر کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہاں تو قبرستان سا سناٹا تھا۔ دو چار برس میں دنیا نہیں بدل جاتی، لیکن یہاں تو سب کچھ بدل گیا تھا۔ محلّہ۔ نہیں یہ وہ محلّہ نہیں تھا۔ پہلے اسے ہوڑہ برج بدلا ہوا نظر آیا۔ پھر فیل خانے کا علاقہ اور اب یہ محلّہ......

سامنے جاتی ہوئی ایک عورت کو روک کر بنگلہ میں بات کرنا چاہی۔

عورت کا چہرہ سپاٹ تھا۔ صاف ظاہر تھا۔' آمی بنگلہ بوجھ بونا۔'

اس بار اس نے انگریزی میں پوچھنا چاہا۔

عورت ٹھہر گئی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ذرا ہنس دی۔

'کیا جاننا چاہتے ہو۔ پہلے لینگویج گم ہوتی ہے۔ پھر لوگ۔ پھر شہر گم ہو جاتا ہے۔'

'وہی تو، یہاں......'
'ابھی محلہ گم ہوا ہے۔'
'گم!'
'غرقاب ہو گیا۔'
'مگر ایسے کسی سیلاب کے بارے میں نہ پڑھا نہ سنا۔'
عورت ہنس رہی تھی۔ محلہ یا شہر سیلاب میں غرقاب نہیں ہوتے۔ پانیوں کے سیلاب میں۔ ایڈیٹ۔ آدمیوں کے سیلاب میں گم ہو جاتے ہیں۔'
'مگر یہاں تو سناٹا ہے۔'
'سیلاب گزر گیا۔ چائے پلاؤ گے......؟'
سوپن کو عورت سے ڈر لگتا تھا۔ مگر یہاں تو مجبوری تھی۔ ایک اچھے سے ریستوراں میں دونوں بیٹھ گئے۔
پہلے یہاں بنگہ ڈھابہ تھا۔'
'ہو گا۔'
عورت اچانک چونک گئی تھی...... 'تمہاری ناک......'
'ہاں ناک......' سوپن کو شرم محسوس ہوئی۔ ناک کا سرخ حصہ اب بدنما زخم لگنے لگا تھا۔
چائے آگئی تھی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی تھے۔
عورت نے بسکٹ چائے میں ڈبوتے ہوئے پوچھا ___ کسی نے تمہاری ناک پر Kiss کیا ہے۔'
نہیں! سوپن کو کرنٹ لگا تھا۔
'کوئی کر بھی نہیں سکتا ہے۔ السر ہے کیا؟'
'نہیں۔ پھوڑا ہے۔'
'اے کائنڈ آف ٹیومر۔ ریڈ ٹیومر۔' عورت بے وجہ ہنسی۔
'ہاں، تم بتا رہی تھی کہ شہر گم ہو جاتا ہے۔'
'شہر نہیں۔ پہلے بھاشا۔ پھر لوگ۔ پھر محلہ۔ پھر شہر۔ تم بنگلہ بولتے تھے نا؟'
'ہاں۔' عورت نے چائے ختم کر لی تھی۔

کہیں دور سے کسی فیکٹری کا سائرن گونجا تھا۔

'یہ جوٹ ملس کا سائرن ہے نا؟'

'جوٹ ملس۔' عورت نے قہقہہ لگایا۔ نام کیا ہے تمہارا۔'

'سوپن...... سوپن رائے۔'

'بھولے ہو...... یا پھر بن رہے ہو ـــــ سنو سوپن، عورت کا چہرہ ایک لمحے کو بھیانک ہو گیا تھا۔

'کہاں کا جوٹ ملس۔ کولکاتا میں اب کوئی جوٹ ملس نہیں ہے۔ سب بند ہو گئے۔ میں نے کہا نا...... یہ شہر گم ہو رہا ہے۔'

'تم...... وہ اُس کے لہجہ پر ایک دم سے چونکا...... تمہاری شکل کچھ کچھ......'

'سب کی شکلیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔'

'ایسا لگتا ہے جیسے تمہیں کہیں دیکھا ہو۔'

'ہو سکتا ہے۔'

وہ بیزاری سے اب بھی اپنے دائیں طرف آدمیوں کے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ 'اُف۔ ہر روز یہ سمندر...... ہر بار نئے لوگ...... نئے چہرے۔ نئے جذبات اور...... نئی لہریں، پرانی لہروں کو روندتی ہوئی چلی جاتی ہیں......'

'تمہارا چہرہ کچھ کچھ......'

عورت اس کی آواز نہیں سن رہی تھی......

'تم کو۔ کہیں......' سوپن رائے کے گلے میں کہیں ہڈی اٹک گئی تھی۔ یاد کیوں نہیں آرہا ہے۔ یہ چہرہ۔ یہ باتیں...... یہ انداز......'

عورت اس بار بگڑ گئی تھی۔ امتحان مت لو۔ امتحان لینے کی کوشش مت کرو۔ سب کچھ بدل چکا ہے۔ یہ شہر تم سے پہچانا نہیں جا رہا ہے اور میں......'

'لیکن تمہارا چہرہ پہچانا ہوا لگ رہا ہے۔'

'غلط فہمی ہے۔'

عورت نے پرس اٹھا لیا۔

'سنو تو......'

عورت ایک لمحے کو پرس کھولتے کھولتے ٹھہری۔ پرس بند کیا۔ ایک لمحے کو جیسے بجلی کوند گئی۔ برسوں پہلے کا ایک منظر آنکھوں میں لہرا گیا۔ سوپن رائے دھک سے رہ گئے تھے۔ علی پور چائے کا ڈھابہ...... کنیکا کی سہمی سہمی آواز...... خط نہیں لکھوگے۔ آؤگے نہیں۔ ابھی سے 'دی اینڈ' سمجھ لوں...... بس آگے موڑ سے اجنبیوں کی طرح الگ الگ راستوں پر مڑ جائیں گے...... بائے بائے نہیں کہیں گے......'

عورت اس کی طرف مڑی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

'چائے کا پیسہ تم ہی دوگے۔'

'ارے سنو...... سنو تو......'

اسے جیسے کچھ یاد آ گیا تھا ____ وہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ عورت تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی ____ تیز دوڑنے کے نتیجے میں وہ بجلی کے پول سے ٹکرایا ____ گرنے اور بے ہوش ہونے تک سوپن رائے صرف اتنا دیکھ سکا کہ......

اس کی نکسیر پھوٹ گئی تھی۔ ناک سے خون نکل رہا تھا...... اور......

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا چکا تھا۔

○○○

پانی، اندر اندر گھاس

ڈاکٹر اور مینڈک

رات کے کتنے پہر بیت چکے تھے۔ کمرے میں دیر تک ٹہلتے ٹہلتے وہ تھک چکی تھی۔ کچھ دیر تک میز پر بیٹھ کر کچھ لکھنے کی کوشش بھی کی۔ اس پر بھی چین نہیں ملا تو میز پر رکھے ٹیبل لیپ میں انگلیاں دیر تک کھیلتی رہیں۔ جل، بجھ جا۔ جل...... بجھ جا...... جل...... بجھ جا—— اُکتا کر وہ بالکنی میں نکل آئی...... باہر دور تک گھنا کہا سا چھایا تھا۔ آس پاس کے مکان، سڑک، آسمان سب کچھ کہرے میں ڈوب چکا تھا۔

اُس کے آہستہ سے اپنے آپ کو چھوا۔ میں ہوں، نا......

وہ مطمئن ہوگئی۔ ہاں میں ہوں۔ جنوری مہینے کی اس سرد لہر میں۔ دھند میں۔ میں ہوں۔ اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن مسکراہٹ پر بھی جیسے برف جم گئی تھی...... بالکنی کا دروازہ بند کر کے وہ دوبارہ کمرے میں آگئی۔ نائٹ گون اُتار کر بستر پر ڈالا۔ کچھ دیر تک ٹی وی دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر...... ریموٹ نے اسکرین پر اندھیرا لکھ دیا تھا۔

وہ اٹھ کر مرر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ایک ہلکی سی انگڑائی لی۔ سوچنے لگی—— ایک خاموش لمحے میں کتنے کتنے انگارے ہوتے ہیں۔ جلتے ہوئے انگارے...... ماں کہتی ہے۔ یہ انگارے نہیں ہیں۔ بس وہ بجھ گئی ہے۔ تھکن کا احساس ہے۔ کام مل جائے گا تو بدن کے کھوئے ہوئے نگارے اُسے واپس مل جائیں گے۔

باپ نے، اس کے وجود میں ایک کویتا لکھی تھی—— ''پانی، اندر اندر گھاس۔ کبھی

پانی کے اندر گھاس کو دیکھا ہے؟''

'نہیں'

'تم شہر والے' ــــــ باپ کو ہمیشہ گاؤں چھوڑ کر شہر آنے کا احساس زخم دیتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ دیر تک گنگناتا رہا۔ پانی، اندر اندر گھاس...... پانی زندگی ہے اور گھاس زندگی کا امرت پی کر ہریلی بن جاتی ہے۔ گرین ویلی۔'

گاتے گاتے وہ چپ ہوئے تھے۔ اس کے سر کو سہلایا تھا۔ تمہارے پاس سے پانی کھو رہا ہے۔ گھاس سوکھ رہی ہے۔ کہیں تم......!'

باپ بجھ گئے تھے۔

اس نے باپ کے گلے میں چپکے سے بانہیں حمائل کر دی تھیں...... '' پانی۔ اندر اندر گھاس......''

باپ نے اسے دھیرے دھیرے تھپکیاں دی تھیں۔ اس شہر میں کوئی نہیں جیتا ہے بیٹی، سب ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے ہیں۔

'وہ باپ کی آنکھوں میں، جھانکنے کے عمل میں رات جیسی پُراسرار ہو گئی تھی ــــــ ایک خاموش لمحے میں کتنے کتنے انگارے ہوتے ہیں؟'

'انگارے، باپ ڈر گئے تھے۔'

'ہاں انگارے ــــــ' اس نے باپ کی آنکھوں میں پھر اپنی آنکھوں کے بادبان کھول لئے ــــــ جیسے گاؤں کے مکان میں مٹی کے چولہے پر، پتھر یا لکڑی کے کوئلے دہکتے تھے...... میں اکثر رات میں ڈر جاتی ہوں۔ ایک سپنا آتا ہے۔ سپنے میں، میں کھو جاتی ہوں اور میری جگہ یہ انگارے رہ جاتے ہیں۔ پتھر یا لکڑی کے دہکتے انگارے۔

باپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے ــــــ

ڈاکٹر دیر تک اس سے آئیں بائیں شائیں سوالوں کی بارش کرتا رہا۔ اس نے ڈاکٹر کی آنکھوں جھانکا اور یہ کیا۔ ڈاکٹر غائب تھے۔ کلینک کا کمرہ ایک چھوٹے سے تالاب میں بدل گیا تھا اور تالاب میں بہت سے چھوٹے بڑے مینڈک پھلاک رہے تھے......

اسے مینڈک پسند تھے۔

وہ اچانک خوشی سے جھوم گئی۔اس نے دیر تک تالیاں بجائیں۔

'مینڈک......!'

ڈاکٹر چونک گیا۔پھر اس نے ایک لمبا سانس بھرا۔'' سمجھ گیا۔ڈپریشن۔سویر ڈپریشن۔ اور اس عمر میں، اور جیسا کہ ایک لڑکی چاہتی ہے۔ایک لڑکی سوچتی ہے۔

ڈاکٹر اسے ڈر ڈر کر دیکھ رہا تھا ———

وہ پھر زور سے چلائی ——— مینڈک۔

ڈاکٹر نے خوف سے جھرجھری لی ——— اسے گھر لے جایئے۔ سپنے دکھایئے۔

'آہ......'اِن کے پاس سے ڈریم رخصت ہو رہے ہیں اور یہ پوری نوجوان نسل......'

وہ دیر تک تالاب اور مینڈک کے پھدکنے پر تالیاں بجاتی رہی ———

○○

انگارا اور ڈپریشن

باپ جیسے کسی سنگین الزام کے پل سے گزر رہے تھے ———

ماں فکرمندی کے بوجھل قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں ٹہل رہی تھی

'تو بیٹی نے کلینک کو تالاب سمجھ لیا'

'ہاں'

'اور ڈاکٹر کو مینڈک'

'ہاں'

'پھر ڈاکٹر نے کیا کیا؟' ماں تشویش کے پل پر سوار تھی۔

'پتہ نہیں کیوں؟' باپ کہتے کہتے ٹھہرا...... میں نے محسوس کیا اور ممکن ہے میں غلط ہوں۔لیکن۔شاید مینڈک سمجھے جانے پر ڈاکٹر ڈر گیا تھا ———

'ڈاکٹر ڈر سکتا ہے......'

ماں اپنے زمانے کو ٹٹول رہی تھی ——— 'ہاں اتم نے صحیح کہا۔ڈاکٹر ڈر سکتا ہے۔اس لئے کہ وہ مینڈک اور اپنے زمانے کا فرق سمجھتا ہے۔'

'اپنے زمانے کا؟' باپ خوفزدہ تھے۔

'مینڈک اور اپنی عمر کا فرق۔ تم نے ڈاکٹر سے پوچھا نہیں......' ماں کہتے کہتے رُک گئی تھی۔

'کیا! پوچھا نہیں؟'

'ڈاکٹر کے پاس بھی ایک...... بیٹی ہوگی—— ماں نے روانی سے اپنا جملہ پورا کیا۔ اور جیسا کہ ہماری بیٹی ہے۔ آہ، ٹھنڈک بڑھ گئی ہے۔ کہاسے کی نرم اور گیلی چادر میں اخبار کی گرم اور بارودی خبریں لپٹ گئی ہیں۔ سن رہے ہو، نا تم......

'میں سن رہا ہوں'۔

'ہاں' تمہیں سننا چاہئے۔ پہلے ہماری بیٹی نے خواب رکھے تھے۔ اپنے سرہانے پڑے صندوق میں بند۔ تب اتنا گھنا کہرا نہیں چھایا تھا۔ اتنی تیز سردی نہیں پڑی تھی......'

باپ کے دانت سردی سے بجے تھے...... ڈپ...... ڈپریشن۔ یہ میں نے نہیں، ڈاکٹر نے کہا ہے'

''ڈپریشن' ماں چلائی ...... 'سنو' ڈاکٹر نے صرف تمہیں کنفیوز کیا ہے۔ اتنی ساری وارداتیں، اتنی تیز ٹھنڈک اور ایک انگاروں بھرا جسم......' ماں کی آواز میں برف پگھل رہی تھی...... سنو، کچھ روز پہلے اس نے مجھ سے پوچھا تھا......''

'کیا......؟'

'ایک...... ایک خاموش لمحے میں کتنے کتنے انگارے ہوتے ہیں......'

'ماں' باپ کی طرف گھومی تھی...... اور یقیناً یہ انگارے تمہیں لوٹانے ہوں گے۔ کیا ایسا کر سکتے ہو تم۔ اور تمہارے جیسے ایک باپ کو...... اور اگر تم ایسے نہیں بھی ہو۔ تب بھی مجھے کہنا چاہئے......'

ماں نے سر جھکا لیا تھا...... تمہارے اوپر والے فلیٹ میں ایک لڑکا رہتا ہے۔ نوجوان۔ اکیلے رہتا ہے تمہیں ان انگاروں کی واپسی کے لئے—— تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......'

ماں کا لہجہ تحکمانہ تھا—— ورنہ دیر ہو جائے گی۔

باپ نے پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا۔

لیکن وہاں ماں کہاں تھی۔وہاں 'نارسیس' کا پودا اُگا ہوا تھا_____

'چلو، ابھی کچھ زیادہ رات نہیں ہوئی۔لڑکے سے بات ہو سکتی ہے۔'

کہرا، کنوارے لڑکے کا ڈرائنگ روم اور مینڈک

باہر کے منظر پر کہاسے کی نرم دبیز چادر بچھ چکی تھی۔ ماں اور باپ کنوارے لڑکے کے دروازے پر آکر ٹھہر گئے تھے۔ باپ نے لانگ کوٹ کی جیب سے دستانے والا ہاتھ نکالا اور دروازے پر دستک دی۔

ماں نے اسکارف سے چہرہ کو ذرا اور ڈھک لیا۔ گویا ایسا کرتے ہوئے بھی کہاسے کی ٹھنڈ اس نے اپنے پورے چہرے پر محسوس کی......

دستک کے بعد دونوں ہمہ تن گوش ہو کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔

اور......

ایک بےحد خراب، بوجھل سناٹے کو توڑنے والی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔

دروازے پر لڑکا کھڑا تھا۔لڑکے کی آنکھوں میں بےنیازی کی دھول بھری تھی......

'آپ لوگ......'

'ہاں۔ہم لوگ......اور یقیناً تمہیں اس وقت اور یہاں۔ہمیں دیکھ کر حیرت ہونی بھی چاہئے۔'

'افسوس۔نہیں'_____لڑکے کے چہرے پر سختی تھی۔ افسوس......، اس نے یہ لفظ دوبارہ دہرایا......میں حیرتوں سے دور نکل آیا ہوں۔

'آہ، باپ نے ماں کی طرف دیکھا۔

ماں نے باپ کی فضول آہ کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔وہ فوراً ہی اپنی منشا پر آ گئی۔

'میری لڑکی ہے......'

'ملا ہوں......'لڑکے نے لاپرواہی سے کہا۔

باپ چونک گیا تھا......

ماں نے بات آگے بڑھائی۔کل میری بیٹی ڈاکٹر کے یہاں گئی تھی۔

لڑکے نے اثبات کے لہجہ میں گردن ہلائی_____

'اُس نے ڈاکٹر کے کیبن کو تالاب اور ڈاکٹر کو......'

آدھا جملہ باپ نے پورا کیا...... مینڈک سمجھ لیا......

لڑکے کے ہاؤ بھاؤ، مینڈک جیسے ہو گئے تھے ـــــــ ایک لمحے کو وہ دونوں کے سامنے مینڈک بن گیا۔ ایسے! اُس نے اچھل کر دکھایا...... 'ایسے، نا......'

'کچھ کچھ۔ شاید۔ ایسا ہی...... ہاں بالکل ـــــــ باپ کو، اس کے ناچنے میں مزہ آرہا تھا۔

'ہنسو مت' ـــــــ ماں نے باپ کو ڈانٹا۔ پھر لڑکے سے گویا ہوئی۔ سنو، ہم اپنے زمانے کا کہرا پہنے آئے ہیں۔ بیٹی کو تم سے۔ سمجھ رہے ہو نا، تم سے۔ اور جیسا کہ تم ہو۔'

'لڑکا ابھی بھی پھدک رہا تھا......'

ماں نے اپنا جملہ پورا کیا۔ 'بس تھوڑے سے انگارے چاہئیں۔ انگارے۔'

ٹھیک اسی لمحے کہیں کوئی گولی چلی تھی۔

گولی کی آواز بھیانک تھی۔

باپ نے خوف سے اپنے کان بند کر لیے۔

ایک بے حد نئے اور چونکانے والے لمحے کی آرزو لئے ـــــــ دونوں اب کہاسے کی چادر پر چلتے ہوئے، بیٹی کو گولی چلنے کی خبر دینے جارہے تھے......

باپ آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا...... پانی، اندر اندر گھاس ـــــــ

اور ماں نے اپنے پورے چہرے کو اسکارف سے یوں ڈھک لیا تھا کہ اس کا اپنا چہرہ غائب ہو گیا تھا۔

○○○

نور جہاں، پھول جہاں اور کین کا صوفہ

(1)

دروازے پر آ کر پھول جہاں ٹھہر گئی۔ آگے بڑھ کر اُس نے کال بیل پر اُنگلی رکھ دی۔ اُنگلی رکھنے کے کافی دیر تک وہ وہیں کھڑی رہیں۔ دروازہ کھلنے کے انتظار میں۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔

پھول جہاں کے سانولے چہرے پر حیرانی کی چمک لہرائی۔ موتیوں جیسے دانت کھل گئے۔

''امّاں، یہ لوگ اتنی دیر تک کیوں سوتے ہیں؟''

''سوتے ہیں، تجھے مطلب۔'' اماں نور جہاں نے ڈانٹ پلائی۔

''میں جو دیر تک سو جاؤں تو تم اور ابا تو مل کر مجھے مارنے ہی لگتے ہو۔''

''بیوقوف بچی'' اماں نور جہاں کے کالے چہرے پر خفگی کے آثار اُبھرے ——— ''یہ بڑے لوگ ہیں۔''

''تو بڑے لوگ دیر تک سوتے ہیں۔''

''ہاں۔''

''تو بستر پر بھی دیر میں جاتے ہوں گے۔

''ہاں کوئی ہماری طرح نہیں کہ ڈھبری جلی اور سو گئے۔ یہ لوگ بہت دیر دیر تک کام کرتے ہیں۔''

''کیا کام کرتے ہوں گے''

منھی نور جہاں کا تجسس اصرار کی سرحدوں کو پار کرتا ہوا نظر آتا، تو اماں نور جہاں اُسے سچ مچ کا ایک تھپڑ لگا کر اُس کا منہ بند کر دیتیں۔ ''چھوٹے بچے کو اتنا نہیں بولنا چاہئے رے نور جہاں۔

''کیوں نہیں چاہئے اماں۔''

''لو۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ اب کے بولی تو ٹانگ توڑ دوں گی۔''

''نہیں۔ ٹانگ مت توڑو۔ اب نہیں بولوں گی۔''

پھول جہاں موتیوں جیسے دانت نکال کر دوبارہ کال بیل پر اُنگلی رکھ دیتی۔ اندر سے مصباح نکلتا۔ نیند سے ڈوبی آنکھیں لئے۔ آنکھوں میں ہلکی سی ناراضگی بھی ہوتی کہ اتنی صبح صبح آکر یہ کس نے جگا دیا۔

وہ آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا۔ پھر نور جہاں اور پھول جہاں کو ساتھ دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتا۔ کتنی بار کہا ہے کہ ۹ بجے کے بعد آیا کرو۔''

''کیا کروں بابو جی۔ اور جگہ بھی جانا پڑتا ہے، نا۔'' نور جہاں وضاحت کرتی۔

لیکن پھول جہاں ٹپ سے بول بیٹھتی۔'' سویرا تھوڑا ہی ہے۔ باہر نکل کے دیکھو کتنی دھوپ چڑھ آئی ہے۔''

''چُپ۔''

اماں نور جہاں اُسے پھر سے ڈانٹ پلاتیں۔ اور لے کر کچن کی طرف بڑھ جاتیں۔

کچن میں جیسے قیامت آئی ہوئی ہوتی۔ دیگچی کہیں، پتیلی کہیں۔ گیس کے چولہے پر انتہائی گرد پڑی ہوئی۔ بیسن میں گندے جھوٹے برتنوں کے ڈھیر۔ چمچہ، بھگونہ، پنجہ، کرچھل، رکابیاں، قاب، سب ادھر اُدھر ایک دوسرے پر پسرے ہوئے۔ بیسن کے نیچے پڑے ڈسٹ بین میں جھوٹے کھانے کے علاوہ چائے کی پتیاں اور ٹھونگے جیسے کاغذوں کے ڈھیر ہوتے —— نور جہاں آتے ہی جھٹ اپنا کام شروع کر دیتی۔ وہ اپارٹمنٹ کے کئی گھروں میں لگی ہوئی تھی۔ دو گھنٹے ناصر عزیز کے یہاں، دو گھنٹے موجی خان کے یہاں، ایک گھنٹہ رحمٰن صاحب وکیل کے گھر، اس کے بعد یو این آئی والے سلام صاحب اور ان کی ریڈیو والی مسز ریحانہ فریدی کے یہاں۔ جو کام اُس کے ذمہ ہوتے وہ روٹیاں بنانے سے لے کر پوچھا لگانے، برتن چمکانے، پھر کپڑا دھونے کے

ہوتے۔ ان ڈھیر سارے کاموں کو آرام سے پورا کرنے کے لئے پھول جہاں کا بھی ساتھ ہوتا۔ پھول جہاں ٹرٹر بھی کرتی جاتی اور صاحب خانہ کے انتظامی امور میں مین میخ بھی نکالتی جاتی.............

''اتنا پیسہ.......لیکن کتنے گندے رہتے ہیں۔ برتن تو دیکھو لمّاں۔''

''چپ کر۔''

''کیسے چُپ کروں۔ اب ڈسٹ بن دیکھو نا۔ کوڑے والی اسی لئے روز ہلّہ کرتی ہے کہ بالٹی میں بھیگی چیزیں مت ڈالو۔ لیکن یہ لوگ سنتے ہی نہیں۔ اب دیکھو چائے کی پتّی......''

''ارے چُپ کر۔'' لمّاں پھولی ہوئی سانسوں کو برابر کرتی ہوئی آنکھیں دکھاتیں۔

''چپ کیسے کروں اماں۔ تم نے دیکھا نہیں کل کوڑے والی کیسی آنکھیں دکھا رہی تھی۔ مگر یہ لوگ سنتے ہی نہیں......''

اماں نور جہاں کا آخری ہتھیار یہ ہوتا کہ کام روک کر سختی سے اُس کی طرف دیکھتیں۔ تُو کام چُھڑوائے گی یہاں کا بھی۔ ارے کسی دن سُن لیا نا، ان لوگوں نے، تو ہو جائے گی چھٹی۔ آدمی کی کمی ہے کام کرنے والوں کی ـــــــ یہ پیسے دیتے ہیں دس عورتیں ہم سے بہتر مل جائیں گی۔''

''مل جائیں۔ اس سے کیا۔ تمہیں بھی تو ایک چھوڑ دیں کام مل جائیں گے۔ اب کل ہی تو وہ انسپکٹر صاحب بھی تم سے پوچھ رہے تھے۔ کام کے لئے۔ تم نے ہی انکار کر دیا۔''

''انکار کیسے نہ کرتی یہی کام نپٹاتے ہوئے صبح سے شام ہو جاتی ہے۔''

''تمہاری مرضی۔ لیکن جو غلط ہے اُسے غلط تو کہوں گی۔ اب دیکھو نا رسوئی کتنی گندی ہو رہی ہے۔ پلیٹ میں ایسے کہیں کھانے چھوڑے جاتے ہیں۔ ہم کو ہی دے دیا ہوتا۔ ہم کھا لیتے ۔تم کھا لیتیں۔ لیکن نہیں ــــ دیں گے نہیں ــــ پلیٹ میں زیادہ لے لیں گے۔ پھر چھوڑ دیں گے ــــ تم ہی تو کہتی ہو لمّاں ــــ چاول کا ایک دانہ بھی پلیٹ میں چھوٹ جائے تو اللہ میاں گناہ دیتے ہیں۔ انہیں کتنا گناہ ہوتا ہوگا۔''

''گناہ کی بچّی۔'' اماں نور جہاں اس بار ہاتھ اٹھا دیتیں۔ اب زیادہ بک بک کی تو کل سے لانا ہی چھوڑ دوں گی۔''

''چلو نہیں بولوں گی۔ مگر لانا مت چھوڑنا۔ تمہیں اکیلے کام کرتے دیکھ کر افسوس ہوتا

ہے۔ بھلا اتنا سارا پھیلا ہوا کام تم اکیلے کیسے کرو گی؟''

''پھر بک بک کی۔''

''نہیں۔ نہیں کروں گی۔'' اچھا جاتی ہوں۔ باتھ روم میں پھولے کپڑوں کا پانی پھینک کر تازہ پانی سے کھنگال دیتی ہوں۔''

امّاں کے تھپڑ کا بھی نور جہاں بُرا نہیں مانتی تھی۔ وہ ہنس کر باتھ روم میں داخل ہو جاتی۔ لیکن اس کا بولنا ویسے ہی جاری رہتا۔

'' ہائے اللہ۔ یہ کپڑے ہیں ــــــ یہ کپڑے۔ ایک دن میں اس قدر گندے کیسے ہو جاتے ہیں۔ اماں ذرا کالر تو دیکھنا۔ سب لوگ تو گاڑی میں جاتے ہیں۔ پر اتنی میل کیسے لگ جاتی ہے۔ ہمارے کپڑوں پر لگے تو کوئی بات بھی ہے۔ اماں مجھ سے یہ میل نہیں جائے گا ــــــ تم ہی آ جاؤ ــــــ ہاں مجھے بھوک لگی ہے۔ دو روٹی اور اچار دے دو۔ کھا کر اسکول چلی جاؤں گی۔''

واقعہ یہ ہے کہ پھول جہاں اسکول میں پڑھتی ہے۔ یہاں ہو کر وہ سیدھے اسکول چلی جاتی ہے۔ امّاں پھول جہاں کے لئے یہ بڑی بات ہے۔ اس کی بیٹی پڑھ رہی ہے۔ اس لئے وہ اُسے ڈانٹتی اور آنکھیں دکھاتی تو ہے مگر اُس سے ہلکا سا خوف بھی کھاتی ہے۔ پھول جہاں کی باقی بڑی بہنوں کے ساتھ اس کا یہ رویہ نہیں ہے۔ وہ سب تو جیوں ہی تاڑ کی طرح لمبی ہوئیں، اُنہیں نور جہاں کی پھنکار بھی سُننی پڑی۔ بے چارے باپ کی آمدنی ہی کتنی تھی۔ کبھی رکشہ چلایا۔ منہ سے خون تھوکنے لگا۔ بیمار رہنے لگا تو اپارٹمنٹ کے سامنے چائے کی دکان لے بیٹھ گیا۔ ایسے علاقے میں جہاں پڑھے لکھے اور پوش لوگ رہتے ہوں۔ وہاں بھلا چائے کی دُکان سے آمدنی ہی کیا ہوتی۔ لے دے کے نور جہاں کا آسرا تھا۔ جو اپنا پانچ بچ کر یہاں وہاں کام کر کے پورے گھر کا بوجھ اُٹھاتی تھی۔ اپارٹمنٹ میں کام ختم کر کے وہ سیدھے چائے کی دُکان پر پہنچ جاتی۔ تب اس کا میاں آرام سے ایک بیڑی سلگاتا اور چائے کی ذمہ داری بھی اُس کے سپرد کر کے کہیں موج مستی کرنے نکل جاتا۔ پھول جہاں کو باپ کے اس رویئے سے نفرت تھی۔ وہ اکثر اپنی امّاں سے اس بارے میں جھگڑا کرتی۔

'' تم کیوں بیٹھتی ہو چائے کی دُکان پر؟''

'' دیکھتی نہیں اُن کا جانگر کام نہیں کرتا ہے۔''

'' تمہارا کام کرتا ہے؟ اپنے کو دیکھو ــــــ بابا کیا کرتا ہے۔ یہیں تو بیٹھنا ہے اور کیا۔

وہ بھی نہیں کرے گا۔"

"تیرے باپ نے اس سے پہلے بہت کچھ کیا ہے۔" اماں نور جہاں سمجھانے والے انداز میں بولتیں۔

"کیا کیا ہے۔ سب کرتے ہیں۔ اب تم کہو گی۔ بچوں کو پالا پوسا، بڑا کیا، شادی کی۔ سو سب کرتے ہیں اور تم نے ہاتھ نہیں بٹایا کیا؟ اکیلا بابا کر سکتا تھا ان سب کی شادی؟"

"تُو اتنا کیوں بولتی ہے رے پھول جہاں؟"

"بولوں گی کیسے نہیں تمہارا یہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ بابا سے کہو۔ تھوڑا جانگڑ چلایا کرے۔ دن بھر بیٹھے بیٹھے پتہ نہیں کتنی بیڑیاں پھونک جاتا ہے۔"

"چپ کر رے......"

لیکن پھول جہاں چپ نہیں ہوتی۔ قینچی کی دھار کی طرح اُس کی زبان چلتی رہتی۔ نہیں۔ چپ نہیں رہوں گی۔ بولوں گی ہی۔ تم یہاں مت بیٹھو کام ختم کر کے گھر جاؤ۔ آرام کرو۔ تب نہیں بولوں گی بیچ بیچ میں وہ چائے پینے آئے گا گاہکوں کو بھی سناتی رہتی۔ کیوں؟ چائے ہلکی ہے؟ ہلکی ہی ملے گی؟ باہر جا کر پیو تب معلوم ہوگا۔ وہاں چائے دو روپے میں ملتی ہے اور یہاں صرف ایک روپے میں۔ دو روپے میں دو آدمی چائے پی سکتے ہیں اور پھر مہنگائی نہیں دیکھتے۔ ارے پینا ہے تو پیو۔ نہیں تو گھر جاؤ۔"

اپارٹمنٹ میں پھول جہاں کا دل کام کرتے ہوئے سب سے زیادہ جس گھر میں لگتا تھا وہ رضوی صاحب کا فلیٹ تھا۔ ایک رضوی صاحب' ایک ان کی اہلیہ اور ایک رضوی صاحب کا جوان بھائی مصباح جس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی ___ رضوی صاحب دور درشن میں تھے۔ ذکیہ بھی اسی محکمے میں تھیں۔ دور درشن کے لئے فلمیں بنانا۔ دن دن بھر گھر سے غائب رہنا۔ دیر تک سونا۔ پھول جہاں کو اس گھر کی ایک ایک بات کا علم تھا۔ کچھ باتیں اُسے اچھی بھی لگتی تھیں جیسے فلم بنانا۔ وہ فلم دیکھنے کی شوقین تھی۔ یہ اور بات تھی کہ بارہ سال کی عمر ہو جانے کے باوجود اس نے گنتی کی چند فلمیں ہی دیکھی تھیں۔ اُسے کسی کے گھر جا کر ٹی وی پر فلم دیکھنا پسند نہیں تھا۔ جب کہ یہ کام وہ آسانی سے کر سکتی تھی اور اپارٹمنٹس کے اُن فلیٹس میں جہاں جہاں اُس کی اماں کام کرتی تھیں، اُسے کوئی پریشانی بھی نہیں ہوتی۔ مگر یہ اُسے پسند نہیں تھا۔ وہ ابا سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ

کوئی ٹی وی لے آؤ۔ رکشہ چلانے اور چائے کی دُکان میں جانگڑ چلانے والے بیمار باپ کی اتنی اوقات ہی کہاں تھی۔ ہاں بڑے پردے پر اماں کے ساتھ اُس نے دو تین فلمیں دیکھی تھیں اور وہ فلمیں اُسے اب بھی یاد تھیں۔ اور وہ کبھی کبھی جب بہت خوش ہوتی تو بڑے والہانہ انداز میں ان فلموں کے قصے سُناتی۔

رضوی صاحب اور ذکیہ فلمیں بناتے ہیں۔ یہ بات پھول جہاں کو اچھی لگتی تھی۔ مگر اُن کا دیر تک سونا۔ دن بھر گھر سے غائب رہنا اُسے پسند نہیں تھا۔ وہ اکثر اماں نور جہاں سے پوچھتی تھی۔

''امّاں، ذکیہ بھی کام کرتی ہیں؟''

''ہاں۔''

وہ پوچھتی۔ ''عورت کا کام کرنا اچھا ہوتا ہے امّاں۔ اور تم بھی تو کام کرتی ہو۔ میں بھی کرتی ہوں۔ ٹھیک ہے لیکن ــــــ دن دن بھر گھر سے غائب رہنا۔''

''تجھے اس سے کیا؟''

''ان کے پاس پیسوں کی کیا کمی ہوگی ــــــ پھر ذکیہ کیوں کام کرتی ہیں۔ رضوی صاحب کو چاہئے کہ وہ ذکیہ کو کام کرنے سے روکیں۔ دیکھو تم کام کرتی ہو تو مجبوری ہے ــــــ وہ کام کریں اس میں کیا مجبوری ہے ــــــ ہوگی؟ مجھے کیا ــــــ''

(2)

رضوی صاحب کا فلیٹ خاصا سجا ہوا تھا۔ گیٹ کے پاس خوبصورت سے کئی گملے پڑے تھے۔ ڈرائنگ روم کے ایک طرف پیتل کا ایک بڑا سا گملا تھا جس میں کیکٹس کی نوکیلی بانہیں ایسی لگتی تھیں جیسے کمرے میں آنے والے مسافر کو آغوش میں لے رہی ہوں۔ دیوار پر پینٹنگس آویزاں تھیں۔ چھت سے فانوس جھول رہے تھے ــــــ وہیں پر لہلہاتا ہوا ریشمی پردہ بھی تھا۔ پردے کے پاس ہی ڈرائنگ ٹیبل تھا۔ ڈرائنگ ٹیبل پر ہر شے قرینے سے سجی تھی۔ رضوی صاحب کا بیڈروم بھی انتہائی حسین تھا۔ اس کے بازو والا کمرہ مصباح کا تھا۔ یہ کمرہ ہر وقت بکھرا بکھرا ملتا۔ کتابیں اِدھر اُدھر پڑی ہوئی۔ کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے۔ لیکن سارے گھر میں جو چیز سب سے زیادہ پھول جہاں کو پسند تھی وہ رضوی صاحب کا صوفہ تھا ــــــ کین کا بنا ہوا صوفہ اُسے

معلوم نہیں اُس نے سب جگہ کے صوفے دیکھے تھے لیکن اس کی پُر اشتیاق آنکھوں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ہی دم لیا۔۔۔۔۔۔ کین کیا ہوتا ہے اُسے معلوم نہ تھا۔ اُس نے سب جگہ کے صوفے دیکھے تھے، لیکن اس صوفے میں کچھ خاص بات تھی۔ کچھ انوکھا پن تھا۔ وہ جب بھی آتی 'اپنے تجسس کے پر کھول کر، رشک آمیز نگاہیں ان صوفوں پر ضرور ڈالتی۔ صوفے پر انتہائی خوبصورت گدّے اور کُشن پڑے تھے۔ ان صوفوں کے بارے میں جب اس کا اشتیاق جنون کی حد تک بڑھ گیا تو اُس نے ابا سے پوچھا۔

''تم اُن کے یہاں گئے؟''

''ہاں۔''

''اُن کے ہاں کا صوفہ دیکھا ہے؟''

''صوفہ؟ ہاں دیکھا ہے؟''

''کین جانتے ہو؟''

''نہیں۔''

''لکڑی جیسی چیز ہے۔ مہنگا نہیں ہوگا۔ کیوں ابا؟''

''تجھے اس سے کیا۔''

''نہیں۔ پوچھ رہی ہوں۔ پوچھنے میں غلط کیا ہے۔ مہنگا نہیں ہوگا۔ تم نہیں بنا سکتے۔''

''پگلی لڑکی میں صوفہ بناتا ہوں۔''

''نہیں پوچھ رہی ہوں۔ پوچھنے میں غلط کیا ہے۔۔۔۔۔۔ غصہ کیوں ہوتے ہو۔ اماں بنا سکتی ہے؟''

''اماں کیسے بنائے گی۔''

''امّاں سب کرلیتی ہے۔ تم سے زیادہ جانگڑ چلتا ہے اُس کا۔''

پھر پھول جہاں وہاں ٹھہری نہیں۔ اُس نے امّاں سے بھی پوچھا۔

''تم نے رضوی صاحب کا صوفہ دیکھا ہے؟''

''ہاں۔''

''اچھا لگتا ہے۔۔۔۔۔۔ نہیں؟''

''لگتا ہے۔ پھر ــــــ؟''

''تم بنا سکتی ہو؟''

''پگلی کہیں کی۔'' اماں نور جہاں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں بگڑو مت ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ مہنگا نہیں ہوگا۔ کیوں؟ لکڑی کا ہے۔ کین بھی تو لکڑی ہی ہوتی ہوگی۔''

''میں کیا جانوں۔''

''اچھا تم سب کرسکتی ہو۔ لیکن ایک صوفہ نہیں بنا سکتیں۔''

''پاگل لڑکی۔ میں......''

''اچھا ڈانٹو مت۔ یونہی پوچھ لیا۔ لیکن مہنگا نہیں ہوگا۔ اتنا یقین ہے۔''

(3)

''پھول جہاں کا چھوٹا سا گھر ہے۔ سلیم پور میں ــــــ کچی مٹی کا ــــــ گھر میں دو کمرے ہیں۔ ان دو کمروں میں نور جہاں اور پھول جہاں کا پورا سنسار پسرا ہوا ہے۔ آس پاس کافی جھگی جھونپڑیاں ہیں۔ لیکن ان میں دو کمروں والا گھروندہ بس ان کا ہے۔ لیکن پھول جہاں کو اس بات پر ذرا بھی ناز نہیں ہے۔ یہ گھر بھی بڑی مشکل سے بنا۔ اُن دنوں یہ اپارٹمنٹ بن رہا تھا۔ اپارٹمنٹ کی بنیاد میں نور جہاں کا بھی ہاتھ تھا۔ مزدوروں کو ٹولیوں میں ــــــ وہ اور اس کا میاں دونوں شامل تھے۔ خوب کام کیا۔ نور جہاں اس بارے میں ذکر چھیڑے جانے پر بتاتی ہے۔ مٹی مٹھی بھر پیسے ملتے تھے۔ بڑا مزہ آتا تھا۔ اسی دوران وہ جگہ خریدی سلیم پور میں۔

دو کمرے والی اس کوٹھری میں عجیب سی سیلن ہے۔ ایک چوکی پڑی ہے۔ ایک ٹین کا ٹرنک ہے۔ جس میں جاڑے کے اور دوسرے کپڑے بند ہیں۔ اندر داخلے کے ساتھ جو کوٹھری ہے اس میں لکڑی کا ایک ٹوٹا ہوا اسٹول اور ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پڑی ہے۔ یہ چوکی بھی وہ اپارٹمنٹ سے لائے تھے۔ جب اپارٹمنٹ میں ہاتھ لگا تھا۔ کسی جج صاحب کے یہاں سامان شفٹ ہوا تو یہ لکڑی کی میز اور کرسی باہر راہ داری میں ڈال دی گئی۔ مدّتوں وہیں پڑی رہی۔ پھر جب نور جہاں نے وہاں کام سنبھالا تو یہ دونوں قیمتی چیزیں بطور تحفہ اپنے گھر لے آئی۔

......کرسی کا ایک پایہ ٹوٹا ہوا ہے۔ اس کے نیچے اینٹیں لگا کر چوتھے پائے کی کمی پوری کر دی گئی ہے۔ پھول جہاں اس کرسی پر بیٹھ کر اپنے اسکول کا ہوم ورک کرتی ہے۔ ادھر جب بھی وہ اس ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر ہوم ورک کرنے کی کوشش کرتی، اُس کی آنکھوں میں وہی کین کے صوفے ناچ جاتے۔ وہ کیا چاہتی ہے شاید اُسے بھی پتہ نہیں تھا۔ مگر وہ ان صوفوں پر بیٹھ کر دیکھنا چاہتی تھی۔ دیکھنا چاہتی تھی کہ کیسا لگتا ہے!

جیسے جیسے دن گزرتے رہے، کین کے صوفے کے بارے میں اس کا تجسس بڑھتا چلا گیا۔

وہ دن اگر عام دنوں سے مختلف تھا تو صرف اس لئے کہ اس دن کی فضا میں ایک معمولی سی گمنام بچی کے حوصلے کی نمی ملی ہوئی تھی۔ پھول جہاں کی آنکھوں میں خود اعتمادی کا کوئی پھول کھلا اور اُس کے وجود میں خوشبو بھر گیا۔ گلابی رنگ کے فراک میں اس کا سانولا چہرہ کچھ ایسے چمکا کہ اندھیری رات میں پورے جلوؤں سے منور چاند کو بھی اُسے دیکھ کر کمتری کا احساس ہوا۔

وہ ایک نہیں سمجھ میں آنے والے لمحے کی زد میں تھی اور ذرا دور پر وہی کین کا صوفہ تھا۔ کچن سے اماں نور جہاں کی کھٹ پٹ کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے دنیا جہان کے پھول مسکرائے۔ پھر ایک لحہ دیر کئے بغیر وہ جھٹ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نرم ملائم سا گدا ریشم کے تار سے سلا ہوا کشن۔ وہ تھوڑا سا اُچھلی اور پُشت پر جیسے جنّت کی کھڑکی کھلنے کا احساس ہوا۔ لطیف خوش گوار جھونکے سے اُس کے اندر اُتر گئے۔ اُس نے کرسی ترچھی کی۔ ذرا سا پھر اُچھلی۔

○○

پھول جہاں کو اچھا لگا۔ اُس کی متجسس انگلیوں نے بے خوف ہو کر گدے کا لمس حاصل کیا۔ کتنا نرم، ملائم، لچکدار۔ اُس نے آہستہ سے ہاتھ پھرایا۔ اُسے اچھا لگا۔ آنکھوں میں خوشیوں کے ہزار رنگ مچل گئے۔ اُس نے دھیرے سے کشن چھوا۔ ایک نامعلوم جذبے کے تحت اُسے سینے سے چمٹا لیا۔

اور اچانک۔

جیسے سورج کی تیز شعاعیں اچانک ماند ہو کر بدلیوں میں چھپ جائیں۔ جیسے خاموشی اور سناٹے کو، گرنے اور ٹوٹنے کی کوئی صدا چیر دے۔ جیسے آنکھیں خواب میں کھوئی ہوں۔ اور نیند

کھل جائے ——— جیسے کوئی ناخوش گوار سا حادثہ ہو جائے ——— ویسے ہی کوئی ایک نامعلوم سی چیخ۔اُس کے اندر اندر اُترتی چلی گئی۔

○○

''چلو...... اترو...... اترو...... اترو یہاں سے......'' مصباح نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں سے کشن چھین لیا۔اس کی آنکھوں میں ناراضگی کے شعلے تھے۔یہاں کیوں بیٹھی ہو پاگل لڑکی۔کیوں بیٹھی یہاں؟''

اور پھول جہاں...... وہ دھم سے صوفے سے کود گئی۔جسم میں تھرتھراہٹ سی بھر گئی۔جیسے خوابیدہ ہاتھوں کی اُنگلیاں اچانک وائلن کے تاروں سے جا ٹکرائی ہوں۔اور غلط جگہ ہاتھ کے پڑنے سے جو راگ پیدا ہوا ہو اُس نے اچانک نیند سے بیدار کر دیا۔

پھر کچھ نہیں ہوا۔پھول جہاں چپکے سے اُٹھی اور باہر نکل گئی۔

○○

اماں نور جہاں کام سے لوٹیں تو ان کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی پھول جہاں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''کل سے تم وہاں کام پر نہیں جاؤ گی۔اماں''

''واہ رے کیوں نہیں جاؤں گی۔''

''بس نہیں جاؤ گی۔میں نے کہہ دیا نا۔''

''یہ بھی اچھی مصیبت ہے۔لیکن تو بیٹھی کیوں صوفے پر۔وہ رضیہ بھی کہہ رہی تھیں۔بچوں کی زیادہ شوخی وہ پسند نہیں کرتیں۔''

''ارے اس میں شوخی کی کیا بات ہے کہ بس بیٹھ گئی۔اچھا لگا۔اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات تھی۔''

''لیکن تُو بیٹھی کیوں؟''

''میرا دل چاہا۔''

''دل چاہا۔'یہ بھی کوئی بات ہوئی۔''

''میرا جو دل چاہے گا کروں گی۔ لیکن تم کل سے وہاں کام پر نہیں جاؤ گی۔''

''اور جو گئی تو؟''

''میں بھگ جاؤں گی۔ ہاں سُن لیا۔ تم کو کوئی فرق پڑے نہ پڑے۔ مجھے پڑتا ہے۔ آخر یہ بھی کیا بات ہوئی کہ ذرا سی بات پر ڈانٹ دیا۔ ایک جگہ کام نہیں کرو گی تو بھوکی نہیں مر جاؤ گی۔ وہ انسپکٹر صاحب بھی کہہ رہے تھے کل سے ان کے یہاں چلی جانا۔ کبھی اماں ____ اور وہاں دوبارہ گئیں تو میں بھاگ جاؤں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

(4)

چار پانچ دن گزر گئے اماں نور جہاں کام پر نہیں آئیں۔ لیکن اس سے بڑی مصیبت تو رضوی صاحب کے یہاں پیدا ہوئی۔ ذکیہ اور رضوی صاحب دونوں کام والے آدمی تھے اور ان کے گھر کے کام کا 'ٹانکا' نور جہاں اور پھول جہاں سے جُڑا ہوا تھا۔ جہاں ایک دن سے دو دن ہوا۔ وہاں گھر کا سارا کام ہی رُک گیا۔ روٹیاں کون بنائے۔ کپڑے کون صاف کرے۔ کچن میں کوڑے کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ جس وقت کوڑے والی آتی تھی اُس وقت کبھی گھوڑے بیچ کر سوئے رہتے تھے۔

''کیا بات ہوئی نور جہاں کیوں نہیں آرہی؟ اُس رات رضوی صاحب نے تشویش سے دریافت کیا۔

''بیمار ہوگی۔''

''بیمار ہوگی تو پتہ چلانا چاہئے تھا۔ ایسے گھر کا سارا کام ہی رُک جائے گا۔

رضوی صاحب سچ مچ پریشان تھے۔ نور جہاں نہیں آئی تب کیا ہوگا۔ یہ کام کرنے والیاں تو بڑی مشکل سے ہاتھ آتی ہیں۔ دونوں ماں بیٹی اُن کے ہاتھ پاؤں تھے۔

ذکیہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا ____ کل صبح اُس کے گھر جا کر پتہ کریں گے۔ اُس کا پتہ میرے پاس لکھا ہوا ہے۔''

OO

صبح سویرے دروازے پر غیر مانوس سی آواز اُبھری تو پھول جہاں چونک کر اُٹھ بیٹھی۔

اُس کی امّاں کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ باپ چٹائی پر سویا ہوا تھا۔ پھول جہاں میز صاف کر رہی تھی۔ تین پایوں والی کرسی جھک جھک کر چمک رہی تھی۔

صبح کے ساتھ بجے ہوں گے —— آس پاس کی جھگی جھونپڑیوں میں زندگی کی کرن لوٹ آئی تھی۔ میونسپلٹی نل کے پاس عورت مرد اور بچوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ کچھ جھگیوں سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ گندے برتنوں کی ڈھن ڈھن بھی سنائی دے رہی تھی۔

''کون؟''

پھول جہاں نے پلٹ کر دیکھا اور دروازے پر جیسے تھم سی گئی۔

رضوی صاحب اور اُن کی بیوی ذکیہ تھیں پھول جہاں کے پیچھے نور جہاں بھی نکل آئی۔ اس کی آنکھوں میں بے چارگی اور ندامت سمٹ آئی تھی۔

''میں نے سمجھا کہ بیمار ہو'' رضوی صاحب بولے۔

'اس لئے ہم دیکھنے چلے آئے' —— ذکیہ کے ہونٹوں پر شکایت درج تھی۔

اتنی دیر میں پھول جہاں جیسے خود کو بحال کر چکی تھی۔ اُس نے پلٹ کر اپنی جنت کو دیکھا ۔ تین پائے والی کرسی، چمچماتی ہوئی میز...... آنکھوں میں کوئی شعلہ سا لپکا —— جیسے خوشی کے جھرنے پھوٹ پڑے ہوں —— دوسرے ہی لمحے وہ ذکیہ اور رضوی صاحب کی طرف بجلی کی طرح گھومی اور تیزی سے مسکراتی آنکھوں کے ساتھ بولی ——

''آیئے نا...... اندر آیئے نا...... یہاں...... یہاں بیٹھئے......!''

○○○

ایک مٹھی خاک

پتہ نہیں کیوں، میں یہ نہیں سوچ پا رہا تھا کہ بھیا بھی یہاں کی مٹی کے لئے اتنے مجبور اور کمزور ہو سکتے ہیں۔ مٹی...... مٹی میں رکھا ہی کیا ہے...... گیلی چکنی ہو، سوندھی ہو، نرم ملائم ہو، سخت ہو یا جیسی بھی ہو، مٹی میں کیا ہے...... ایک جگہ کی مٹی بدلتی تو مٹی کو بھول گئے ـــــــ میں نے بھیا کو اس سے پہلے پتہ نہیں کیا کیا سمجھا تھا ـــــــ سخت، سنگدل پاکستان جا کر اپنی مٹی کو بھول جانے والا۔ لیکن کیا پتہ تھا کہ بھیا کی نس نس میں، رگ رگ میں یہاں کی مٹی پیوست ہے ـــــــ جسے وہ اپنے آپ سے کبھی کھرچ نہیں سکتے۔

'بھیا' ـــــــ وقت کی سیڑھیوں پر تبدیلی کے کیسے کیسے انگارے رکھے تھے۔ چھوؤ تو ہاتھ جل جائیں۔ بھیا کی آنکھوں میں تب ایک مسلم لیگی بستا تھا، جو اٹھتے بیٹھتے ہر وقت سوچتا رہتا تھا۔ گم سم، دالان کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ وہ کوٹھری وقت کے سانحے کا شکار ہوگئی۔ بھیا اسی کوٹھری میں ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھے ہوتے تھے۔ ہاتھوں میں کوئی رسالہ دبا ہوتا ـــــــ یا وہ چائے پی رہے ہوتے، پر سوچنے کا عمل جاری رہتا۔ سوچتے سوچتے جب پریشان ہو جاتے تو دھڑ سے کرسی سے اٹھ جاتے۔ ایسے میں اس کی بھی پرواہ نہ کرتے کہ اچانک اس طرح اٹھنے سے برسوں پرانی آرام کرسی کا کیا حشر ہوگا ـــــــ یا کرسی کے ڈنڈوں پر رکھی چائے کی پیالی بچے گی یا شہید ہو جائے گی ـــــــ ٹھنڈی سانس بھرتے ـــــــ منہ سے چچ کی آواز نکالتے پھر شروع ہو جاتے۔

''ملک کا کیا بنے گا۔ کیا بنے گا ملک کا؟'' پھر گہری سانس لے کر کہتے۔ ''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''

یادوں کے اسی گم شدہ جزیرے میں کہیں ابا حضور کا بھی عکس ابھرتا ہے ـــــ جو بھیا کی پریشانیوں کو دیکھ کر ناراض ہو جایا کرتے......

''متین میاں۔اس طرح گھبرانے سے کیا ہوگا؟''

بھیا جیسے خطرے اور خوف کی کتاب کھول کر بیٹھ جاتے......

''بیٹھے رہیے آپ لوگ۔سب مارے جائیں گے...... دیکھ لیجئے گا سب مارے جائیں گے......''

○○

تب بھیا کی عمر ہی کیا تھی۔ بہت سے بہت سترہ اٹھارہ برس۔ترچھی دوپلی ٹوپی سر سے چپکائے، موڈ میں ہوتے تو کرسی پر اُدھ دھنسے کوئی حمد یا نعت گنگنانا شروع کر دیتے...... زیادہ موڈ میں ہوتے تو کمرہ، سارا، باورچی خانہ گھوم کر عیناؤں کو جی بھر کے گالیاں سنانے لگتے۔امی، ابا، مشتری جو گھر میں خادمہ تھیں۔ بھیا کو دیکھ دیکھ کر بس مسکرائے جاتیں۔ بہت ہوتا تو اتنا پوچھ لیتیں...... ''متین بابو! پاکستان بن گیا، تو کیا وہیں آباد ہو جاؤ گے؟''

''میں تو سب سے پہلے جاؤں گا۔یہاں کون رہے گا......''

''شادی۔؟ شادی کہاں کرو گے؟''

امی مسکراتے ہوئے پوچھتیں تو نعمت خانہ کھولتے کھولتے بھیا کے ہاتھ ٹھہر جاتے......

''شادی بھی وہیں کروں گا اور کیا۔''

امی ہولے سے مسکراتیں۔''میں تو نہ جاؤں پاکستان۔پھر کیا کرے گا تو؟''

''سب جائیں گے۔جائیں گے کیسے نہیں۔ابو، آپ سب وہیں چل کر رہیں گے۔ سکھ چین سے، آرام سے بھی۔''

لیکن آرام کہاں؟ وقت کی دہلیز پر تو انگارے دہک رہے تھے۔ تقسیم ہو گئی اور پھر اس کے نتیجے میں آگ دہکنے لگی۔ابا حضور کے جسد خاکی کو یہیں کی مٹی منظور تھی۔بھیا پہلی بار ہارے اور پھر ہارتے چلے گئے۔شاید! ابا کو پاکستان لے جانے والا تصور ادھورا ہی رہ گیا ـــــ ابا نے یہیں کی خاک پسند کی اور ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

تب کتنا روئے تھے بھیا۔ سامان باندھتے ہوئے بھی۔ پاکستان نہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوا نہ وجود سے۔ باندھو سامان۔ چلو پاکستان...... ساتھ میں امی حضور کو بھی لے جا رہے تھے۔ لیکن امی کی سوگوار آنکھوں کو ابا کی یادوں سے دور کی جدائی کب گوارا تھی؟

○○

بھیا چلے گئے۔ پہلی بار لگا تھا، سناٹے اور ویرانے کا بھی اپنا ایک ماضی ہوتا ہے جہاں بڑے بوڑھے اپنی تنہائیاں ماضی کی بیزاریوں سے آباد کرتے ہیں۔ چپ، گم سم ——— خون کے گھونٹ پیتے ہوئے۔ اتنا سناٹا کیوں ہے...... چاروں طرف...... خ سے خاندان بننے اور بزرگی کی جھریاں آنے تک کتنا فاصلہ طے کرتی ہے۔ عمر...... کتنا زیادہ جی لیتا ہے آدمی۔ پل پل وجود کو زخمی کرتا ہوا احساس؟ تب گھر میں اور احساسات میں، بچوں میں اور ہنسی قہقہوں میں...... کیسے ایک دم سے وہی سناٹا، ویرانے کا ماضی چپ چپ آکر دستک دیتا ہے کہ پہچانتے ہو؟

''بھول گئے۔ یا کچھ یاد بھی ہے؟''

○○

لیکن یادوں کا کیا۔ بھیا تو احساسات کی نیند میں زندہ تھے ——— وہ بیدار کب تھے۔ نہ چٹھی نہ پتری۔ کبھی بھولے سے کوئی چٹھی پتری آ بھی جاتی تو لگتا...... چلو رسم نبھانے کی ذمہ داریاں تو نبھ رہی ہیں ——— تم بھی قلم اٹھالو ——— چار سطریں لکھ لو۔ پھر ایسے میں آواز لگاتا۔

''تبو! ندیم، ارم...... ارے کوئی ہے بھائی۔ قلم لے آؤ ——— کیا اتنے بڑے گھر میں جہاں اتنے ڈھیر سے بچے پڑھ لکھ رہے ہوں، وہاں قلم بھی کھوجنا پڑتا ہے۔ کیسی پڑھائی ہے۔ ارے چار سطریں ہی تو لکھنا ہیں...... پاکستان بھیا کو...... پنسل ہی لے آؤ......

بھیا......!

بھیا تو احساسات سے کھرچی ہوئی چیز بن گئے تھے۔ ہاں کبھی کبھی سب مل بیٹھتے تو بھیا کے تذکرے چھڑ جاتے۔

ندیم پوچھتا۔ ''بڑے ابا آئے کیوں نہیں۔''

کبھی کبھی تبسم بھی اداس ہو کر پوچھتی...... "سرحد پار سے اور بھی تو لوگ ہیں جو آتے رہتے ہیں۔ بھیا کو لکھیے نا...... آ جائیں"۔

سچ...... سناٹے اور ویرانے کا اپنا بھی ماضی ہوتا ہے اور غلط کہا میں نے ——— کہ یہ ماضی صرف خون کے گھونٹ پی کر، بیزار لمحوں کی وادی میں اونگھا کرتا ہے لیکن صاحب کبھی کبھی کاٹ بھی لیتا ہے ——— بھیا آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ دیکھا۔ پہچانا، چھوا...... نہیں۔ وقت بدل گیا تھا۔ یہ وہ بھیا نہیں تھے ——— سر پر دو پلی ترچھی ٹوپی چپکائے۔ تقسیم کی حمایت میں گیت گانے والے۔ پاکستان جانے کا نعرہ بلند کرنے والے...... ابا سے تیکھی جھڑپیں کرنے والے۔ اور اماں سے خوش گپیوں میں مصروف۔ بھیا کے چشمے کا پاور ہی نہیں بڑھا تھا۔ دور کی نظر بھی احساس اور پہچان کی حدوں کو پار کر گئی تھی۔ تبھی تو ٹوٹتے اُجڑتے گھر میں بھیا کی آنکھیں رشتوں کی پہچان سے الگ میز پوش اور قالین کا جائزہ لے رہی تھیں۔ گھر کا...... گھر کی چیزوں کا، لباس کا، پورٹیبل بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی کا...... اور...... بھیا کی آنکھوں میں حقارت جیسی گھاس اُگ آئی تھی......

"یہاں کی غریبی نہیں گئی۔ کیوں میاں......؟ ندیم کیا کر رہا ہے؟ میرا بڑا لڑکا پیرس چلا گیا۔ لڑکی انجینئرنگ کے آخری سال میں ہے...... وہ بھی باہر چلی جائے گی۔"

محسوس ہوا بھیا گھر کی ہر شئے کو غیر ملکی چشمے سے دیکھ رہے تھے ——— "کیوں میاں! اتنے برسوں بعد بھی کچھ نہیں بدلا۔ ارے ان پڑوسیوں کو تو دیکھو۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور تم ——— اسی باپ داداؤں والے حجرے میں قید ہو۔ باہر نکلو میاں۔'

"ہم باہر نہیں نکلتے بھیا! اس حجرے میں قید رہتے ہیں اور اسی میں مر جاتے ہیں۔

OO

لگا، جیسے کوئی آواز سسک سسک کر مر رہی ہو۔ لیکن اس آواز کا ماتم بھی کیا؟ بھیا میں ایک ماضی سو گیا تھا ——— اور مضوعیت کا ایک نیا شہر آباد ہو گیا تھا۔ لگا، بھیا کے رہتے ہوئے گھر میں ایک اداس سوگواری فضا ہے۔ تبسم کی آنکھوں میں دیکھتا تو محسوس کرتا...... کیا اسی دن کے لئے بھیا کو بلانے کی کش مکش چل رہی تھی۔

"خط کیوں نہیں لکھتے آپ...... بلاتے کیوں نہیں...... سرحد پار سے دوسرے لوگ تو آتے رہتے ہیں......"

جاتے جاتے بھیا نے ایک اور کیل ٹھونک دی......

''یہ محلّہ...... محفوظ تو ہونا تم لوگ؟ یہاں کے دنگوں اور فساد کی خبر جب وہاں جاتی ہے تو اللہ اللہ...... یہ بے رحم محلّہ والے کسی کو اپنا سمجھتے بھی نہیں۔ تم ہی ہو جو اپنا ایمان غارت کر کے یہاں جیئے جا رہے ہو۔''

مٹھیوں میں جیسے ایک لمحہ کو تناؤ پیدا ہوا۔۔۔۔۔ سناٹے اور ویرانے کے، ماضی کی کتاب جیسے یکا یک ایک جھٹکے سے پھٹ گئی۔۔۔۔۔ چیتھڑے ہو گئی۔ بھیا کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں بیزار احساسات والا ایک بوڑھا انگڑائیاں لیتا ہوا ملا۔ لگا، چیخ کر کہوں......

''جھوٹے ہو تم بھیا! اتنے برسوں بعد بھی مہاجر کہلا کر خوش ہونے کا ڈھونگ کر رہے ہو۔''

مگر کس سے کہتا۔ بیزار احساسوں والے بوڑھے سے۔ اس سے کہنے کیلئے تھا ہی کیا۔۔۔۔؟

○○

پھر بھیا چلے گئے۔

بھیا تو بہت پہلے ہی چلے گئے تھے، لیکن نہیں۔ بھیا آئے کب تھے۔ جانے سے پہلے ابو امی کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور چلے گئے۔ دل کے کسی کونے میں کوئی کسک جاگی۔۔۔۔۔ نہ تڑپ نے آنسوؤں کا لباس پہنا۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ کچھ بھی نہیں ٹوٹا۔ بس چلے گئے۔

سناٹے اور ویرانی کو بیزار ماضی کا مدفن کیوں کہتے ہو؟...... میں نے ابھی ابھی اسی سناٹے میں ایک شکستہ سانس چھوڑی ہے، میں پھر اسی ماضی میں لوٹ آیا ہوں۔۔۔۔۔ اور اسی ماضی کو ادھیڑ رہا ہوں......

تو لگتا ہے کہ بھیا مر کر زندہ ہو گئے ہوں......

نہیں۔ مرتے وقت بھیا میں ماضی زندہ ہو گیا ہو۔ یا ماضی کبھی مرا ہی نہیں۔ بھیا زندگی بھر خود سے جھوٹ بولتے رہے...... لڑتے رہے لیکن آخرکار ہار گئے۔۔۔۔۔ ایک دم سے ہار گئے۔

○○

پاکستان سے واپس...... اور ہندستان کی سرحد میں قدم رکھتے ہی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

ہم گیلے احساسات والے کپڑے کیوں پہنتے ہیں بھیا......؟

رخ سے خاندان بنتے تک تو لگا تھا...... بیزار ماضی نئے حالات سے سمجھوتہ کر کے، ویرانے اور سناٹے میں پناہ گزیں ہو جاتا ہے۔ پھر یہ جاگ کیسے گیا؟

بھیا کی شکستہ سی تحریر زندہ تھی اور تحریر کا ایک ایک لفظ چیخ رہا تھا:

''جلدی سے پاکستان آجاؤ۔ میں جانے والا ہوں......

تم سب سے بہت دور...... بہت دور۔ میرا دل گھبرا رہا ہے...... وطن یاد آرہا ہے...... وطن سے کچھ اور مت سمجھنا۔ مجھے اپنا ہندستان یاد آرہا ہے۔ مجھے لگتا ہے...... یہ ہندستان میرے اندر ہمیشہ سے زندہ تھا۔ میں نے ہی جان بوجھ کر اسے خود سے کاٹ رکھا تھا۔ اگر تمہارے آنے میں تاخیر ہو جائے اور میں نہ ملوں تو یہاں سے میری خاک لے جانا۔ اپنے وطن ـــــــ اور ابو امی کی مٹی سے ملا دینا۔ مجھے میری مٹی سے ملا دینا۔''

OO

اور میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ لیکن مجھے افسوس ہو رہا تھا بھیا کا آخری دیدار نہ کر سکا۔ ہاں سنا کہ وہ مجھے مرتے وقت بھی بے انتہا یاد کر رہے تھے۔ افسوس اس بات کا زیادہ رہا کہ ان کی موت پر ان کے لڑکے پیرس سے نہ آسکے۔ واپس لوٹا تو قدم بوجھل تھے اور آنکھیں نم تھیں ـــــــ لیکن اتنا سکون تھا کہ بھیا آخری وقت میں اپنی مٹی سے مل گئے تھے۔

اپنی مٹی سے کوئی بچھڑتا کب ہے؟

OOO

سیاہ حاشیے

دہشت کا سبب تہذیبی ہے۔ وہ انسان ثابت ہونے سے ڈرتا ہے، اور آخر احمق ہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ اتنی اچھی کارکردگی نہیں دکھا پاتا جتنی اس کی جارح مردانگی اس سے تقاضا کرتی ہے۔ اس مفہوم میں ہم سب نامرد ہیں، اور اپنے احترامِ ذات کو سلامت رکھتے ہوئے اس صورتِ حال سے باہر آنا صرف کسی عورت کی ہمدردی کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔ یہ محبت کو ایک خاص طلسم کا حامل بنادیتی ہے، کیوں کہ ہر بار پہلی بار کی مانند ہے، اور ہر مرد و زن کو ہر بار نئے سرے سے، پہلی بار کی طرح، آغاز کرنا پڑتا ہے۔

—— گابرئیل گارسیا مارکیز

لیبارٹری

گندہ تالاب، کیڑے اور وہ

یہ قیاس لگانا بہت آسان ہے کہ وہ کہاں پیدا ہوئے ہوں گے ـــــــ وہ سابرمتی آشرم سے دلی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ کہیں، کسی بھی طرح، کسی بھی حال میں ـــــــ لیکن معاف کیجئے گا۔ اُنکی پیدائش کے عمل کو کسی بھی طرح میں 'کلوننگ پروسیس' سے جوڑنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اس لئے کہ کلوننگ کے ذریعہ چاہے وہ بھیڑ، ہو یا انسان ـــــــ اور یقیناً آپ تسلیم کریں گے کہ سائنس کی تجربہ گاہیں، انسانی تجربہ گاہوں کے مقابلے، کم خطرناک ہیں ـــــــ نہیں، اس بحث کے لئے ڈولی بھیڑ' یا پہلے انسان 'مکاؤف' کے تصور سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ سائنس کا پیدا کردہ انسان بھی گوشت پوست کا ہی انسان ہوگا مگر اُس انسان سے کم خطرناک ہوگا ـــــــ جو انسان کے ذریعہ، انسانی فضا میں، انسانی گھر، انسانی کمرے میں اور انسانی عمل کے دوران ان عالم وجود میں آگیا ہے ـــــــ (اس لئے تسلیم کر لیتے ہیں کہ کلوننگ کا انسان دوم درجے کا انسان ہوگا، کہ اُس کے اندر جنگ اور تہذیب کے جراثیم ، ندت اختیار نہیں کر پائیں گے جو..........)

اس لیے فرض کرتے ہیں کہ وہ وہی تھے جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں، انسانی عمل کے دوران ـــــــ

اور فرض کرتے ہیں کہ وہ سابرمتی آشرم سے دتی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا، ہو سکتے ہیں ـــــــ

OO

وہ کئی تھے۔ چار، پانچ چھ، سات، آٹھ...... یعنی کل ملا کر اتنے کہ اُنکی گنتی آسانی سے ہوسکتی ہے۔ وہ بیحد نرم ملائم، سادہ لوح یا ایسے تھے، جن کو لے کر پانیوں کی مثال دی جاسکتی ہے۔ یعنی کسی بھی برتن میں ڈال دو—— وہ ایسے تھے کہ آپ اُن کا کچھ بھی استعمال کر سکتے تھے—— اور جس دن کا واقعہ ہے، اُس دن دو پہر کا سورج آگ برساتا ہوا اپریل مہینے کو جلانے اور جھلسانے کی تیاری کرر ہا تھا۔ دو بجے کا وقت ہوگا۔ 'وہ' بہر کیف، ساری رات کے تھکے ہوئے—— ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے بیٹھے، گندے پانی سے بار بار نکلتے اور اندر جاتے کیکڑے کا لطف لے رہے تھے——

'کیکڑے کے کتنے پاؤں ہوتے ہیں۔'

دوسرا زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا—— کیکڑے کی آنکھیں کہاں ہوتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا——'

'سالے میں نے پاؤں کے بارے میں پوچھا تھا۔

—— 'اور میں نے آنکھوں کے بارے میں۔'

اُن میں ایک سن رسیدہ تھا۔ اُس کی بڑی بڑی دانشورانہ، آنکھوں میں چمک لہرائی۔' دیکھو، کتے کو.....'

'کتا نہیں کیکڑا'

'ایک ہی بات ہے۔'

'ایک ہی بات کیسے، تم اور میں کیا.....'

وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا—— ایک ہی بات ہے...... دیکھو...... دیکھو کیکڑا مٹی سے پھر باہر نکل آیا۔

'بارش ہوگی۔'

'ان سالوں کو پتہ کیسے چل جاتا ہے۔'

'بارش کی اطلاع ملتے ہی کیکڑے اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں۔'

'اسی سنجیدہ قسم کے دانشور نے اطلاع بہم پہنچائی۔ کیکڑے کے بارہ پاؤں ہوتے ہیں۔

کینکوے اپنے پاؤں کا حساب نہیں رکھ پاتے۔ انکے لئے زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو۔ دیکھو..... سالا گرا ——

بارہ پاؤں نہیں۔ کینکوے کے دس پاؤں ہوتے ہیں ——

'آٹھ.....'

'چھ.....'

پہلے نے گفتگو کے رُخ کو ہی بدل دیا تھا۔ کیکڑے کے ہاتھ کہاں ہیں؟ آں؟ ہاتھ ——

'ہاں، ہاتھ کہاں ہیں؟'

پہلا پُر اُمید تھا —— 'دراصل آپ لوگ جسے پیر سمجھ رہے ہیں وہ.....'

'ممکن ہے۔'

'نہیں —— یا تو کیکڑے کے ہاتھ نہیں ہوتے یا پاؤں۔'

OO

دھوپ سخت تھی، لیکن اچانک بادلوں کا ایک کارواں دھوپ کے آگے سے گزر گیا۔

'بارش ہو سکتی ہے۔'

'نہیں بھی۔'

'کیکڑے زمینوں سے باہر آرہے ہیں، اس لئے ممکن ہے.....'

کیکڑے زمینوں سے باہر نہیں آرہے ہیں، جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔'

'جان بچا کر ——'

'بارش کے موٹے موٹے قطرے، پتھر بن کر.....'

'معصوم کیکڑے۔'

'قطعی نہیں ——' بیحد سنجیدہ نظر آنے والے دانشور نے منطق کا حوالہ دیا ——

ایسے بدنما، بدصورت، بدہیئت اور اس گندے آکٹوپس کی چھوٹی قسم کو کیا نام دیں گے۔ یہ کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن معصوم نہیں ہوسکتا۔

وہ دیر تک سر جوڑے بے بنیاد، غیر دلچسپ گفتگو میں الجھے رہے کہ کیکڑہ عالم وجود میں کیسے آتا ہے۔ کیکڑہ دیکھتا کیسے ہے؟۔ کیکڑا زندہ کیسے رہتا ہے۔ کیکڑے کی زندگی کتنے دنوں کی

ہوتی ہے۔یا، کیکڑوں کے پاس زندگی کا تصور کیوں نہیں ہے۔ کیکڑے اپنی حفاظت کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔وہ دیر تک سر جوڑے بیٹھے تھے کہ بادلوں کی اوٹ میں گم ہوتے سورج نے اِن کی تفریح طبع کے لئے بارش کی کچھ موٹی بوندیں آسمان سے بھیج دیں۔ کیکڑا کچھ لمحے تک تڑپا۔ پانی کے چھوٹے سے گڈھے میں 'اچھلا' کودا——— اوپر نیچے کیا۔ بارش ذرا تیز ہوئی تو چھوٹے سے گڈھے میں کیکڑے کی لاش تیر رہی تھی۔

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے اُٹھے———

——— 'جواپنی حفاظت نہیں کر پاتے ہیں'

دوسرے نے جوڑا——— جوزندہ رہنا نہیں جانتے ہیں۔

تیسرا مسکرایا——— اور جو اقلیت میں ہوتے ہیں...... اقلیت، وہ اس لفظ پر دل کھول کر ہنسا۔

'ہم نے جو کچھ دیکھا، وہی اس کی زندگی تھی۔یعنی بس اُتنی ہی زندگی، جتنی ہم دیکھ سکے۔اُس نے ذرا سا ہاتھ پاؤں مارا اور——— '

'اس کی لاش کا کیا کیا جائے۔' دانشور، سنجیدہ تھا۔ بارش سے گیلی ہوئی مٹی اُس نے دونوں ہاتھوں میں بھری۔ کیکڑے کے 'جسم' پر ڈالی۔عقیدت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔

'رام نام ستیہ ہے۔'

دوسرے نے تڑکہ لگایا۔'جھوم کے بولو ستیہ ہے۔

'ناچ کے بولو ستیہ ہے'

'گا کے بولو ستیہ ہے۔'

'رام نام ستیہ ہے......'

بارش کی رم جھم جاری تھی۔ کپڑے بھیگ چکے تھے۔ چلتے چلتے 'یہ کئی' ٹھہر گئے۔ پہلے نے دوسرے کو——— دوسرے نے تیسرے...... تیسرے نے چوتھے......یعنی سب نے ایک دوسرے کو باری باری سے دیکھا———

پہلے کی آواز مدھم تھی...... 'رام نام......'

اس کے بعد کوئی کچھ نہیں۔سب خاموش ہو گئے۔اور اٹھ کر یونہی آوارہ گردی کے لیے

نکل گئے ـــــــ

کالی رات، مہذب لوگ اور تجربہ گاہ

وہ مہذب لوگ تھے۔ وہ اتنے مہذب تھے کہ اپنے مہذب ہونے کی دلیلیں دے سکتے تھے۔ اور اُن کی دلیلیں اتنی باوزن ہوا کرتی تھیں کہ اُن دلیلوں پر چپ چاپ لوگ سر جھکا لیا کرتے تھے۔

محترم قارئین، یہاں اُن بہت ساری سیاہ راتوں کا ذکر ضروری نہیں ہے، جو' تجربے' کے لئے اُن کی لیبارٹری میں رکھی ہوئی تھیں۔ لیبارٹری۔ وہ تہذیب سے جڑی ہوئی ہر شئے کو اپنی تجربہ گاہ میں لے جاتے تھے۔ اُنہیں سائنس میں مکمل یقین تھا۔ ردرفورڈ' سے آئن اسٹائین اور گراہم بیل سے نیوٹنس لاء کے بارے میں اُن کی معلومات خاصہ وسیع تھیں۔ جیسے وہ جانتے تھے کہ ہر ایک عمل کا اُس کے مساوی اور مخالف ایک ردِّ عمل ہوتا ہے۔ مادّہ کے فزیکل اور کیمیکل ریئکشن پر اُن کی خاص نظر ہوا کرتی تھی۔ اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم آج تک کی، اس سب سے زیادہ مہذب دنیا کے، سب سے زیادہ مہذب باشندے ہیں۔ اور یہ بات اُنہوں نے اپنی گرہ میں باندھ لی تھی کہ اس مہذب دنیا کا اصول ہے، جو طاقتور ہیں، وہی زندہ رہیں گے۔ یعنی جو اقلیت میں ہیں، کیڑے مکوڑے یا کیڑے وہ ویسے بھی مُردہ ہیں اور اُنہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔

تو یہ مہذب لوگوں کی لیبارٹری تھی، جہاں یہ جاننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ تہذیب اور جنگوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جنگیں ہی وہ بیش قیمت زیور ہیں، جن سے ہمیشہ سے تہذیبوں کو آراستہ کرنے کا کام لیا جاتا رہا ہے۔

تو فرض کر لیتے ہیں، یہ وہی تھے جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں اور انسانی عمل کے دوران ـــــــ

اور فرض کر لیتے ہیں کہ وہ سابرمتی آشرم سے دلّی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا ہو سکتے تھے ـــــــ

وہ' کئی' تھے اور پچھلی کئی راتوں سے لیبارٹری کے لئے کام کر رہے تھے ـــــــ

اور یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ وہ کوئی بہت دل سے اپنے کام کو انجام نہیں دے رہے

تھے۔ نہ اُنہیں مجبور کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ ایک 'چھوٹے' سے خوف کی بنیاد پر، کہ اس طرح مہذب لوگوں کی دُنیا سے اُنہیں 'دیش نکالا' مل سکتا ہے ـــــــ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر اس کام کے لئے تیار ہو گئے تھے ـــــــ

اور اس لئے بھی ـــــــ کہ ان میں سے سب کے پاس ایک خاندان تھا ـــــــ خاندان میں ماں باپ تھے ـــــــ بھائی بہن تھے۔ بیوی تھی اور بچے تھے......

اور اس لئے بھی...... کہ بچے معصوم ہوتے ہیں ـــــــ

اور اُن سے کہا گیا تھا۔ جو مضبوط ہوتے ہیں، بس اُنہیں ہی جینے کا حق ہوتا ہے۔ تہذیب کا فرمان بھی یہی ہے۔ اکثریت کی آواز بھی یہی ـــــــ اور اقلیتوں کو......

اُنہیں چانکیہ کے اشلوک پڑھائے گئے تھے......

दुर्जनस्य च सर्पस्य वरं सर्पो न दुर्जन ः।

सर्पो दंशति काले तु दुर्जनस्तु पदे पदे।।

(بُرے انسان اور سانپوں میں اگر موازنہ کیا جائے تو
سانپ بہتر ہے کیونکہ سانپ اُسی وقت ڈستا ہے جب
موت آتی ہے اور انسان تو قدم قدم پر ڈستا رہتا ہے ـــــــ)

اور اُنہیں بتایا گیا، اس سے پہلے کہ وہ آپ کو ڈسیں، آپ کی تہذیب کو۔ آپ......

○○

وہ کئی تھے ـــــــ

اور کئی، گیس کے سلنڈروں سے بھرے ٹرک پر 'لد' کر ساری رات تہذیب کے نام نئی نئی فنتاسی کو جنم دیتے رہے۔ یعنی ایسی فنتاسیوں کو جن کے تذکرے نہیں ہو سکتے۔ جن پر گفتگو نہیں ہو سکتی۔ زندہ معصوم بچوں کو نئے نئے دلچسپ طریقوں سے آگ میں زندہ جلانے سے لے کر، آبروریزی اور حاملہ عورتوں کی کوکھ میں ہاتھ ڈال کر ـــــــ

نہیں جانے دیجئے۔ فنتاسی لفظوں کا لباس اوڑھ لے تو ذائقہ جاتا رہتا ہے۔

آپ ایسا کیجئے۔ آپ خود ہی اچھی سی فنتاسی گڑھ لیجئے۔ کیونکہ آپ نے ایک طرف جہاں 'اتہاس' کے قصے پڑھے ہیں، وہیں ہٹلر، مسولینی، چنگیز خاں اور نریندر مودی کے نام بھی سُنے

ہیں۔ آپ بابر سے بابری مسجد تک سب کچھ جانتے ہیں ـــــــ

اس لئے ذائقہ دار فلسا سیاں گڑھ لیجئے۔ جس قدر چاہیے 'رس' یا 'گھول' ملالیں۔ آپ کی مرضی ـــــــ

○○

محترم قارئین،

وہ کئی تھے ـــــــ

اور وہ وہی تھے جو سابرمتی آشرم سے دلّی آشرم چوک تک......

اور وہ وہی تھے جو انسانی فضا، انسانی گھر اور انسانی......

○○

سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا ـــــــ

پچھلے کئی دنوں سے وہ 'تہذیب' کو بچانے میں لگے تھے۔ اور آپ جانتے ہیں، تہذیبوں کی حفاظت میں ایسی ہزاروں جانوں کا نقصان تو ہوتا ہی ہے ـــــــ ہزاروں جانیں لی گئی تھیں۔ وہ بھی ہزاروں طریقوں سے ـــــــ مگر ـــــــ اُس گھر میں جو کچھ ہوا، وہ نیا تھا۔ ایک اکثریتی فرقہ کے شخص نے اقلیتی فرقہ کے کچھ لوگوں کو 'پناہ' دی تھی، کہانی بس یہیں سے پیدا ہوئی تھی۔

وہ بس اُس آدمی کو دیکھ رہے تھے جو گھگھیائی ہوئی آواز میں اِن لوگوں کو دیکھ کر چیخ پڑا تھا۔

'مجھے نہیں۔ میں تو اکثریت......'

'اکثریت!'

'ہاں۔ میری متی ماری گئی تھی......' وہ پاگلوں کی طرح چیخا ـــــــ یہ میری بیوی ہے یہ بہن۔ یہ بیٹی ہے۔ اور یہ بیٹا۔ یہ سب میرے ہیں۔ ہاں اُنہیں۔ انہیں لے جاؤ۔ جو بھی کرنا ہے کرو۔ کرو۔ میری متی ماری گئی تھی۔ میں بیوی کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ دوست ہے۔ بچالو۔ میں گھر لے آیا۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ وہ چاروں ...... لے جاؤ...... لے جاؤ......' وہ اپنے گھر کے

لوگوں کو ایسے گھیر کر کھڑا تھا، جیسے چڑیا انڈے سیتی ہے۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ بدن ڈول رہا تھا۔ آواز میں گھبراہٹ تھی۔ بیوی، بہن، اور بچوں کی حالت بھی وہی تھی۔

'تم نے بچایا کیوں؟'

'میں نے کہا نا۔ بیوی نے......'

'میں نے نہیں۔' بیوی چیخی۔ جھوٹے ہو تم۔'

'م......م......میری بیٹی نے......'

'خیر جو بھی ہو۔' یہ کئی' اُن کی طرف گھومے۔ وجہ جو بھی ہو لیکن تم نے بچانے کی کوشش کی۔ اس لئے کہ......دوست!

'میں نے کہا نا متی ماری گئی تھی۔'

'یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ اقلیت ہے۔'

بیوی نے بیٹی کو ایک گندی سے گالی بکی' وہ اُس کے ساتھ پڑھتی ہے۔ اس لئے دوست لگتی ہے۔'

دوست کوئی نہیں ہوتا۔' دانشور سنجیدہ تھا۔ دوستی برابر والوں میں ہوتی ہے۔ اکثریت کی اکثریت سے اور......'

'ہمیں چھوڑ دو......چھوڑ دو......انہیں لے جاؤ......'

دانشور نے اقلیت کے چاروں گنہگاروں کی طرف دیکھا۔ وہ سچ مچ ایک لاش بن گئے تھے۔ چہرے سپید پڑ گئے تھے جسم میں خون نہیں۔ چاروں مذبح کے جانوروں کی طرح اُداس کھڑے تھے۔ یعنی کس کی باری پہلے آتی ہے۔ پھر کس کی باری ___

دانشور نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔

'باہر آؤ۔' اُس نے گھر کے لوگوں کو غصے میں اشارہ کیا۔ باہر کوئی نہیں بھاگے گا۔ جو جیسے ہے۔ جس حال میں ہے، ویسے ہی۔ میرا مطلب......

اکثریت والا اب بھی چلا رہا تھا۔ انہیں لے جاؤ......میری تو متی ماری گئی تھی۔

OO

یہ کئی' اب باہر تھے۔ باہر' ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے۔

'دیکھو ـــــ' دانشور سنجیدہ تھا۔ زرا سوچو۔ یہ ایک بے حد حسین تجربہ ہوگا، یعنی اس سے پہلے جتنے تجربے ہم کر چکے ہیں، یا ہم کریں گے۔ یا ہم کرنے والے ہیں۔'

سب نے ایک دوسرے سے کانا پھوسیاں کیں۔ پھر پُرامید ہو گئے۔

'اب کیا ارادہ ہے!' ـــــ دانشور جلد از جلد اپنی 'پیاس' کو انجام دینا چاہتا تھا۔

'باس۔ مکان مالک کا کیا کیا جائے۔'

'وہ تو اکثریت کا......' پہلا بولتے بولتے ٹھہر گیا۔

دانشور غصے میں بولا۔ پریشانی اب ایسے ہی لوگوں سے پیدا ہوئی ہے۔ ایسے ہی لوگ...... یہی لوگ ہمارے اب تک کے تجربے کو ناکام کرتے رہے ہیں۔'

'تو سب سے پہلے......'

دانشور نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''ساری باتیں یہیں کرلو گے کیا۔ کچھ اُن لوگوں کے لئے چھوڑو۔ اُنہیں معلوم ہونا چاہئے۔ اُن کے ساتھ کچھ لمحوں میں، آنے والے کچھ لمحوں میں کیا ہونے والا ہے۔''

اگلے ہی لمحے، یہ لوگ اندر تھے ـــ سامنے اکثریت اور اقلیت کے سہمے ہوئے 19افراد ان کے فیصلے کے منتظر تھے۔

'آہ، فختا سی۔' دانشور چلّایا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی آواز بدل گئی ـــــ تہذیب ہر بار انصاف کرتی ہے۔ جیسے کوتیا۔ یہ تہذیب کا اصول ہے۔ یہ، یہ بہت زیادہ چلّا رہا تھا۔ اس کے منہ میں تیزاب کے قطرے ٹپکاؤ۔ تیزاب کے قطرے...... آہ، اور اُس کی بیوی۔ وہ بہت تیز بولتی ہے۔ مرچی کی طرح۔ پہلے اُس کے جسم پر، آنکھوں میں مرچی کے پاؤڈر ڈالو ـــــ بیٹی نے بچانے کی کوشش کی تھی۔ ہے نا۔ ایک بیحد پیاری عمر۔ اور اس عمر میں ایک بیحد پیارا چہرہ۔ جیسا ہونا چاہئے ـــــ اسے بانٹ لو۔ ایسا کرو۔ دونوں بچیوں کو بانٹ لو۔ اِن کے سامنے۔ تفریح کرو ـــــ اِن میں سے کوئی کچھ نہیں بولے گا۔ جسم تفریح کے لئے ہوتا ہے۔ کمسن کے گوشت زیادہ ذائقہ دار ہوتے ہیں۔

'اور ـــ اقلیت والوں کے لئے باس۔'

ایک بار میں ایک فختا سی۔ ان کے لئے کچھ الگ سوچتے ہیں۔ سب سے پہلے اُس سنپولئے کو۔ اس کا بھیجا اُڑا دو۔ اقلیتی طبقے کا سنپولیا خطرناک ہوتا ہے۔ حرامی۔

بچے نے تھوک دیا تھا۔

پہلے نے ریوالور تان لیا ——— اور اس درمیان ایک گندی گالی بکتا ہوا اکثریت کا بچہ سامنے آ گیا تھا۔

''تو بھاگ جا ———''

'دھائیں۔'

دوسرا بچہ ایک لمحے کے لئے دوسرے کمرے میں پھر...... رہ گیا۔ گولی دوسرے بچے کے سینے پر لگی تھی۔ سینے سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے تھے۔ کوئی بھی نہیں چیخا ———

سب جیسے اس کھیل کے خاتمے سے پہلے ہی انجام' کو جان چکے تھے۔

دانشور نے کھیل کا طریقہ سمجھایا ——— اسے پنکھے سے لٹکا دو۔ اُس کی ساڑی ہٹاؤ۔ پہلے بلیڈ سے وہاں تک...... پھر ——— 'اُس نے بچیوں کو جلتی آنکھوں سے دیکھا ——— یہ نئے کپڑے کی طرح ہیں۔ قینچی سے کبھی نئے کپڑے کو کاٹا ہے۔ ان کی چھاتیاں......' وہ مسکرا رہا تھا۔ بلیڈ گھماتے ہوئے 'تم ایک عجیب سے نشے میں ڈوب جاؤ گے۔'

تو یہ کمرہ اب ایک لیباٹری تھا۔ تجربے چل رہے تھے۔ نئے نئے تجربے ———

موت۔ عورتیں اور مرد ——— جوان بچیاں اور فنتاسی ——— زندگی اور ایڈونچر ——— زمین پر ایک گھنٹے کی تفریح کے بعد آٹھ لاشیں بچی تھیں۔

'حکم باس۔' پہلا آہستہ سے بولا۔

یہ طے تھا کہ سب تھکن سے چور ہو گئے تھے۔

'ابھی آخری فنتاسی باقی ہے۔ یعنی آخری تجربہ۔ دونوں مرد کی لاش چھوڑ دو۔ باقی گھسیٹ کر اندر لے جاؤ۔ ہم ایک نیا تجربہ کریں گے۔'

'ان کے عضو تناسل کاٹ دو۔' دانشور سنجیدہ تھا۔ اور تم ——— تم سلائی جانتے ہو نا۔ ماڈرن ٹیلرس کے بچے۔ کپڑے سیتے سیتے انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں تیری۔'

'حکم...... حکم باس'

'ان کے عضو تناسل بدل دو۔'

'مطلب۔ مطلب باس۔'

''اِن سالے سوکالڈ......' اُس نے پھر گندی سی گالی بکی ـــــ ان سالوں کو بتانا ہے اب۔ سمجھانا ہے ـــــ دھرم کو کھیل سمجھنے والوں کو مزہ چکھانا ہے ـــــ یہ، جو ہر بار ہمارے تجربوں کو ـــــ اُس نے پھر گالی کا سہارا لیا ـــــ اچانک چونکا ـــــ یہ آوازیں سن رہے ہو۔ ہمارے دوسرے ساتھی یہاں پہنچنے ہی والے ہیں ـــــ اُنہیں دیکھنے دو کہ ایسے لوگوں کے پاس نہ اپنا دماغ ہوتا ہے، نہ عضوِ تناسل۔ اب آپریشن شروع کرو ـــــ '

آپریشن شروع ہوگیا۔

پھر ٹیلر ماسٹر نے جیب سے قینچیاں، فیتے اور بلیڈ کا پیکٹ نکال دیا۔ وہ ایک منجھے ہوئے درزی کی طرح بدن کے 'چادر' کو لے کر بیٹھ گیا ـــــ چمڑے کی جھلی، جو نئے انسانی وجود کے لئے زندگی کا امرت بن جاتی ہے۔ فنکاری اور صفائی سے بدل دی گئی تھیں۔ ٹیلر ماسٹر نے انتہائی مہارت سے اپنا کام انجام دیا تھا۔ ساتھیوں نے شاباشی دی۔ کندھے تھپتھپائے۔ دونوں لاشیں۔ باہر مین گیٹ پر ٹانگ دی گئیں ـــــ '

تجربہ کامیاب تھا۔

مگر کھیل اب شروع ہوا تھا ـــــ

تہذیب کے پیامبر ڈھول، تاشہ بجاتے آتے۔ عضو تناسل کو دیکھتے۔ گندی گالیاں بکتے پھر گزر جاتے ـــــ وہ دیر تک بلکہ کہنا چاہیے کئی گھنٹے تک اس کھیل سے مستفیض ہوتے رہے۔ چلتے وقت دانشور نے قہقہہ لگا کر کہا۔

'صرف بدن کی ایک چمڑی بدل دینے سے۔ تم سب سمجھ رہے ہونا ـــــ آہ، کیا کیا دلکش کھیل تھا۔' آہ، اس کھیل کو ہم بہت دن تک بھول نہیں پائیں گے۔ اور ہمیں اُس۔ اُس مکار مکان مالک کو اُس کے کئے کی سزا بھی دینی تھی۔ اب اُس کی لاش دیکھو۔ اُس کی لاش کی تکا بوٹی ہو چکی ہے۔ جبکہ اقلیت کی لاش۔'

'باس' اُس پر تو پھول مالائیں چڑھی ہیں۔'

'اب چلو، اس کھیل کا سرور تازندگی قائم رکھنا ہے۔'

وہ جھومتے ہوئے نشہ کی حالت میں آگے بڑھ گئے۔

OO

بچہ اور زندگی

'تمہیں وہ بچہ یاد ہے'

'بچہ؟'

'باس، وہ اقلیت کا بچہ، ہم تو اُس بچے کو بھول ہی گئے۔'

'اُسے بچانے مکان مالک کا بچہ آ گیا تھا۔'

'پھر ہم کھیل میں الجھ گئے۔'

'اور بچہ بھاگ گیا۔'

'وہ بچہ کہاں جا سکتا ہے ——— ؟' دانشور کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

'اُس کی نیلی نیلی آنکھیں' پہلا مسکرایا۔ تمہیں اُس بچے کی یاد ہے۔ اُس کے چہرے پر ذرا بھی ڈر یا گھبراہٹ نہیں تھی۔'

'اُس کے ہونٹ' دوسرا کہتے کہتے ٹھہرا......

'بولو...... بولو......' دانشور کی آنکھیں مندگئی تھیں۔

'کھٹے کھٹے بیر جیسے تھے۔ اور پیارے۔'

'اُس کا چہرہ۔' تیسرے نے اپنے خیال کا اظہار کیا ——— یقیناً وہ ایک بہت خوبصورت بچے کا چہرہ کہا جا سکتا ہے۔'

'وہ کہاں چھپا ہوگا؟' دانشور کو اپنی غلطی پر غصہ آ رہا تھا۔

'اُسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔'

'اُسے مارنا......' پہلا کہتے کہتے ٹھہر گیا......

دانشور نے حیرانی سے پوچھا ——— 'کہیں تم سب اُس بچے پر رحم تو نہیں کر رہے۔'

'نہیں باس۔ قطعی نہیں۔'

'مگر کیا اُسے مارنا......'

دانشور غصے میں گھوم گیا۔ مطلب۔ 'تم لوگ کہنا کیا چاہتے ہو؟

'بچہ ہے۔'

'بچے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔'

'کیوں نہ ہم اُسے اکثریت کا بنادیں؟'

'اکثریت ـــــ؟' دانشور چونک گیا تھا۔

'ہاں۔ دھرم پریورتن۔ بچہ تو پانی ہوتا ہے۔

دانشور کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ابھی زیادہ گھنٹے نہیں ہوئے۔ بچہ بھوک پیاس سے بے حال ہورہا ہوگا۔ وہ یقیناً چھپا اور زندہ ہوگا۔ ہمیں بچے کو تلاش کرنا چاہیے۔

'اور بچانا بھی۔'

پہلا ابھی بھی مطمئن نہیں تھا۔ کیا وہ وہاں موجود ہوگا ـــــ میرا مطلب ہے.....'

دانشور نے پُرامید لہجے میں کہا۔ فضول کی باتیں نہیں۔ ہم اس مدعے پر بہت باتیں کر چکے ہیں۔

'بچے کی زندگی ضروری ہے' ـــــ ٹیلر ماسٹر نے لمبی سانس لی۔

'ہاں، اُس کی زندگی بیش قیمت ہے' ـــــ یہ پہلا تھا۔

اُس کی زندگی سے، یعنی اب کی زندگی سے۔ نئی زندگی سے بہت کام لینے ہیں'۔ یہ دانشور تھا۔

○○

محترم قارئین!

تو یہ سارا کچھ اُس چھوٹے سے بچے کے لئے ہوا ـــــ اُس چھوٹے سے آٹھ سالہ بچے کے لئے، جس کی آنکھیں نیلی تھیں، چہرہ خوبصورت تھا اور جس کا تعلق اقلیت سے تھا۔ تو یہ سب کچھ اُس چھوٹے سے بچے کے لئے ہوا، جس کے لئے اکثریت کے بچے نے، بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی اور جو تہذیب کی اس جنگ کے دوران جان، بچانے کے لئے اپنے گھر میں ہی لاپتہ ہوگیا تھا۔ اور یقیناً ایسے بچے کو بچانا ایک اہم فریضہ تھا۔ اور جیسا کہ دانشور نے سوچا، تہذیب کے عروج کے لئے، مذہب کو ہی واحد ہتھیار کے طور پر سوچا جاسکتا ہے۔ بچے کا دھرم پریورتن

ہو جائے تو......

اور یقیناً یہ ساری جنگ تہذیب کے لئے ،تہذیب کے نام پر لڑی گئی تھی۔اور اُن کے سوچنے کا پڑاؤ وہی گندہ نالہ یا تالاب تھا، جہاں اُنہیں وہ کینکوا ملا تھا—— یا بلوں سے نکلتی برساتی کالی چیونٹیوں کو انہوں نے پاؤں تلے روند دیا تھا۔

وہ دوبارہ جلے ہوئے مکانوں اور جلی ہوئی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے اُس مکان تک پہنچ چکے تھے۔آسمان پر کوؤں اور گدھوں کی اُڑان دور تک دیکھی جا سکتی تھی......ابھی بھی آس پاس کئی مکانوں سے دھوئیں نکل رہے تھے۔

'بچے طاقتور ہوتے ہیں۔'

دانشور مسکرایا—— ہاں'۔

'اور اسی لئے بچے سب کچھ سہہ لیتے ہیں۔عذاب، بارش اور جنگ!'

'ہاں۔'

'بچے مرتے نہیں ہیں'

'ہاں'

'بچے مر کر بھی نہیں مرتے ہیں، دانشور پھر مسکرایا۔'اُسے آواز لگاؤ۔کھوجو'

'لیکن ہم پکاریں گے کیا؟

'ہاں یہ مسئلہ تو ہے۔'

'بچہ۔ہم اُسے بچہ کیوں نہیں کہہ سکتے'

'بچے تو سب ہوتے ہیں......اکثریت......' پہلا کہتے کہتے ٹھہر گیا۔

دانشور کا چہرہ بجھ گیا تھا۔'نہیں' اُسے بچہ کہہ کر آواز لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔

'پھر——؟'

'پھر۔سوچتے ہیں۔'

'اُس کی آنکھیں نیلی تھیں'

'ہاں۔

'بال بھورے تھے۔'

'ہاں۔

'نیلی آنکھوں والا بچہ؟'

'یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔'

'بھوری آنکھوں والا ____؟'

یہ بھی نہیں'

وہ شاہزادے جیسا دکھتا تھا؟ کیا شاہزادہ کہہ کر......'

'نہیں۔' دانشور سنجیدہ تھا ___ اقلیت پر شہنشاہیت برسوں پہلے ختم کر دی گئی۔ نہ تاج نہ تخت ____ نہ بادشاہ ____ نہ شہزادے......'

'لیکن اب تو وہ ہمارے ہو رہے ہیں۔ یعنی دھرم پریورتن......'

'اس کے باوجود نہیں۔'

پھر ____؟'

'دانشور فیصلہ کر چکا تھا۔ اقلیت۔ یہ نام بہت ہے۔ چلو، ہم اُسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔'

'اُس نے کسی فوجی کی طرح کمانڈر' کا رول نبھاتے ہوئے کہا۔' ایسا کرو۔ تم اس طرف۔ تم اُس طرف۔ ایک میرے پیچھے پیچھے آئے......اور......'

باس، الگ الگ ہٹ کر ہم کمزور نہیں ہو جائیں گے ___ ٹیلر ماسٹر کی آنکھوں میں چمک تھی۔

'پوائنٹ'

'اس طرح تو بچہ ہم پر حملہ بول سکتا ہے۔ وہ آٹھ سال کا ہے۔ آٹھ سال کے بچے کا دماغ انتہائی شیطان کا اور سازش سے بھرا ہوتا ہے۔'

'پوائنٹ'

'سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بچہ سب کو ایک ساتھ دیکھ کر ڈر جائے گا۔' یہ بھی ٹیلر ماسٹر تھا......

' بچے کو ڈرانا نہیں ہے ____ بچانا ہے ____ ' دانشور کا چہرہ غصے سے پیلا پڑ گیا۔ چلو دیر مت کرو۔ تلاش کرتے ہیں۔ اقلیت......اق لیت۔ بیٹے......؟

'اقلیت......'

'میرے اقلیت......'

'اقلیت ڈارلنگ......'

وہ بچے کو تلاش کر رہے تھے۔ گھر کی کوئی شئے سلامت کہاں تھی۔ زمین سے قالین، دیوار سے لے کر کمرے اور کمرے کے مہنگے سامان ——— لاش کی ہڈیاں کتنے، گدھ اور کوے کھا چکے تھے۔ سامانوں کے جنازے بکھرے تھے...... ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں ان کی ملی جلی آوازیں باز گشت کر رہی تھیں۔

'اق...... لیت......'

'میرے بچے اقلیت......'

'یہاں تو کوئی نہیں ہے۔'

'اوپر۔ اوپر دیکھتے ہیں۔'

'بالائی منزل کی سیڑھیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔'

دانشور کی چیخ نکل گئی ——— 'سنبھل کر آنا'۔

پہلا چیخا۔ 'سر بچاؤ۔

چھت کا ایک چھوٹا سا حصہ بھڑ بھڑا کر تیز آواز کے ساتھ گرا ———

دانشور مطمئن تھا۔ بچہ اوپر نہیں ہو سکتا۔'

دوسرے کا خیال تھا۔ چھت بُری طرح بیٹھ چکی ہے۔ یعنی ایک کو اٹھنے کے تصور سے بھی ——— بچہ کا چھپنا تو دور کی چیز ہے۔'

'کیا بچہ اسی گھر میں ہوگا۔؟' ٹیلر ماسٹر نا امید تھا ——— 'یعنی وہ بھاگ کر کہیں اور بھی تو پناہ لے سکتا ہے۔ کہیں اور......'

دانشور مطمئن تھا۔ 'بچہ کہیں اور پناہ لے ہی نہیں سکتے۔'

'کیوں؟'

'کیونکہ آندھی تیز تھی۔ درخت سارے گر گئے تھے۔'

دانشور اپنے جواب سے مکمل طور پر مطمئن تھا۔ ایسی صورت میں بچے کے سامنے اس کھنڈر میں چھپنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچتا ہے۔'

'آگے اندھیرا ہے۔'

'ٹارچ۔ ٹارچ نکالو۔'

اُن میں ایک نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹارچ نکالا۔ ٹارچ نکالتے ہوئے پھسپھسایا
____ ''سنتے ہیں، کچھ ملک ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں رات ہی رات ہوتی ہے، دن نہیں ہوتے۔'
'ہاں۔'
'باس یہاں بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔'
دانشور کا لہجہ غصے سے بھرا تھا____ 'ہم ایک نیک مقصد کے لئے____ سمجھ رہے ہونا، بچے کو بچانے کے لئے۔،
'وہ زندہ ہوتا تو ہماری آواز ضرور سنتا۔'
'وہ زندہ ہے اور یقیناً ہماری موجودگی سے گھبرایا ہوا ہے۔'
'اقلیت......'
'اقلیت بیٹے......'
مائی ڈارلنگ اقلیت،
آواز لگاتے ہوئے، وہ ایک بار پھر آگے بڑھ رہے تھے۔ آگے، ٹوٹے ہوئے کھنڈر کے ملبے میں____ دروازے، کھڑکیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے۔ کہ اچانک......
'کوئی ہے۔' آواز گونجی
'ٹارچ۔'
'کوئی ہے____' دانشور اندر ہی اندر خطرے کے سائرن' کے طور پر کانپ گیا تھا۔
پہلے نے ٹارچ جلایا____'
دوسری آواز اٹھی____ بچہ ہے۔'
'کہتا تھا، نا......'
ٹارچ کی روشنی ٹوٹے ہوئے لاہوری اینٹے، بھربھرائی مٹی سے ہوتی ہوئی بچے کے چہرے پر ٹھہر گئی ہے......
'باس......'
ٹیلر ماسٹر نے چیخ کر کہا____ 'باس بچہ ہی ہے۔'
'اوہ گاڈ۔'
دوسری آواز آئی۔ 'بچے کی نبض دیکھو۔'

'کوئی ضرورت نہیں باس'۔

ٹیلر ماسٹر کی آواز گونجی—— 'بچے کی پیٹھ میں گولیاں لگی ہیں'۔

پہلے نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا—— بچہ مر چکا ہے۔

دوسرا ٹارچ کی روشنی میں بھیانک بدبو دیتے ہوئے بچہ کی لاش پر جھک گیا۔'بچہ کو مرے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔'

OO

محترم قارئین!

کہانی ختم ہو چکی ہے۔لیکن یقیناً کچھ باتوں کا قیاس لگایا جاسکتا ہے۔جیسے لوٹتے وقت یہ بہت مایوس رہے ہوں گے۔ ممکن ہے بچے کو نہیں بچاپانے کی صورت میں۔یا اس سے زیادہ، ممکن ہے، دھرم پریورتن کے خیال کو عملی جامہ نہ پہناپانے کی صورت میں——یا ممکن ہے۔

کوئی اچھا سا قیاس آپ بھی کیوں نہیں لگا لیتے۔

لوٹتے ہوئے ان کے چہرے جذبات سے عاری تھے اور ایسے چہروں کا فائدہ ہے کہ آپ کچھ بھی قیاس لگا سکتے ہیں۔

لیکن قارئین، سب سے ضروری جو بات ہے، وہ یہی ہے۔کہ یہ وہی تھے جو سابر متی آشرم سے دلی کے آشرم چوک تک——

اور جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں۔انسانی کمرے میں......اور انسانی عمل کے دوران—— کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں ہے کہ یہ 'کئی' کبھی پیدا بھی ہوئے ہونگے——!

OOO

احمد آباد ۔ ۳۰۲ میل

(۱)

صبح اٹھے تو سب کچھ بدلا بدلا سا لگا، ابراہیم بھائی کو۔ در، دروازے، کھڑکیاں اور گھر...... وہ آنکھیں پھاڑے اپنے گھر کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کسی انجانے گھر میں آ گئے ہوں...... کمرہ...... ادھر اُدھر بکھرے ہوئے سامان...... بے رونق دیواریں۔ اندر دل نہیں لگا تو باہر نکل آئے۔ ایک لمبی سڑک مکان سے ہوتی ہوئی آر پار گزر گئی تھی۔ سڑک پار دو چار کپڑے کی دوکانیں تھیں۔ ملکانی صاحب، نرمل ورما وغیرہ کے مکان...... یعنی سب جان پہچان والے...... نہیں جان پہچان والے نہیں؟ غیروں کے۔

گھر سے باہر نکلے تو بدن میں جیسے خوف ہی خوف پسر گیا۔ ٹھیک اسی وقت پولیس کی ایک جیپ دھواں چھوڑتی ہوئی گزری۔ ابراہیم بھائی ڈر کے چھپ گئے...... جیسے پولیس کے سپاہی نے اگر دیکھ لیا تو فوراً جیپ روک دے گا۔ پھر ان سے ان کا نام پوچھے گا۔ وہ نام بتائیں گے تو وہ زور زور سے ہنسے گا۔ پھر...... انہیں چپ چاپ شوٹ کر دے گا، جیسے عام طور پر لوگ پاگل کتوں کو شوٹ کر دیتے ہیں۔

جیپ آگے بڑھ گئی تو تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے سڑک کا جائزہ لیا۔ دل اچانک پھر زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ انہیں لگا، ابھی اچانک دنا دن زور زور سے سڑک پر گولیاں چلنی شروع ہو جائیں گی...... دنا...... دن۔ پھر سڑکوں پر لاشیں ہی لاشیں بچھ جائیں گی۔ چیختے چلاتے لوگوں کی بھیڑ ان کے گھر پر دھاوا بول دے گی۔ دروازہ نہیں توڑنے گا

تو مشتعل لوگ دروازے میں آگ لگا دیں گے۔ پھر چیختے چنگھاڑتے، دھکم پیل کرتے اندر گھس جائیں گے اور......

''چھپاؤ...... چھپاؤ......''

کمرے میں دوبارہ واپس آتے ہی ابراہیم بھائی نے چیخنا شروع کر دیا۔ سب کچھ چھپالو...... کچھ بھی سامنے نہیں رہنا چاہئے۔ جس سے پتہ چلے کہ تم کون ہو...... سمجھے...... ایسا کچھ بھی یہاں نہیں رہنا چاہئے۔

دیوار پر اسلامی کلینڈر ٹنگا تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ قرآن شریف کی تلاوت کر رہا تھا۔ انہوں نے جھٹ آگے بڑھ کر کلینڈر اتار لیا۔ اسے موڑنے لگے۔ ریک پر اردو کی کتابیں ایک قطار سے بجی تھیں۔ انہوں نے ذرا بھی دیر نہیں کی۔ مسہری سے چادر کھینچ لیا۔ اردو کی کتابیں جلدی جلدی ریک سے نکال کر چادر پر پھینکنے لگے۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا۔'' کچھ بھی نہیں رہنا چاہئے۔ کچھ بھی نہیں۔''

OO

چادر کی گٹھری اتنی ہی وزنی تھی۔ جتنا ان کے دماغ پر رکھا ہوا وزنی پتھر ـــــ اٹھانا چاہا تو ٹھہر گئے۔'' کمبخت...... اب اٹھاؤ تو اٹھتا نہیں...... یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ کوئی آ گیا تو؟ کسی نے دیکھ لیا تو؟ گٹھری کے چاروں طرف جھانکتے کونوں سے اردو کے حروف تو نظر آ ہی آرہے ہیں۔ انہیں لگ رہا تھا، قصاب کا چھرا ہر وقت ان کی گردن پر تیار ہے...... کسی وقت بھی یہ چھرا ان کی گردن اتار سکتا ہے......

گٹھری کو جھٹک کر آنکھیں سیدھی کیں تو طاق پر جزدان میں رکھے کلام پاک پر نظر چلی گئی۔ بدن میں سمائی کپکپی جیسے ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اب کلام پاک کا کیا کریں؟ وحشی گھر میں گھس جائیں تو۔ جان تو جائے گی ہی۔ ایمان بھی سلامت نہیں رہے گا...... آگے بڑھے ابراہیم بھائی۔ کلام پاک کو ہاتھوں سے اٹھایا۔ آنکھوں سے چوما۔ سینے سے لگایا۔ وحشت اور گھبراہٹ کے عالم میں آگے بڑھنا چاہا تو ٹھٹھک گئے۔ لگا دروازے کھڑکیوں میں سو سو آنکھیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور یہ آنکھیں بری طرح سے انہیں گھور رہی ہیں......

......کہاں جاؤ گے؟

......کہیں بھی۔

......کہیں بھی؟

......ہاں۔ جہاں سکون ہو۔

......تمہارے لیے؟

......"کیوں؟"

وہ سہم گئے......

جواب ملا۔"تمہارے لیے کہیں سکون نہیں ہے۔ یہ طے ہے تم مارے جاؤ گے۔"

—— کیوں؟

تم ایسے ہی ہو بے غیرت۔ مار کھانے کے لئے بنے ہو۔ ہر جگہ مار ہی تو کھا رہے ہو!، محسوس ہوا، دیوار کی آنکھوں نے اپنا کھرا فیصلہ سنا دیا۔ کہیں بھی جاؤ گے، نکالے جاؤ گے، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا، دو چار برس کہیں بھی مہاجر بن کے جی لو گے۔ آخر میں موت یقینی ہے۔ مارے جاؤ گے۔ یہی سچ ہے۔

وہ ایک دم سے ڈر گئے۔ گھگی بندھ گئی۔

"......کہاں جاؤں؟"

......"ڈر گئے...... یہاں سب، آس پاس والے تمہارے مسلمان بھائی مکان خالی کر گئے۔ اکیلے تم رہ گئے ہو۔ اور یہ سب......"

دیوار میں لگی آنکھوں نے جیسے ان کے ساز و سامان کی طرف اشارہ کیا...... انہیں جلا دو......ان کے نشان مٹا دو......یعنی اپنی شناخت کی ساری نشانیاں......

"نہیں"......ابراہیم بھائی کے بدن میں ٹھنڈی ٹھنڈی لہر دوڑ گئی......ان میں تو کلام پاک بھی ہے......اردو کی کتابیں بھی...... بچپن میں اردو کا کوئی ورق آنگن یا ڈیوڑھی میں پڑا ملتا تو اماں کان مروڑتی تھیں...... پگلے......ان میں اللہ کا نام ہوتا ہے......اسے ایسے پھینکتے ہیں کیا...... پہلے انہیں چومو......"

"ایمان کب تک چاٹو گے۔ مگر مارے جاؤ گے تب؟ وہ آکر ان کی بے حرمتی کریں گے، تب؟ انہیں پیروں کے نیچے کچلیں گے۔ آگ دکھائیں گے، اس وقت؟"

اس نے گھٹی گھٹی سانس چھوڑی......میں نہیں کر سکتا۔ میں مجبور ہوں۔"

"......تو پھر مارے جاؤ۔ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ......"

دیوار پر لگی آنکھوں نے اس کی طرف نفرت سے دیکھا...... ان میں لکھا ہے کہ تم مسلمان ہو......اور ڈر اسی بات کا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ اور مسلمان ہو اس لئے یقیناً مارے جاؤ گے۔ دیکھو، آس پاس کے سب مسلمان بھاگ گئے......"

OO

انہیں یاد آیا، رات انہوں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ خواب میں دیکھا کہ چاروں طرف ہتھیار سے لیس ڈاکو گھوم رہے ہیں۔ مسجدیں توڑی جا رہی ہیں...... بسوں میں، گاڑیوں پر، دیواروں پر، ہر جگہ بھڑ کیلئے نعرے لکھے ہیں...... مسلمان اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر راتوں رات بھاگ رہے ہیں۔ دور تک لمبا قافلہ...... ڈاکوؤں کو پتہ چل گیا ہے۔ ڈاکو قافلے والوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اور ایک ایک کے سرتن سے جدا کئے جا رہے ہیں۔ جن کے سر کٹتے ہیں ڈاکو غصے اور حقارت سے ان کے منہ پر تھوکتے ہیں یا پینٹ کی زپ کھول کر...... پیشاب کی دھار بہا دیتے ہیں۔ ملیچھ...... سپنولیا...... انہوں نے دیکھا۔ راتوں رات لوگ گھر کے باہر لگے نیم پلیٹ کو اکھاڑ رہے ہیں، توڑ رہے ہیں۔ اور گھر کے باہر گیروا کپڑوں کے جھنڈے لگا رہے ہیں۔ انہوں نے دیکھا۔ ایک مسلمان گیروا کپڑوں میں ہے۔ پاؤں میں دھوتی۔ ماتھے پر چندن۔ پیچھے سے ایک ڈاکو آتا ہے۔ اس کی تلوار چمکتی ہے۔ مسلمان چیختا ہے۔ بچاؤ۔

ڈاکو تلوار اڑا کر ہنستا ہے۔" سانپ کا بچہ سانپ ہی رہے گا، جو بھی بھیس بدل لے...... مار ڈالو......"

انہوں نے یہ بھی دیکھا۔ جو لوگ بچ گئے ہیں وہ اپنے اپنے ماتھے پر چندن اور بھبھوت مل رہے ہیں۔ کلام پاک پر رامائن یا مہابھارت کا کور چڑھا کر، تہ خانے میں بند بند تلاوت کر رہے ہیں۔ اور گھر کے باہر آ کر دھوتی پہن کر، ٹیکا لگا کر بھارتیہ، بن جاتے ہیں۔

وہ دیکھ رہے تھے۔ بادشاہت اور غلامی کا زمانہ ایک بار پھر لوٹ آیا ہے۔ انہوں نے کہیں سنا تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں، انگریز ڈنڈے کے ایک چھور پر ہیٹ رکھ کر ہندستانیوں کو سلام کرنے کو بولتے تھے۔ اور جو ہیٹ کو سلام نہیں کرتا تھا، انگریز اس پر ہنٹر برساتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے دیکھا۔ سب کچھ ویسا ہے، صرف منظر بدل گیا ہے۔ ہیٹ کی جگہ

ڈنڈے پر گیروا کپڑا پڑا ہے۔ اور ایک آرمی کا آدمی سہمے سہمے سے مسلمانوں کو بلا کر کہہ رہا ہے۔ پرنام کرو۔ جو ہاتھ نہیں اٹھتے، ان پر ویسے ہی ہنٹر برس رہے ہیں۔ چیخ۔ تیز چیخ۔ وہ صرف چیخیں سن رہے ہیں۔

وہ دور تک دھواں دیکھ رہے تھے۔ جلتے ہوئے مکانات...... آسمان چھوتے ہوئے شعلے ——

وہ دیکھ رہے تھے جو بچ گئے ہیں، آرمی کے لوگ انہیں غلاموں کی طرح کھینچتے ہوئے لیے جا رہے ہیں اور سہمے بھیڑوں کی طرح سر نیچا کیے، ہاتھ جوڑے مسلمان چلے جا رہے ہیں......

انہوں نے دہشت سے آنکھیں موند لیں۔ انہوں نے دیکھا۔ انہوں نے ایسا بہت کچھ دیکھا۔ بہت کچھ دیکھا جسے بتایا نہیں جا سکتا۔ کسی کو سنایا نہیں جا سکتا، لکھا نہیں جا سکتا، انہوں نے دیکھا، ایک بار پھر پرانے زمانے کی طرح پھانسی دیئے جانے کے قصے عام ہیں۔ شاہراہوں پر جا بجا لکڑی کی صلیبیں جھول رہی ہیں۔

''......قصور؟''

ایک آدمی چیختا ہے......

''......سرکار...... یہ نماز پڑھتا ہوا پکڑا گیا۔''

''......ہینگ''......

''......سرکار اس کے گھر میں اردو میں لکھا ہوا......''

''......ہینگ''......

''......سرکار یہ آدمی، وہلی ٹوپی پہنے تھا......''

......''ہینگ''

انہوں نے دیکھا...... ایک تیز الاؤ ہے۔ الاؤ میں ڈھیر ساری ٹوپیاں، تسبیحیں پڑی ہیں۔ الاؤ کے شعلے دہک رہے ہیں۔ انہوں نے دیکھا صبح ہو گئی ہے۔ غلام، پنجروں میں قیدیوں جیسے کپڑے پہنے قید ہیں۔ ہاتھ پیروں میں زنجیریں پڑی ہیں۔ انہوں نے دیکھا...... ہلکی ہلکی صبح نمودار ہو گئی ہے۔...... پولیس کا آدمی آتا ہے۔ غلاموں کے پنجرے کھولتا ہے...... چابک ہوا میں لہراتا ہے، اور......

رونگٹے کھڑے کر دینے والے اس خواب کے بعد اب باقی ہی کیا تھا۔ وہ اٹھے تو جیسے

سب کچھ بدل چکا تھا۔ وقت...... زمانہ...... کمرہ وہی تھا۔ دیوار پر اسلامی کلینڈر، جھول رہے تھے۔ پائیتانے ان کی ٹوپی پڑی تھی۔ وہ جیسی لنگی پہنتے تھے، ایسی چٹائی دار لنگیاں زیادہ تر مسلمان ہی استعمال کرتے ہیں۔ سہمے سہمے سے وہ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پیشانی پر سجدے سے گٹھا پڑ گیا تھا۔ سیاہ گٹھا۔ بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے تھے۔ قیامت کے دن اس گٹھے سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں...... مگر اس وقت...... یہ سب کچھ انہیں کاٹ رہا تھا...... جیسے یہ پورا گھر جل رہا ہو۔

وہ تیزی سے ہتھوڑا لے کر باہر نکلے۔ سڑک ابھی سناٹے میں ڈوبی تھی۔ دور دور تک کوئی نہیں۔ سامنے والی دکانیں ۱۰۔۹ بجے سے پہلے کھلنے کا سوال ہی نہیں۔ انہوں نے دروازے پر جھولتے نیم پلیٹ کو دیکھا...... محمد ابراہیم...... آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھایا۔ ہتھوڑا نیم پلیٹ پر مارنا چاہا تو پیچھے سے کسی نے دبوچ لیا۔ وہ سہم گئے۔ خوفزدہ ہو کر گھومے تو شبن سے ٹکرائے۔

''دولھا بھائی۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟''

''شی''...... انہوں نے انگلی سے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

شبن کنارے ہو گیا۔ ''اپنا نیم پلیٹ توڑ رہے ہیں؟''

''ہاں''......

''خالی نیم پلیٹ دیکھ کر بھی تو۔ کچھ لوگ......'' شبن کہتے کہتے رک گیا۔ انہیں یاد آیا۔ خواب والے لوگ اپنے نیم پلیٹ کی جگہ دوسرے فرقے کی نیم پلیٹ ڈال رہے تھے۔ وہ بس خوف میں گھرے تھے۔ انہوں نے جیسے کوئی دھیان ہیں دیا......

''ٹھک...... ٹھک...... ٹھک......''

نیم پلیٹ کے ٹکڑے ٹکڑے بکھرے تھے۔

ایسا کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا، سڑک کے اس طرف والے مکان کے چھجے سے ملکانی صاحب ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حیرت سے۔ اور دن ہوتا تو شاید وہ مسکراتے۔ باتیں کرتے ـــــ مگر نہیں۔ انہوں نے ہاتھ جھٹک دیا۔ شبن کا ہاتھ پکڑا۔ جھٹ دروازہ بند کیا۔ کمرے میں آ گئے......

''یہ سب؟''

شبن کی آنکھوں میں خوف ہی خوف تھا۔ انہوں نے شبن کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں

ایک سہا سہا 'بھگوڑ' موجود تھا۔ جو اپنے محلّہ کی فضا خراب ہوتے ہی بیوی بچوں کے ساتھ ان کے یہاں آدھمکا تھا۔

''تم کیوں بھاگے تھے شبن میاں؟''

شبن نے گہری سانس لی۔ ''کچھ کہہ نہیں سکتا دولہا بھائی۔ کچھ نہیں۔ فضا خراب ہوئی تو انہوں نے کہا۔ ''بہتر ہے تم ابھی چلے جاؤ۔ اس لیے کہ جب جنون حد سے گزرتا ہے تو ہماری نظریں بھی بدل سکتی ہیں۔ ہاں یہ کہا انہوں نے، جن کے ساتھ دن بھر کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ یہ کہا انہوں نے......''

ابراہیم بھائی نے شبن کی پیٹھ تھپتھپائی...... دیکھا——— شبن کی آنکھوں میں ایک قطرہ طوفان کانپا اور تھم گیا...... ظلم کی کوئی کہانی اس سے زیادہ خوفناک نہیں ہوسکتی۔ ایک کربلا وہ تھا اور ایک کربلا۔ شبن مندر مارگ پر ہندوؤں کے گھر میں کرائے دار تھا۔ بڑے اچھے لوگ...... ہر وقت اٹھنا بیٹھنا۔ دکھ سکھ میں ہر لمحے کا ساتھ جہاں بیٹھے وہیں ایک دوسرے کا کھانا پینا تک ہوگیا۔ کوئی چھوا چھوت نہیں۔ مگر ادھر جنون کے بارود بھڑکے، ادھر مالک مکان نے شبن کو بلا کر عملی بات سمجھا دی کہ میاں ایسے میں جذباتی بن کر کچھ کہنا اچھا نہیں ہوتا۔ یہاں اکیلے صرف تم مسلمان ہو اور تم سے دستخط کرا کر لے جانے والے بھی جان گئے ہیں کہ تم...... تمہارے یہاں اردو میں خط آتے ہیں۔ پرچے آتے ہیں۔ تمہارے بیٹے تم سے ملنے آنے والوں کو باہر نکل کر زور زور سے خدا حافظ اور سلام عرض کرتے ہیں۔ پوسٹ مین سے لے کر آس پاس والے سب جانتے ہیں کہ تم...... کچھ ہوگیا تو...... کیا خبر جنون میں ہماری آنکھیں بھی بدل جائیں......''

شبن میاں نے پھر دیر نہیں کی۔ بستر اٹھایا اور ان کے یہاں چلے آئے۔

شبن نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ ''لیکن...... یہاں بھی تو سب جانتے ہیں آپ کو......''

''ہاں''......

''پاس پڑوس کے مسلمان بھی چلے گئے؟''

''ہاں''......

''کچھ ہوا تو سب سے پہلے ہم ہی......''

اچانک وہ ٹھٹھک گئے۔ کان کھڑا کیا تو معلوم ہوا کلام پاک کی تلاوت کی صدا دھیرے

دھیرے دالان خانے سے نکل کر ان کوٹھریوں سے ہوتی ہوئی باہر کی ہوا میں گونجنے لگی ہے۔ کون ہے......؟ نصیبن ہوگی...... وہی...... اتنی صبح صبح اٹھتی ہے ـــــ پھر فجر کی نماز پڑھنے کے بعد کلام پاک لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن اتنے زور زور سے......

وہ تلملائے ہوئے دالان خانے میں آئے۔ نصیبن جانماز پر جھکی ہوئی۔ دھیمی آواز میں تلاوت میں مصروف تھی۔

''بند کرو۔ بند کرو'' وہ تیز آواز میں چیخے۔ ''لپیٹو۔ جزدان میں لپیٹو''

نصیبن چونک گئی۔ ''یہ کیا ہے؟''

''ایک دن تلاوت نہیں کرو گی تو قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔''

''چھپاؤ میں کہتا ہوں چھپاؤ۔''

انہوں نے جھپٹنا مارنا چاہا تو نصیبن نے ہاتھ تھام لیا۔ '' آپ نے وضو نہیں بنایا۔''

''میں کہتا ہوں'' وہ تلملا گئے۔

''یہ کیا ہوگیا ہے آپ کو۔'' نصیبن نے کاغذ کی نشانی بنا کر صفحہ موڑ دیا۔ ان کی طرف پیار سے دیکھنا چاہا۔ مگر ٹھہر گئیں۔ اتنی ساری جھریاں...... ایک ہی دن میں میاں کے چہرے پر کیسے اگ آئیں؟

''یہ کیا ہوگیا ہے آپ کو؟''

وہ غصے میں چیخے۔ '' کیا ہوگیا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے ٹی وی سے ڈر لگتا ہے...... اخباروں سے ہول آتا ہے...... لاؤڈ اسپیکر پر ہونے والی اذان سے وحشت ہوتی ہے...... مجھے لگتا ہے ٹوپی پہنے ہوئے لوگ نکلیں گے اور مارے جائیں گے۔ اذان ہوگی اور موذن منبر سے اتار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ لوگ نماز پڑھ رہے ہوں گے اور کاٹ ڈالے جائیں گے......''

وہ چیختے ہوئے کمرے میں آئے تو سانس پھول چکی تھی۔ سر میں چکر آرہا تھا۔ غش کھا کر ایک دو جگہ لڑکھڑائے۔ ساعت دھندلی سی ہوتی معلوم ہوئی۔ نیم غنودگی میں ڈوب گئے۔ پھر آنکھیں کھلیں تو جیسے سب کچھ جھل مل جھل مل کر رہا تھا۔ در دروازے، کھڑکیاں سب جیسے انجانے لگ رہے تھے۔

وہ خود سے بڑبڑائے...... ''میرا وطن گم ہوگیا ہے......''

انہیں لگا، وہ لوگوں سے پوچھیں گے تو لوگ ہنسی اڑائیں گے۔ ٹھٹھا کا لگائیں گے۔ وہ ایک دم سے خود کو اکیلا اور اجنبی پارہے تھے...... یہ...... کہاں ہیں وہ؟...... یہ کمرہ...... یہ کس کا کمرہ ہے......؟ وطن؟ ان کا وطن کون سا ہے...... سب جیسے مذاق اڑا رہے ہوں...... تم بے وطن ہو۔ تمہارا وطن ہی کب تھا۔ لڑاکو، جنگجو۔ تم لٹیروں کی طرح باہر سے آئے۔ جی بھر کر لوٹا پھر لاچار مظلوموں پر حاکم بن کر راج کرنے لگے۔ یہاں...... یہاں تھا وطن...... انہوں نے جیسے کہنا چاہا...... اس مٹی میں...... جسے باپ دادا، پردادا نے بنایا...... آشیاں...... سب رہتے تھے...... پیدا ہوئے۔ یہاں۔ اسی مٹی میں...... لیکن...... اچانک جیسے سب کچھ اجڑ گیا۔ علاء الدین کا جن وطن کو اٹھا کر ہوا میں کہیں دور پھینک آیا اور وہ...... بھک منگوں جیسے انداز میں آتے جاتے لوگوں سے دریافت کر رہے ہوں...... صاحبو، میرا وطن کہاں ہے...... میرا ملک کہاں ہے...... میرا ملک گم ہو گیا ہے......

انہوں نے دیکھا، وہ بستر پر پڑے ہیں۔ بستر سے ذرا فاصلے پر نصیبن، شمن میاں، ان کی بیوی بچے، اقبال میاں ان کے بڑے لڑکے کھڑے ہیں۔ آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے سب کو اپنی طرف آنے کو کہا۔ ذہن کی نسیں اب بھی چیخ رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا، بچے، بیوی، شمن پاس آنے میں تامل کر رہے ہیں۔

انہوں نے اشارہ کیا......

شمن آگے بڑھا۔ پیچھے اقبال میاں، ان کے پیچھے نصیبن، مہرو...... ان کی کالج میں پڑھنے والی لڑکی۔

''طبیعت کیسی ہے آپ؟''

انہوں نے اقبال کو دیکھا۔ افسوس آیا۔ ''بے چارہ...... بے وطن......''

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔''

اقبال سرہانے بیٹھ گیا۔ اور ہولے ہولے ان کا سر سہلانے لگا۔ ہاتھوں کی تمازت پا کر آنکھیں جیسے ساون بن گئیں۔

''میرا وطن گم ہو گیا ہے...... میرا وطن......''

اقبال پلنگ سے ایسے اچھلا، جیسے بجلی کا شاک لگ گیا ہو...... ابا جان...... اس نے کانپتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ شمن غصے میں بولے۔ یہی باتیں...... یہیں باتیں ہمیں

ذلیل کرتی ہیں۔"

ذلیل؟ ان کا جی چاہا، اٹھ کر شمن کو طمانچہ لگائیں۔" اس میں ذلیل ہونے کی کون سی بات ہے۔ جس کے ماں باپ مر جائیں وہ یتیم کہلاتا ہے۔ جو ہجرت کر جائے وہ مہاجر۔ جس کا گھر بار، وطن چھن جائے وہ بے وطن ہی تو کہلائے گا۔"

" آپ سو جائیے" نصیبن آگے بڑھی۔

اندرونی جذبات کی چبھن سے وہ پھر چیخے۔" میرا وطن گم ہو گیا ہے۔"

نصیبن کی آنکھوں میں پھر ایک قطرہ طوفان مچلا۔ اس نے آہستگی سے سورہ یٰسین کی تلاوت کرنی چاہی۔ ابراہیم بھائی گلہ پھاڑ کر چیخے۔" بند کرو، ہونٹ سی لو...... چپ رہو خاموش......" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

اقبال کمرے میں ٹہلنے لگا...... پھر اماں کا ہاتھ تھاما۔" چلو ابا کو اکیلے چھوڑ دو۔" شمن کی بیوی، مہرو سب باہر نکل گئے۔ اکیلا شمن رہ گیا اور وہ۔ انہوں نے دیکھا شمن پتھر کی مورت کی طرح دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پلنگ کے قریب آ کر جیسے وہ کسی بم کی طرح پھٹ گیا۔

" دولہا بھائی...... مجھے بھی......" اس کے لفظ تھرتھرائے...... مجھے بھی یہی لگ رہا ہے...... میرا وطن کہیں گم ہو گیا ہے......"

پھر وہ ٹھہرا نہیں۔ اپنے کمرے میں تیزی سے لوٹ گیا۔

(۲)

ڈاکٹر پرکاش ان کے یہاں سے چار قدم کے فاصلے پر تھے۔ کہا جائے تو خاندانی ڈاکٹر۔ جب بھی گھر بلانے کی نوبت آئے تو گھر بلا لو۔ دکھا لو...... فیس دو، نہ دو کوئی بات نہیں۔ دماغ جس طرح پھٹ رہا تھا، اس سے لگتا تھا، ٹیومر ہو گیا ہے...... یوں بھی بڑھاپے میں مرض چھپانا اچھا نہیں ہوتا۔ ڈسپنسری میں پہنچ کر اس نے ڈاکٹر کو نمستے کیا تو ڈاکٹر نے انہیں اشارہ سے قطار میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ سب سے پیچھے ان کا نمبر تھا۔ چار و نا چار بیٹھ گئے...... کیا کرتے...... مگر ایسا پہلے بھی...... انہوں نے یوں ہی آس پاس گھورنا شروع کیا۔ اچانک وہ ٹھہرے۔ ڈاکٹر پرکاش کے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ تھا۔ کمرے میں پہلے دھارمک کلنڈر نہیں ہوتے تھے، اب جا بجا لٹکے

تھے۔طاق پر دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں براجمان تھیں۔اگربتی جل رہی تھی۔

وقت بدل گیا ہے۔بدل گیا ہے۔وہ خود سے بڑبڑائے۔

آدھے گھنٹے بعد ان کا نمبر آیا۔

ڈاکٹر پرکاش مسکرائے۔انہیں لگا،اس مسکراہٹ میں بھی مذاق کے پہلو چھپے ہیں___

''ساری،صبح کا وقت تھا۔اس لیے انتظار کرنا پڑا۔نبض دکھائیے......''

انہوں نے نبض دکھائی۔

''ہوا کیا ہے؟''

''دماغ میں چکر رہتا ہے۔''

''اور؟''

''بلڈ پریشر......''

ڈاکٹر نے بلڈ پریشر چیک کیا۔پھر مسکرایا۔''نارمل!''

''نارمل۔''وہ چونک پڑے۔انہیں لگا،ڈاکٹر انہیں اصلیت بتانا نہیں چاہتا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے''

''نارمل ہے بس۔''ڈاکٹر مسکرایا۔''ویسے تکلیف کیا ہے؟''

''جی۔دماغ میں بم کے گولے سے پھوٹتے ہیں۔آنکھوں کے آگے گول گول دائرے بنتے ہیں۔کبھی کبھی چکر اور اندھیرا سا آجاتا ہے۔''

''گول گول Rings......جیسے بجلی چمکتی ہے؟''

''ہاں......بالکل اور......''وہ بے دھیانی میں بولتے چلے گئے......''اور بس سر پھٹنے لگتا ہے......پھر لگتا ہے......کسی کو پہچان نہیں رہا ہوں......میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ملک نہیں ہے۔میرا ملک گم ہو گیا ہے......''

''وہاٹ......''پرکاش اتنے زور سے چونکے کہ کئی مریض ان کی طرف دیکھنے لگے۔

''جی۔یہی لگتا ہے......''

انہوں نے دیکھا۔ڈاکٹر کی پیشانی پر لکیریں پڑ گئی ہیں۔وہ کچھ دیر تک انہیں گھورتے رہے۔پھر سنبھل کر بیٹھ گئے......''کچھ الگ سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔بتائیں گے؟''

''ضرور ممکن ہوا تو۔''وہ دل ہی دل میں ڈر گئے۔

''سڑک پر مرے ہوئے دو آدمی پڑے ہوں...... ایک ہندو ایک مسلمان۔ آپ پہلے کسے بچائیں گے؟''

''جی......'' وہ اٹک گئے۔ ڈاکٹر مسکرا رہا تھا۔

''اظہر اور تندولکر میں آپ کو زیادہ کون پسند ہے؟''

''جی......''

''ہند پاک ٹیسٹ میچ چل رہا ہو، آپ کس کی جیت پر خوش ہوں گے؟''

''جی......''

ڈاکٹر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔'' آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو کوئی بیماری نہیں۔ آپ صرف ڈر گئے ہیں۔ آپ بہت ڈر گئے ہیں۔ آپ گھر جائیے۔ اگلا نمبر۔''

انہوں نے آواز لگائی آگے بڑھتے بڑھتے ان کو ڈاکٹر کی آواز سنائی پڑی۔'' سن آف بچ۔ یہ آج بھی سمجھتے ہیں کہ یہ یہاں رول کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کب ان مسلمانوں کی ذہنیت بدلے گی۔ رہتے یہاں ہیں کھاتے یہاں ہیں اور......''

وہ سر سے لے کر پیر تک جیسے لرز گئے۔ بدن میں کاٹو تو خون نہیں۔ لرزتے قدموں سے باہر سڑک تک آگئے۔ مگر جیسے خوف سے شرابور تھے۔ بس یہی لگتا تھا، چاروں طرف سے اسٹین گن، کلاشنکوف اور طرح طرح کے ہتھیاروں سے لیس لوگ آئیں گے۔ گھیر لیں گے۔ دنادن گولیاں چلیں گی۔ کوئی ان کے منہ پر حقارت سے تھوکے گا۔ جیب سے دو پلی ٹوپی کھینچے گا اور اسے ہوا میں لہرا دے گا...... لاکھوں کی وحشیانہ ریلی نکلے گی...... رتھ یاتراؤں کا خونی سیلاب سڑکوں پر بہے گا۔ خونخوار چہروں والے ہاتھوں میں مشعل لیے انہیں گھیر لیں گے...... بیہودہ باتیں بکیں گے۔'' دیکھیں کون بچاتا ہے تمہیں۔ تمہارے اللہ میاں آسمان سے آتے ہیں یا نہیں۔''

نظر اٹھاتے ہیں تو دور دور تک کوئی بھی ان کے قبیل کا نظر نہیں آتا۔ مندروں کی گھنٹیاں ٹن ٹنا رہی ہیں۔ ہوا میں شنکھ پھونکے جا رہے ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر سے بھجن کی آواز ۲۴ گھنٹے کانوں میں گونج رہی ہے۔ وہ ذرا آگے بڑھتے ہیں۔ مولانا محمد علی روڈ، مولانا ابوالکلام آزاد روڈ، سر سید روڈ، نور علی گلی، قریش محلہ...... اب ان سارے گلی محلوں کے نام بدل چکے ہیں۔ ان کی نشانیاں، ان کے قصے ایک ایک کر کے مٹائے جا رہے ہیں۔ بدن میں پھر لرزہ سا طاری ہوا...... ہونٹوں سے کپکپی چھوٹی...... میرا وطن...... گم ہو گیا ہے...... اب جیسے خود پر اختیار نہ تھا۔

''آگے بڑھے......

سڑک بارود اڑا رہی تھی۔

رکشہ والے کو روکا......''میرے بھائی، میرے وطن کو دیکھا ہے۔ میرا وطن......؟''

پیدل چلنے والے ایک مسافر کا ہاتھ تھام لیا۔'' سنو بھائی! ایک منٹ کے لئے رک جاؤ......میرا گھر میرا وطن......کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔ سب گم ہو گیا۔ راستہ بتا سکتے ہو؟''

آنکھوں کے آگے جیسے نیلے پیلے اندھیرے جمع ہو رہے تھے۔ یہاں کہاں ڈھونڈیں گے وہ باپ داداؤں کے قصے ___ ولی، صوفی، پیغمبروں کی کہانیاں ___ ان کی شناخت، ان کی نشانیاں ___ یہاں، کم از کم اب یہاں کی مٹی میں تو محفوظ نہیں۔ نہ ہی یہاں کے میوزیم میں...... نہ تواریخ کی کتابوں میں......سب گم کردیئے جائیں گے تو وہ......کہاں ڈھونڈیں گے......اپنے آپ کو؟ اپنے آج کو؟ اپنے کل کو......اپنے باپ داداؤں کو......اپنی تہذیب کو......؟

وہ اپنے دو چار رشتہ داروں' عزیز' شناساؤں سے ملے۔ سب سے وہ یہی پوچھتے تھے......'' صاحبو' میرا ملک، میرا وطن کہیں گم ہو گیا ہے۔ آپ کو......آپ کو بھی کیا ایسا ہی لگتا ہے؟''

ہر جگہ انہیں یہی ٹکا سا جواب ملتا......'' آپ ڈر گئے ہیں۔ آپ خوف زدہ ہیں۔ جایئے ہمیں تنگ مت کیجئے۔''

لیکن وہ کہاں جائیں۔ گھر آتے ہیں تو بیوی بچے سہمے سہمے سے ان کی طرف ایسے دیکھتے ہیں جیسے ابھی رو پڑیں گے۔ ابا کو کیا ہو گیا ہے......اور یہاں ان کی دماغی کیفیت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ لوگوں کو روک روک کر اپنے گم شدہ وطن کے بارے میں پوچھیں۔

اس دن اتفاقیہ طور پر ان کے ایک کلیگ مل گئے۔ وہ ان کے سوال پر چونکے۔ پھر زور سے ہنسے۔

'' آپ لوگوں نے کبھی اس ملک کو اپنا وطن سمجھا ہی نہیں؟''

ان کے دماغ میں دھماکہ ہوا......انہوں نے غور سے دیکھا۔ یہ آدمی......اس آدمی کو وہ برسوں سے جانتے ہیں۔ برسوں انہوں نے ساتھ ساتھ مل کر کام کئے ہیں۔ اور تو اور......سیکولر منچ سے بھی اس آدمی کی کتنی بار للکارتی آواز کو سنا ہے انہوں نے۔ یہ آدمی۔ انہوں نے گھور کر دیکھا ___

وہ آدمی مسکرایا۔ سب بکواس ہے۔ سچ یہ ہے___ یہاں___ اس نے اشارہ کیا۔ وہ تھم گئے۔ آدمی جہاں اشارہ کر رہا تھا، وہاں اس کی پیشانی تھی اور پیشانی پر ترشول بنا تھا۔

''تم بدل گئے؟''

سب کو بدل جانا ہے ایک دن''

''لیکن تم تو......؟''

''غلطی کی جاسکتی ہے تو سدھاری بھی جاسکتی ہے'' وہ ہنسا۔

''میرا وطن''...... وہ لرز گئے۔

'' پاگل پن چھوڑو۔ تمہارا وطن کہیں کوئی تھا ہی نہیں تم شروع سے لٹیرے تھے۔ لٹیرے۔

اس نے زور دیا۔ ہمیں بھی پہلے تو اریخ کا صحیح گیان نہیں تھا۔ مگر اب سچ یہی ہے تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہئے۔''

اس کی آواز بہت مناسب تھی۔ سنبھل سنبھل کر۔ ''تمہیں خود ہی یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ یا یہاں کے طور طریقے، چال چلن اختیار کر لینا چاہئے۔ اس میں غلط ہی کیا ہے؟''

ابراہیم بھائی نے آنکھیں سیدھی کیں تو لگا، سڑکوں پر اس طرح کے آدمیوں کا ایک ریلا اُمڈ آیا ہے۔ سب یہی چیخ رہے ہیں...... ''اس میں غلط کیا ہے۔'' وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر کہہ نہیں پاتے...... وہ دیکھتے ہیں...... وہ اوپر سے لے کر نیچے تک بدل گئے ہیں۔ دھوتی کرتا، ماتھے پر چندن، گھر کے باہر بدلا ہوا نیم پلیٹ، اپنے آپ کو چھپانے والی ساری تدبیروں کے باوجود وہ ہار گئے تھے۔ Psychiatrist——— ابراہیم بھائی نے سوچا ممکن ہے، نفسیاتی معالج کے پاس ان کے زخموں کا علاج ہو۔

(3)

Psychiatrist نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔'' گھبرائیے نہیں سچ سچ بتائیے۔ آپ کو ایسا کب سے لگ رہا ہے؟''

''ادھر چند ماہ سے۔''

''پہلے نہیں لگتا تھا؟''

''اتنا بھیانک نہیں۔لیکن یہ ضرور لگتا تھا کہ ایسا کچھ ہوسکتا ہے۔''

''اب؟''

''اب صرف اسٹین گن اور اسلحہ دھاری پولیس کے بھیس میں ڈاکو نظر آتے ہیں...... ڈر لگتا ہے...... وہ آئیں گے۔ ہماری شناخت مٹائیں گے۔ گھر میں آگ لگا دیں گے۔ ہماری لڑکیوں کی عزت لوٹیں گے۔لڑکوں کو بندوق سے شوٹ کریں گے اور ہماری الہامی کتابوں کو......''

وہ ہانپ رہے تھے۔'' آنکھوں کے آگے گول گول دائرے بنتے ہیں۔ یہ دائرے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے رنگس ...... بلیک اسپاٹ...... پھر آنکھوں میں نیلی پیلی روشنیاں۔ کہیں اندھیرا سا لپکتا ہے۔اور لگتا ہے......'' وہ تیز تیز سانس لیتے ہیں...... میں بے گھر ہوں، بے وطن ہوں...... سب کچھ الٹ پلٹ گیا یا غائب ہوگیا......'' میں سڑک پر آتا ہوں...... لٹالٹا...... لوگوں سے پوچھتا ہوں...... میرے وطن کو دیکھا ہے۔صاحبو! میرا وطن گم ہوگیا ہے۔''

وہ دیکھتا ہے —— Psychiatrist کے چہرے پر بل پڑ گئے ہیں۔وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے۔کافی دیر تک وہ ان کے چہرے کو پڑھتا رہا۔ پھر دنیا بھر کی ادھر اُدھر کی باتیں پوچھتا رہا۔ باپ کو کیا بیماری تھی۔ دادا کو کیا تھی۔ بچپن میں اس کے ساتھ کیا کیا ہوا۔وہ کیا کیا شوق سے کھاتے ہیں۔کون سا رنگ اچھا لگتا ہے۔ چور ڈاکو، ہتھیار کیسے لگتے ہیں۔عجب اٹ پٹے سوال، سرخ مرچ اچھا لگتا ہے کہ ہری مرچ —— گلاب اور کانٹے میں کیا پسند ہے......

'' صاحب۔'' انہوں نے غصے میں اس کی طرف دیکھا۔'' سوال اس کا ہے کہ میرا وطن......''

Psychiatrist اٹھ کر کھڑا ہوا۔It is a matter ofshame وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا......'' ٹھہریئے...... کیا آپ نے کسی مسلم آتنک وادی کو کبھی اپنے یہاں پناہ تو نہیں دی؟''

''جی''

'' سوچیے۔خوب سوچیے۔کبھی انجانے میں۔ممکن ہے آپ کا رشتہ دار ہو۔''

''جی''

'سوچیے۔کبھی کسی برے موقع پر۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا...... آپ نے اپنے گھر پر ہتھیار، بارود وغیرہ تو نہیں بنائے'

''جی؟''

''دنگوں اور فسادات میں آپ نے کسی ہندو کو......؟''

وہ گھبرا کر چیخے...... ''پاگل ہیں آپ۔ آپ علاج نہیں کر رہے...... آپ پریشان کر رہے ہیں مجھے......''

Psychiatrist ان سے بھی زیادہ غصے میں چیخا۔ ''گیٹ آؤٹ۔ نکل جایئے یہاں سے۔ آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ آپ کسی موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ آپ......'' وہ کہتے کہتے ٹھہرا...... ''آپ ایک خطرناک ایرادمی ہیں۔ مجرم۔ آپ...... آپ مسلمان ہیں ـــــ مسلمان ہونا کیا ہوتا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ ٹھہرا۔ پھر آنکھ کا اشارہ کیا۔'' آپ چلے جایئے یہاں سے؟''

وہ نڈھال قدموں سے باہر نکل آئے۔ قدم شل۔ کہاں جائیں۔ کیا کریں۔ ذہن کو سمجھانے کی کون سی تدبیریں کریں۔

وہ خود چاہتے تھے کہ اب یہ مکان چھوڑ دیں۔ کہیں دور چلے جائیں اور سچ تو یہ ہے کہ وہ تہیہ بھی کر چکے تھے۔ مگر عین وقت پر پاس پڑوس والوں کو خبر مل گئی۔ وہ ہاتھ جوڑے ہوئے چلے آئے انہوں نے یقین دلایا۔

''ڈریئے نہیں۔ کچھ نہیں ہوگا آپ کو۔ آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ یہیں رہیں گے۔''

ان کی آواز کمزور سی پڑ گئی۔ ''لیکن ہم تو یہاں اکیلے پڑ گئے ہیں۔''

''ہمیں آپ اپنا نہیں سمجھتے۔ آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

ابراہیم بھائی کو تب پہلی بار لگا تھا، وہ کسی غیر ملک میں ہیں شاید' جہاں انہیں اپنی پناہ گاہ کو' اپنے گھر کو اپنا گھر کہتے ہوئے بھی پڑوسیوں کی صلاح لینی پڑ رہی ہے...... وہ اپنی ہمت، اپنی مضبوطی سب کچھ ان کے سپرد کر چکے ہیں ـــــ

ایک دم سے کمزور، اکیلے اور دبو آدمی۔ بس ان کے بھروسے۔ Psychiatrist کے یہاں سے لوٹے تو طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہوگئی۔ گھر آئے تو کمرے میں بوجھل بوجھل، افسردہ تنہائی کے نوحے کھلے تھے۔ نصیبن، شبن، شبن کی بیوی، اقبال میاں، سب انہیں دیکھ کر کسی حادثہ کی طرح چونک پڑے۔

''آپ یوں کہاں چلے گئے تھے؟''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اقبال دھیرے سے آگے بڑھے۔ کان میں پھسپھسایا۔ ''شبن پر بھی دورہ پڑا تھا۔ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگے ——— اچانک زور زور سے چیخنے لگے ———

''کیا......؟''

''ہاں وہی الٹی پلٹی باتیں۔ میرا گھر کہاں ہے میرا وطن کہاں ہے۔ میرا مکان کہاں ہے۔ میرا ملک گم ہوگیا ہے ابا'' وہ دھیرے سے وحشت کے انداز میں پھسپھسایا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ اب یہ دورے مجھے بھی پڑنے لگے ہیں۔''

انہوں نے سر جھکا لیا۔

ابراہیم بھائی پھر ٹھہرے نہیں۔ انہیں لگا، وہ غش کھا جائیں گے۔ لڑکھڑاتے ہوئے کمرے میں آگئے، پتہ نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ اور آنکھیں لگتے ہی وہ ایک بار پھر سے...... خوابوں کے اس خوفناک ہجوم میں گھرے ہوئے تھے۔

کیا دیکھتے ہیں۔ کہیں جائے اماں نہیں ہے۔ مسلمان یا تو مارے گئے یا بھاگ گئے۔ یا نام اور بھیس بدل زندگی۔ نہیں 'دوزخ بھری زندگی کی کڑواہٹ جھیل رہے ہیں۔ انہیں چاروں طرف چن چن کر مارا جارہا ہے۔ اخبار، الکٹرانک میڈیا، عام بحث و مباحثہ، مشاعرے، ادبی گوشٹھیاں...... سب تصویریں بدل گئیں۔ بس وہ بھاگتے پھر رہے ہیں۔ بھگوڑوں کی طرح ——— ایک جگہ مشاعرہ ہورہا ہے۔ وہ پہنچتے ہیں، تالیاں بج رہی ہیں۔ چہرے پر چندن، پیروں میں دھوتی، ان کا پورا حلیہ بدلا ہوا ہے۔ ایک ۳۲ سال کا نوجوان کچھ پڑھ رہا ہے۔ لوگ تالیاں بجارہے ہیں۔ ہنس رہے ہیں۔ یہ لڑکا۔ انہیں یاد آیا، ایک بار فرقہ واریت کے خلاف ہونے والی کانفرنس میں دریاں بچھاتے ہوئے انہوں نے اس لڑکے کو دیکھا تھا۔ لڑکا کچھ پڑھ رہا ہے...... وہ سنتے ہیں۔

''ایک دن پرانی تہذیب، پرانی سبھیتا کی طرح
دفن کردیے جاؤ گے تم
اتنے گہرے میں، اتنی گہرائی میں
کہ کبھی کسی کھدائی سے برآمد نہیں ہوگے تم۔''

انہیں لگا ان کی سانس، ان کی گرفت سے پھسل رہی ہے۔ دھونکنی کی طرح چل رہی ہے۔ نہیں، وہ تیز چیخ مارتے ہیں۔ وحشی ہورہی آنکھیں ان کی طرف اٹھتی ہیں۔ وہ سرپٹ بھاگتے

ہیں۔

آواز چیختی ہے۔" پکڑلو۔ مسلمان ہے۔ بھاگنے نہ پائے۔ فائر۔ شوٹ"۔

OO

کئی دنوں کی مسلسل تھکن، مسلم بھاگ دوڑ۔ چورڈاکوؤں کی طرح چھپنے چھپانے کے نتیجے میں ان کی داڑھی بڑھ چکی ہے۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک جگہ ٹھہرتے ہیں ایک۔ پیڑ ہے۔ پیڑ کے نیچے حجام بیٹھا ہے وہ حجام کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ استرا' بجاتے' ہوئے حجام ان کے حلیے کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر، چندن ٹیکے کے پاس ابھرے ہوئے سیاہ گٹھے کو......

"تم......"

انہیں لگا، یہ دوکوڑی کا حجام بھی جانتا ہے کہ جو مسلمان بچ گئے ہیں وہ حلیہ بدلے گھوم رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں حجام کے استرے کی دھار نوکیلی ہو چکی ہے اور چمک رہی ہے۔ وہ پھر وہاں سے بھاگتے ہیں حواس باختہ۔ ایک جگہ سے فائرنگ کی آواز فضا میں پھیل رہی ہے۔ رہ رہ کر تیز چیخ فضا میں گونج جاتی ہے۔ زمین پر لاشیں بچھی ہیں۔ چاروں طرف آرمی کے لوگ کھڑے ہیں۔ وہ ایسے خوش ہیں جیسے عام طور پر فتح یابی کے بعد ہوتے ہیں۔ کمانڈر جیسا آدمی گنتی گن رہا ہے......" نور محمد، غلام بخش، سہیل انصاری...... سب مر گئے۔ لاشوں پر پیر دھرتا وہ قہقہہ لگاتا ہے......سب مر گئے—— 12000، 12000 سال بعد اب ہمارا رول ہے یہاں......"

جیسے کبھی پولیس نکسلیوں کا صفایا کرتی تھیں۔ جیسے پولیس چمبل جیسی جگہوں میں چھپے ڈاکوؤں پر حملے بولتی تھی...... ویسے ہی اب...... کونے کترے میں چھپے ہیں ابراہیم بھائی۔ ڈرے ڈرے، خوف زدہ—— کمانڈر فتح سے چیختا ہے...... سب مر گئے......' ہاہہ...... ہہ......"

ابراہیم بھائی کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہ سب...... یہ خواب...... وہ ایسے خواب کیوں دیکھتے ہیں۔ یہ خواب ان کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے۔ وہ جتنا ان مناظر سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے' یہ مناظر اسی شدت سے انہیں دبوچ لیتے۔ کہاں جائیں۔ کہاں امان ڈھونڈیں۔

زیادہ پریشان ہوئے تو پڑوسی نرمل ورما کے یہاں چلے گئے۔ کہانیاں لکھتے ہیں۔

مکان نہ چھوڑنے کی فرمائش کرنے والوں میں نرمل ورما بھی تھے۔ کہا تھا۔" آپ بھی چلے گئے تو ہمارے عقیدے اور بھی کمزور ہو جائیں گے۔ لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ اندر جی بھڑا اس کو

نکالنا ان کے لئے ضروری تھا۔

نمستے آداب کے بعد وہ سامنے بیٹھ گئے ...... ذرا دیر میں مطلب کی بات پر آ گئے ...... وہی بھیانک خواب کی تفصیلات۔ چھوٹے چھوٹے رنگ اور اندر سے حرکت کرتی آواز ......''میرا ملک گم ہو گیا ہے۔''

''گم ہو گیا ہے؟''

نزل ورما نے چونک کر، سگار کا کش کھینچا۔ پھر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ دھیرے سے بدبدائے۔ ''یہ آثار اچھے نہیں ہیں ......''اچھے نہیں ہیں'' ...... وہ پھر سوچ میں پڑ گئے ...... پھر کافی دیر بعد ان کا سکوت ٹوٹا۔

''سچ ہے۔ آپ مانیں گے آپ لوگ کبھی Loyal نہیں رہے۔ اس کنٹری کے لئے۔ لائیل؟ سمجھ رہے ہیں نا؟''

''ایں'......'' وہ ایک دم سے چونک گئے۔

''تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اسلام کی پوری تاریخ۔ آپ بھگوڑے تھے۔ یہاں آ گئے۔ لوٹا تو لوٹا۔ یہاں جم گئے بس گئے۔ کبھی ہندوؤں کو جزیہ کے نام پر نام نہاد تحفظ دیا۔ کبھی تلوار کے زور پر مسلمان بنایا۔'' وہ مسکرائے ...... ہوسکتا ہے، آپ بھی پہلے ہمارے ہی جیسے ہوں۔ آپ کے پوروج کو بھی زبردستی ایمان لانا پڑا ہو۔'' وہ رکے۔ ''سمجھ رہے ہیں نا، آپ لائیل کبھی نہیں رہے۔ تواریخ ڈگھٹنائیں بھری پڑی ہیں۔ آپ نے مندروں کو توڑا۔ مندر کی جگہ مسجد بنائی اور۔ نادر شاہ، چنگیز، ہلاکو، بابر، غوری، اورنگ زیب ...... سمجھ رہے ہیں نا ...... آپ کو ......'' وہ پھر مسکرائے'' یہاں رہنا ہے تو اسلام کا بھارتیہ کرن، کرنا ہوگا اور اس سے بھی زیادہ مسلمانوں کو اپنی لائیلٹی ثابت کرنی پڑے گی۔ اپنی لائیلٹی۔''

ابراہیم بھائی نے غور سے نزل ورما کا چہرہ دیکھا ...... وہاں ایک بدلا بدلا سا آدمی تھا ...... آنکھوں میں ویسی چمک تھی۔ جیسی زہریلے سانپوں میں ہوتی ہے۔ انہیں لگا، اس کی چھوٹی چھوٹی بلی جیسی آنکھوں میں کوئی خطرناک منصوبہ پل رہا ہے ...... اُن کے جی میں آیا کہیں، مجھ سے لائیلٹی چاہتے ہو۔ مجھ سے۔ ارے خاندان در خاندان ...... یہیں جنمے ہم ...... یہیں رہے ہم ...... مدتوں سے برسوں سے ...... اسی مکان میں ...... پلے بڑھے ...... اور اب اس جگہ رہنے یا مستقبل میں رہنے کے لئے وفاداری کے ثبوت اور دستاویز چاہتے ہو تم ...... مگر کس سے کہتے ...... آواز لو

کھڑائی ...... آنکھوں میں اندھیرا اترا ...... ہونٹ سکڑ گئے ...... سب کچھ بھول گئے ...... وہی کمزور دبی آواز منہ سے پھسل پڑی ...... کہاں جاؤں ...... میرا ملک گم ہو گیا ہے۔''

نرمل ہنسے'' آپ غلط سمجھے۔ آپ کا یہ ملک تھا ہی نہیں جو کھوتا یا گم ہوتا۔''

کالا چشمہ اتار کر انہوں نے میز پر رکھدیا۔ کوئی فائیل اٹھالی ...... کچھ پڑھنے لگے ......

پھر ابراہیم بھائی وہاں بیٹھ نہیں سکے۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔

گھر آئے تو دیکھا تکیہ پر سر رکھے مہرن سسک رہی ہے۔ وہ کانپ گئے۔ مہرن میری بچی ...... مہرن کو گھیرے ہوئے شبن، نصیبن اور اقبال میاں کھڑے تھے۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے ......؟'' ان کے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

نصیبن لاغر اور کمزور جانگر کو اٹھائے، بمشکل اٹھی۔ ان کا ہاتھ پکڑا۔ باہر لائی۔ اس کی آنکھیں برس پڑی تھیں 'یہ سب کیا ہو رہا ہے ...... پہلے آپ، پھر شبن میاں، پھر اقبال اور اب مہرن۔ مہرن کو بھی دورہ پڑا ہے۔ بار بار غش آتا ہے۔ روتی ہے اور پوچھتی ہے۔ میرا ملک کہاں ہے۔ میرا ملک گم ہو گیا ہے۔ پھر بے ہوش ہو جاتی ہے۔''

ایک بار پھر وہ سن سے تھے۔ غور سے پیلی پڑی مہرن کا چہرہ دیکھا۔ یا اللہ کہنا چاہا۔ آواز نہیں نکل سکی ...... ادھ مرا سا محسوس کیا خود کو ...... کلیجہ کانپا ...... مگر آنکھوں سے آنسو کے سوتے بھی سوکھ چکے تھے۔ پھر ٹھہرے نہیں۔ لرزتے قدموں سے کمرے میں لوٹ آئے۔ کچھ ہونے والا ہے ...... کا احساس رہ رہ کر دل میں ڈر اور خوف کی بارش کر رہا تھا۔

شام ہو گئی۔ شام کو ملکانی صاحب، نرمل ورما، اور پاس پڑوس کے کئے لوگ ان سے ملنے آئے۔ جیسے کوئی انہونی ہو چکی ہو ...... اندر تک ٹھنڈی لہر اترتی چلی گئی۔

'' آپ ...... آپ لوگ ......؟''

انہیں محسوس ہوا ...... آواز طاقت کھو چکی ہے۔

نرمل ورما آگے بڑھے۔'' ابراہیم بھائی، ہم آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتے۔''

ان کی آوز ڈوب گئی ......'' کیا کہہ رہے ہیں آپ لوگ ...... میں کچھ سمجھا نہیں۔''

ملکانی آگے بڑھے۔'' فضا ٹھیک نہیں ہے ابراہیم بھائی۔ اگر کچھ ہو گیا تو ہم الزام اپنے سر نہیں لے سکتے۔ ہماری جانیں بھی جوکھم میں پھنسی ہیں۔''

نرمل بولے۔'' بہتر ہے آپ آج رات ہی ...... یا بہت بہت کل صبح کہیں بھی چلے

جائیں۔'' ان کے آخری الفاظ پھس پھسے تھے۔

''کسی محفوظ جگہ......''

''ڈم......ڈم......ڈم......''

جیسے ڈرم پیٹا جاتا ہے۔ جیسے قبائیلیوں کا رقص ہوتا ہے۔ فلموں میں، قصوں میں، کہانیوں میں ___ جیسے کسی انسان کی بلی چڑھاتے ہیں......ڈم......ڈم......ڈم۔

ڈم......ڈم......ڈم......

آواز تیز ہوتی جاتی ہے......

OO

احمد آباد۔ 302 میل ___

سنگ میل پر 302 کے حروف جگمگا رہے ہیں ___ بیوی بچوں کے ساتھ اچانک بھاگتے بھاگتے وہ ٹھہر گئے ہیں۔ 302۔ دفعہ نمبر 302۔ پھانسی۔ سزائے موت۔ آنکھوں میں پھر چکر آرہے ہیں...... گول گول دائرے......سب کچھ سرخ سرخ...... وہ جیسے انصاف کی، کسی بڑی عمارت میں ہیں۔ انصاف سنایا جا چکا ہے۔ ملزم کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ملزم مسلمان ہے۔ ملزم نے اس ہندو بھارت میں جنم لیا ہے۔ تعزیرات ہند۔ دفعہ ۳۰۲ کے تحت ملزم کو......

اب اُنہیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔

انصاف کی بڑی سی عمارت' بھی اندھیرے میں کھوگئی ہے۔

OOO

یہ کسی تھکی ہوئی رات کی داستان نہیں ہے

"سارا کچھ بس تبدیل ہوا چاہتا ہے۔ یقیناً تم بھی دیکھو گے" شمو بھائی نے اتنی زور سے مکا مارا کہ میز پر رکھے شراب کے گلاسوں میں تھرتھراہٹ دوڑ گئی۔

پرویز احمد نے جیب سے ٹرپل فائیو نکال کر سگریٹ سلگایا...... "ممکن ہے ایسا ہوتا ہو۔ مگر تعجب ہے......"

وہ دیر تک "تعجب" ہے کی گردان کرتے رہے...... میز پر اب شراب کے خالی گلاس پڑے تھے—— "آفیسر چوائس" کی بوتل خالی تھی اور اس کی شراب ہمارے اندر اتر کر دماغ میں کھلبلی مچا رہی تھی۔

شمو بھائی نے پھر زور سے کہا۔ "تبدیلی ایک الگ چیز ہے اور تبدیلی ضروری بھی ہے۔ دنیا گھومتی ہے۔ زمین کے نیچے پڑا قارون کا خزانہ گھومتا ہے،...... اور ایک خاص وقت میں...... میں تو کہتا ہوں اگر اسے مذہب سے نہیں جوڑا جائے تو...... اور اگر جوڑ بھی لیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں سب کچھ الٹا پلٹا ہو سکتا ہے، یعنی ہم جانور بننے کی حد تک جانور بن سکتے ہیں یا جانور انسان بننے کی حد تک انسان...... نہیں، شاید اپنی بات ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں پا رہا ہوں...... مسٹر کمال تم ہی کہو——"

وہ لاچاری سے، بے بسی سے اپنے کمزور لفظوں کا ماتم کرتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

"میں......!" میں تھوڑا جھجکا۔ مگر صداقت یہ تھی کہ اس بحث کا آغاز بھی میں نے ہی کیا تھا۔ میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

'' تو میرے معزز دوست...... ! یقین کیجئے جو میں کہنے جارہا ہوں وہ میری موجودگی کے امکان تک، جو آپ بھی اس وقت محسوس کر رہے ہیں، صحیح ہے۔ درست ہے اور اس میں شک کرنے جیسی کسی بات کو دخل نہیں......''

پرویز احمد نے اس طرح سے منہ بنایا جیسے اسے میری تمہید ناگوار خاطر گذری ہو۔

میں نے گہرا سانس کھینچا۔ '' مجھے معاف کیجئے گا، مجھے قصہ بیان کرنے کا ہنر نہیں آتا۔ مگر اس دن۔ میں سچ کہتا ہوں۔ میری بیٹی نے جو بھی کانوینٹ میں پڑھتی ہے، بڑی سمجھدار ہے آپ اس سے ملے ہیں...... وہی ایلیشا کمال، آپ اسے بے بی یا کسی دوسرے نام سے پکار کے تو دیکھئے—— آپ کا جینا اگر دو بھر نہیں کر دے تو پھر بے شک میرا نام بدل دیجئے۔ ایلیشا کمال، وہ اسی نام سے آپ کو ملے گی اور آپ سے بھرپور قابلیت اور ذہانیت کی باتیں کرے گی۔ میری بیٹی مجھ سے برابر کہتی ہے...... دیکھئے تعجب مت کیجئے گا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سو فیصدی سچ ہے...... کہ ڈیڈی ادھر بہت دنوں سے میں نے جلتا ہوا مکان نہیں دیکھا،...... اور آپ یقین کریں کہ کسی دھواں دیتے مکان کی سچی تصویر کھینچنے کے لئے وہ کس قدر پریشان ہو چکی ہے—— ہندستانی معاشرہ میں سانس لینے والے ایک باپ کی حیثیت سے، آپ سمجھ سکتے ہوں گے، بیٹی کی کیفیت دیکھ کر مجھے کس قدر کوفت اور تکلیف ہوتی ہوگی...... نہیں آپ فرض نہیں کر سکتے مگر اس دن ...... ایک اور پیگ بنالوں۔ اس کم بخت آفیسر چوائس کا بھی جواب نہیں۔''

''نہیں مسٹر کمال......!'' شمو بھائی نے ناراضگی دکھائی '' آپ پہلے ہی بہت پی چکے ہیں''

'' اوہ۔!'' ہاں تو میرے معزز دوستو...... اس دن آپ کو شاید یاد ہوگا—— دسمبر کی 26 تاریخ تھی—— اور آس پاس کے مکانوں سے دھواں اٹھتے ہوئے کچھ ایسے دکھتا تھا، جیسا کہ میں بچپن میں دیکھا کرتا تھا—— اپنے نانیہال والے گھر کے پاس والی چمنی سے دھواں اٹھتے ہوئے—— اور آپ مجھے ایک کمزور باپ سمجھ کر معاف کر دیں—— میں نے دیکھا، ایلیشا کمال کے چہرے پر حیرت کی حد تک خوشی کی جگمگاہٹ تھی—— وہ ممی پر قدرے خفا تھی—— کہ تم کچھ بھی سنبھال کر نہیں رکھتیں ممی...... تم میں یہی بری عادت ہے، میرا وہ جاپان والا کیمرہ کہاں ہے۔؟ جو مارگریٹ آنٹی نے دیا تھا۔

صوفے پر چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے میں نے بھی، اپنی جانب سے ایک کمزور باپ کی طرف سے مدافعت کی ــــــ ''ایلیشا بیٹی، باہر گھر جل رہے ہیں......''
وہ کسی بھری ہوئی شیرنی کی طرح مجھ پر یعنی اپنے باپ پر جھپٹی...... ''تو...... مجھے بھی معلوم ہے ــــــ لیکن آخر آپ چاہتے کیا ہیں ڈیڈی۔ کیا آگ لگنا میری دانست میں ــــــ کم از کم میرے لئے...... لیکن آپ نہیں سمجھیں گے۔ آپ تو وہ ہیں کہ صبح میں ایک کپ چائے اخبار سے پہلے آپ کو دینا کوئی بھول جائے تو آپ گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں...... نہیں، ایسا ہے تو آپ کو میری بات سمجھنی چاہئے ــــــ کہ جو رشتہ ایک کپ چائے سے آپ کا ہے وہی ــــــ اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ آگ اور دھواں کو دیکھنا۔'' بات پوری نہ کرنے کی صورت میں وہ تھوڑی تلملائی بھی تھی ــــــ ''میں ضروری نہیں سمجھتی ڈیڈی کہ آپ کو ہر بات کی وضاحت کرتی چلوں۔''
''نہیں...... تم ایک سمجھدار لڑکی ہو۔ ویسے ہر بات کی وضاحت ضروری بھی نہیں۔...... میرے چہرے پر جیسے کہ اس طرح کے موقع پر ایک پھیکی ہنسی آ جاتی ہے،...... مجھے کہنے دیجئے، میں اپنی ضدی اور سرکش ایلیشا کمال کی باتوں کی تائید میں ہاں میں ہاں ملا رہا تھا ــــــ ایک کمزور باپ کی طرح۔ نہیں میرے معزز دوستو! آپ اداس مت ہوئیے۔ یہ ہم جیسے تمام باپوں کا مقدر ہے اور میں کہتا ہوں، اس سے زیادہ ہو بھی کیا سکتا ہے۔ میرے ہاتھوں میں شاید اس دن کا اخبار بھی تھا جس میں مرنے والوں کی اور...... مجھے کہنے دیجئے ــــــ مختلف طریقوں سے مرنے والوں کی خبریں اتنی کم تھیں کہ مجھے پورا اخبار ہی غیر دلچسپ، باسی اور مسکرائیے نہیں ــــــ جھوٹا محسوس ہوا۔ میں نے ایلیشا کی طرف دیکھا جس کے غصے سے بھرے چہرے پر یکسر مل جانے کی وجہ سے گمشدہ ایکسائٹمنٹ لوٹ آیا تھا ــــــ پھر وہ ممی کو لیے ہوئے تیسری منزل کی سیڑھیاں تیز تیز طے کرنے لگی۔

پرویز احمد نے برا سا منہ بنایا۔ چھوٹی سی بات ہے، اتنی تمہید کی ضرورت نہیں ــــــ میرے بچے کو بھی دھواں پسند ہے اور میں بتاؤں۔ یوں تو وہ محض آٹھ سال کا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کاغذ کی جھونپڑیاں بناتا ہے ــــــ پھر انہیں آگ دکھاتا ہے۔ پھر خوش خوش اپنی ممی کو آواز لگائے گا کہ ممی دیکھو، جھونپڑی جل گئی ــــــ وہ اتنے مزے میں کہتا ہے کہ ہمیں سنتے ہوئے اچھا لگتا

ہے کہ کاش وہ کاغذ کی ایسی ہی کئی جھونپڑیاں بناتا اور انہیں آگ دکھاتا.....'

شمو بھائی نے منہ بنایا۔" کوئی نئی بات نہیں مسٹر کمال! آپ آگے کہیں۔"

" آگے ...... میں آنکھوں کے سامنے ایلیشا کو اوپر چھت پر دیکھ رہا تھا۔ وہ ایسے ایکسائیڈ تھی جیسے بچپن میں، میں پہلی بار پیرس، سمندر اور تاج محل کو دیکھ کر ہوا تھا۔۔۔۔۔ آپ بخوبی جانتے ہیں۔۔۔۔۔ ہمارا گھر تین منزلہ ہے۔۔۔۔۔ تیسری منزل سے سارا شہر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ شر پسندوں نے جو دو چار گھر پھونک ڈالے تھے یہ اسی کا دھواں تھا۔۔۔۔۔ آگ اور دھوئیں کی کالی لپٹوں سے آسمان بھر گیا تھا۔ معزز دوستو! آپ فرض نہیں کر سکتے میری ایلیشا اس موقع پر کیسی خوش تھی۔ وہ آگ کی لپٹوں اور آسمان پر پھیلے دھوئیں کو کیمرے میں اضطرابی جوش کے ساتھ نظر بند کرنے لگی تو میری بیوی چلائی۔ ٹھہرو۔ اور پھر وہ چھت کی منڈیر پر گالوں پر ہاتھ رکھ کر کسی قدر بے نیازی ظاہر کرتی ہوئی پوز دینے لگیں کہ۔۔۔۔۔ "ہاں ایلیشا اب تصویر لے لو۔" میں نے دیکھا۔۔۔۔۔ میری بچی کے چہرے پر صبح کی تازگی اور سکون کی آمیزش تھی۔ وہ مسکرائی بھی۔" ممی جلتے ہوئے مکان، تم اور تمہاری مسکراہٹ۔ وہاٹ اے ونڈرفل آئیڈیا۔ دھواں میں تو کہتی ہوں کہ یہ تصویر اس ملک سے باہر چلی جائے تو کوئی بڑا انعام ضرور جیت کر لائے گی۔"

" اور میرے معزز دوستو! ٹھیک اسی وقت راکسی ہمیں نیچے نہ پا کر پونچھ ہلاتا ہوا اوپر چلا آیا تھا۔ بھونکتے ہوئے اس نے اپنی خفگی کا اظہار بھی کیا کہ ہم اسے بغیر بتائے کیوں چلے آئے، دو چار بار وہ مجھے بھی دیکھ کر بھونکا۔ پھر میرے پیروں کے پاس آکر دم ہلانے لگا۔ ایلیشا نے چلا کر کہا " راکسی، ادھر ممی کے پاس چلو کھڑے ہو جاؤ۔" وہ دھوئیں، ممی اور راکسی کو کسی مخصوص پوز میں کیمرے میں بند کرنا چاہتی تھی۔

باہر جب کہ آگ لگی ہوئی تھی۔ دھواں اٹھ رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا۔۔۔۔۔ مجھے ایک کمزور باپ کو...... آپ ہنسیں گے نہیں۔ اس وقت بھی جس وقت ایلیشا اس پُر آشوب منظر کی تصویریں لے رہی تھی۔۔۔۔۔ نہیں، آ ہ نہیں گے نہیں، میں کچھ کہنے کی ہمت جٹا رہا تھا۔۔۔۔۔ کیوں کہ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ سب کچھ بدل رہا ہے اور یہ میرے گھر والے ابھی سے اس طرح اپنی دیکھنے والی عینکوں کو نہیں بدلیں گے تو...... شاید سب کچھ بہت جلد بدل جائے۔ نہیں شمو بھائی،

میں نے پہلے ہی کہا ہے آپ ہنسیں گے نہیں، میں سچ بول رہا ہوں میں نے ایلیشا کو ڈانٹ پلائی تھی ـــــ صحیح معنوں میں شمو بھائی ایک باپ کی طرح ـــــ ایلیشا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔''

''تو کیا پھر اس نے بھی آپ کو......'' شمو بھائی پر ہنسی کا دورہ پڑا تھا۔

''دیکھئے، اب آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا، جب کہ میں نے حقیقت بیان کی ہے، میں ماں بیٹی پر خوب ناراض ہوا اور وہ راکسی...... سچ کہتا ہوں ـــــ ساری کہانی بس یہیں سے شروع ہوتی ہے ـــــ باہر آگ دھواں اور تصویر لیتی ایلیشا۔ پھر ہم تینوں کی زبردست جھڑپ اور راکسی کا ہمیشہ کی طرح سہمے سہمے انداز میں یہ سب دیکھنا ـــــ جبکہ ایلیشا چلائی بھی تھی کہ ڈیڈ Communalism جیسی گپ کو اخباروں نے بھی چھاپنے سے انکار کر دیا ہے ـــــ اور آپ بہرکیف...... اصل بات تو یہی ہے کہ میں لڑائی کر کے ریڈنگ روم میں ہی سو گیا۔ رات کا پچھلا پہر بیت گیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے کمرے میں کسی کے بولنے کی بھنبھناہٹ سنائی پڑی، آواز اس قدر دھیمی اور مہذب تھی کہ نیند اچٹ گئی۔ کیا یہ کوئی خواب تھا...... لیٹے لیٹے میں نے دروازے کی طرف دیکھا...... دروازہ شاید رات میں کھلا رہ گیا تھا۔ اب مجھے خوف کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ کوئی قریب ہی کھڑا تھا اور میں اس کی باتوں کو صاف سن رہا تھا۔ وہ جو بھی تھا۔ لیکن مجھ سے یوں مخاطب تھا۔

''سنئے آپ ہماری درندگی اور جبلّت سب کچھ لے چکے ہیں ـــــ نرم شائستہ لہجہ ـــــ آپ سن رہے ہیں نا ـــــ مہینوں میں، برسوں میں اور شاید صدیوں میں آپ تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے انسان ہونے کے خطرے کو ـــــ (ہنسی) کم کرتے رہے ہیں ـــــ برا مت مانیے ـــــ انسان تو آپ کو اپنے علاوہ پسند تھے نہیں ـــــ جانور آپ کے پالتو بن چکے تھے...... آہ، سن رہے ہیں نا، خیر۔ اس غیر دلچسپ گفتگو سے مجھے کوئی لینا دینا نہیں۔ میں صرف اتنی التجا کرنے آیا ہوں کہ اگر آپ کو ہم سے کچھ لینے کا حق ہے تو ہمیں بھی ـــــ آپ سمجھ رہے ہیں نا ـــــ آپ ہم سے ہماری جبلّت لے چکے ہیں ـــــ آپ اپنی تھوڑی سی انسانیت ہمیں دے سکتے ہیں''

شمو بھائی نے پینترا بدلا۔

پرویز احمد نے ٹرپل فائیو کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی ——— میں اپنی دھن میں مزید آگے بڑھا۔ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن یہ ہمارا راکسی تھا ——— جو رات کے کسی پہر نیند نہ آنے کی وجہ سے چپ چاپ میرے کمرے میں داخل ہو گیا تھا ——— اور اب میرا پاؤں سہلا رہا تھا۔ میں نے جھٹ اٹھ کر بلب روشن کیا۔ اور سچ کہتا ہوں، راکسی کی آنکھوں میں ......''

شمو بھائی نے زور سے ایک مکا میز پر مارا ——— '' درست ہے بالکل درست ہے، ایک وقت آتا ہے جب ہر شے اپنی اصل سے فرار چاہتی ہے، اور کسی دوسرے روپ میں منتقل ہونے کے لئے زور مارتی ہے، اور اگر تم نے یہی کچھ یہاں سنانے کے لیے ہمیں بلایا ہے تو......'

پرویز احمد نے دھیرے سے ان کا ہاتھ پکڑا، بیٹھنے کا اشارہ کیا!! ہاں تو آگے کیا ہوا۔؟

میں نے پھر آفیسر چوائس کے ایک چھوٹے پیگ کی طلب ظاہر کی ——— 'شمو بھائی کے منع کرنے پر بھی میں نے قصہ کو جاری رکھا ———، ہاں تو معزز دوستو، اس رات۔ اور سچ کہوں تو کہانی بس ایک رات کی ہی ہے۔ اف معاذ اللہ، کیسی خوفناک تاریک رات تھی جس رات ایلیشا کمال آگ کی لپٹوں اور دھواں کی تصویر لے رہی تھی۔'' نہیں شمو بھائی میں نے ایلیشا کو سچ مچ ڈانٹا تھا۔''

'' یہ کیا بات ہے ایلیشا، باہر مکان جل رہے ہیں اور تم تصویریں اتار رہی ہو۔'' اور ایلیشا کا جواب تھا۔

'' مجھے مزا آتا ہے ڈیڈی، ایسی تصویریں اتارتے ہوئے، میں صحیح معنوں میں پاگل ہو جاتی ہوں۔''

میں نے ہونٹ چبائے '' یہ سب وحشی پن ہے، میں کہتا ہوں پوری قوم غیر مہذب ہوتی جا رہی ہے'' ——— میں شاید چلایا تھا۔ تم نہیں جانتیں ایلیشا! شر پسندوں کا اگلا نشانہ ہمارا اپنا گھر بھی ہو سکتا ہے۔''

میں نے سوچا تھا کہ یہ جملہ جیسے ہی میرے منہ سے ادا ہوگا، اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چپی چھا جائے گی، وہ بوکھلا جائے گی۔ سہمی سہمی سی اپنی غلطی کی معافی مانگے گی۔ مگر نہیں میرے معزز دوستو، اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا جوش تھا۔

'' اوہ ڈیڈی۔ کیا سچ مچ ایسا ہوگا۔ نہیں آپ مذاق کر رہے ہیں، آپ نہیں جانتے ،

دھویں سے مجھے کتنا پیار ہے۔''

''پاگل......'' میں دوبارہ چلایا۔'' ابھی شاید تمہیں فساد کا تجربہ نہیں ہے ـــــ فساد میں جانتی ہو اور کیا ہوتا ہے ـــــ ظالم صرف گھر ہی نہیں جلاتے ہیں بلکہ کمسن اور جوان لڑکیوں کو کھینچ کھینچ کر......''

ایلیشا نے جیسے سحر زدہ ہو کر میری آنکھوں میں جھانکا......'' آپ اپنے لفظوں سے مجھے بے خود اور پاگل بنا رہے ہیں ڈیڈی۔ وہ مسکرائی تو اس کی آنکھوں میں شیرنی جیسی چمک تھی۔ آپ ہمیشہ بھول جاتے ہیں، جبکہ آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارا جنم ہی آگ اور دھویں کے درمیان ہوا ہے ـــــ ممی کہتی ہیں نا کہ جب میں پیدا ہوئی تھی تو شہریوں جل رہا تھا جیسے دیوالی منائی جا رہی ہو۔'' ایلیشا سامنے والے صوفے پر دھنستی ہوئی بولی۔'' اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ہسٹری کی اسٹوڈینٹ ہوں ـــــ قتل وغارت، قوموں کی جنگ اور ورلڈ وار...... یہ سب میرے پسندیدہ موضوعات ہیں'' وہ ہنس رہی تھی۔'' اب آپ ان پر لکچر پلا کر زیادہ بور نہیں کریں گے ڈیڈی ـــــ میں کہہ سکتی ہوں، مجھے ان سب سے پیار ہے۔''

پھر ایلیشا کوئی انگریزی گانے کی دھن گنگناتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے ایلیشا کی ممی کو بلا کر سمجھایا۔

''اسے روکو! وہ پاگل ہو رہی ہے۔''

ممی نے برا سا منہ بنایا۔'' شادی کے فوراً بعد تمہیں بیٹا چاہئے تھا۔ اس لیے اس کی ہر بات میں پاگل پن نظر آتا ہے۔''

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا کہ اس بڑھاپے میں، میں اس کے اندر اپنی بچی، اپنی ایلیشا کو جوں کا توں اترتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میرے لیے یہ حیرت انگیز انکشاف تھا۔

''دھواں تمہیں اچھا لگتا ہے کیا۔؟''

اس نے پلٹ کر جوابی حملہ کیا۔'' تمہیں اچھا نہیں لگتا کیا؟ یاد ہے جب گیس کے چولہے کا رواج نہیں تھا تو ہم کچے چولہوں پر کھانا بناتے تھے ـــــ باہر اوسارا باورچی خانے کی دیواریں سب دھویں سے بھر جاتی تھیں۔ تم برآمدے میں ہی کرسی نکال کر کتاب پڑھتے تھے۔ میں چلاتی بھی تھی کہ دھواں ہو رہا ہے ـــــ آنکھیں خراب ہو جائیں گی اور تمہارا جواب ہوتا تھا''

دھویں سے آنکھیں پڑ پڑاتی ہیں تو اچھا لگتا ہے۔"

"تب جوانی تھی، جوانی میں ایسی سب پاگل حرکتیں اور عادتیں اچھی لگتی ہیں۔"

"تو ایلیشا کو کیوں منع کرتے ہو، یاد ہے جس روز وہ پیدا ہوئی تھی اس روز بھی شہر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر جب وہ اسکول جانے کو ہوئی تب بھی ہر دوسرے پانچویں مہینے یہی عالم رہا۔ ہمیں بھی یہ سب دیکھتے ہوئے اب برسوں گزر چکے ہیں، اور ایلیشا کا تو بچپن ہی اس کے سائے میں پلا ہے۔" وہ مسکرائی، "یہ دھواں اس کا دوست بن چکا ہے۔"

"لیکن کل معاملہ بھی تو دوسرا تھا، کم از کم اتنا خطرہ نہیں تھا۔"

"ہٹو......" اس نے بے دردی سے میری بات کاٹ دی، "خطرہ بس تمہاری گفتگو اور تمہارے لفظوں میں ہے ـــــ بیٹھے بیٹھے جب خود کو بہت بوڑھا محسوس کرتے ہو، تو ڈر جاتے ہو ـــــ میں تمہاری طرح بوڑھی نہیں ہوئی ہوں۔"

میں نے دیکھا، اس نے ایلیشا کے گانے کی بھونڈی نقل کی تھی ـــــ اور شاید اسے ایلیشا کی نقل کرنی بھی چاہئے تھی۔ کیوں کہ اب وہ پہلے والی مسز کمال نہیں تھی، جو ایک معمولی سا افسر تھا، اب اسے بھی یہ حق حاصل تھا کہ وہ دوسرے افسران کی بیویوں کی طرح کلب جائے اور کلب میں اپنے رنگ ڈھنگ کچھ ایسا ہی رکھے جیسا کہ ایلیشا رکھتی ہے یا دوسرے افسران کی بیویاں۔ ہاں بیشک، مجھے اس کے بہروپ پر تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں، کیوں شمو بھائی۔؟"

پرویز احمد نے ٹرپل فائیو سے دوسرا سگریٹ نکال لیا۔

شمو بھائی بوجھل ہو کر بولے۔ "اس رات؟"

"آپ نے خبر پڑھی ہوگی، فساد کی لپیٹ میں ہمارا محلہ بھی آ گیا تھا۔" میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہاں ـــــ" شمو بھائی نے خاصی بیزاری اور اکتاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"شام تک خبر آ گئی کہ شر پسندوں کا ارادہ آج ہمارے محلے پر حملہ بولنے کا ہے اور ہمیں بھی اس کے لیے تیار رہنا چاہئے ـــــ آس پاس کے گھروں میں کوئی بھی اس رات نہیں سویا۔ میرے پڑوسی نے مجھ سے آ کر دریافت کیا۔"

"آپ کے پاس لائسنس والی بندوق وغیرہ تو ہے نا......؟"

''ہاں......''

''اسے سڑک کی طرف تانے ہوشیار رہے گا۔''

میں نے دریافت کیا۔''اگر مان لو، بھیڑ حملہ کرنے پر اتر آتی ہے اور بچاؤ کے لئے گولی چل جاتی ہے...... کوئی زخمی ہوتا ہے یا ہلاک ـــــ تو اس صورت میں دفعہ ۳۰۲ تو نہیں بنتی۔''

پڑوسی نے مضحکہ اڑایا۔''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ ـــــ آپ جو کچھ بھی کریں گے اپنا گھر اپنی جان بچانے کے لئے کریں گے ـــــ یاد رکھئے، باہر سڑک کی طرف بندوق تان کر۔ ہشیار۔ ویسے ہم سب تیار ہیں۔''

میں کمرے میں آیا تو ایلیشا ریکارڈ پر کسی انگریزی ڈانس کی پریکٹس کر رہی تھی۔

''بند کرو......'' میں زور سے چلایا۔

اس نے گھوم کر ناگواری اور غصے سے میری طرف دیکھا۔

'' آج کی رات جنگ کی رات ہے ـــــ باہر سے حملہ ہو سکتا ہے ـــــ ہمیں تیار رہنا چاہئے۔''

میں ذرا اونچی آواز میں بولا۔ پھر ٹھہر گیا، میں نے محسوس کیا، میری آواز میں بھی کسی خطرے اور خوف کو دخل نہیں تھا ـــــ بلکہ ابھی جو مکالمہ میرے منہ سے نکلا تھا اس میں بھی ایک طرح کا ایکسائٹمنٹ پوشیدہ تھا۔ مجھے کیا چاہئے، مجھے اتنا دکھ ہوا کہ جوابی حملے کے طور پر میں نے زور زور سے بجتا ہوا ریکارڈ آف کر دیا ـــــ ''ہمیں حکم ہوا کہ ہم چھتوں پر بندوق تان کر تیار رہیں اور گھر کی تمام بتیاں بجھا دیں ـــــ اور اس سے پہلے ـــــ آپ کو تعجب ہوگا ـــــ میرے چہرے پر سراسیمگی کی جگہ مسکراہٹ تھی۔ کیوں نہ ایک ایک کپ گرما گرم چائے ہو جائے۔''

OO

باہر سے ہنگامے کی آواز آ رہی تھی۔ ہم آرام سے کمرے میں چائے پی رہے تھے باہر شاید پورا محلہ جمع تھا ـــــ ایلیشا کی آنکھوں میں جنگلی بلیوں جیسی چمک تھی ـــــ میں نے تیز آواز میں کہا۔ چائے جلدی ختم کرو، پھر اوپر چلیں گے'' مجھے خود پر بار بار غصہ آ رہا تھا ـــــ باہر

پڑوسی کس قدر پریشان ہیں۔ مجھے جتنا پریشان ہونا چاہئے تھا میں نہیں ہوں ــــــ، اس کے برخلاف راکسی ہر جگہ خطرے کی بو سونگھتا چل رہا تھا۔ وہ ہم سے زیادہ پریشان تھا اور بار بار اوپر نیچے کر رہا تھا ــــــ" کبھی دروازہ جھانک کر چلا آتا ــــــ پھر سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا جاتا۔ اس کے بعد ہمارے کمرے میں واپس آ کر بے چینی سے پونچھ ہلانے لگتا۔ جیسے ہمیں سونے سے جگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

چائے پینے کے بعد ہم اٹھے تو ایلیشا نے چہچہاہٹ کے انداز میں کہا...... "ڈیڈی میں وہ مارگریٹ آنٹی والا کوٹ پہن لوں، جسے پہن کر میں پوری انگریز لگتی ہوں"

"ہم گھر میں ہیں ــــــ کسی پکنک پارٹی میں نہیں جا رہے ہیں۔" میں نے لہجہ کو بھاری بناتے ہوئے کہا" باہر دھواں اٹھ رہا ہے......"

"اوہ...... میں تو بھول ہی گئی تھی ڈیڈی، اچھا وہ جاپان والا کیمرہ لے لوں۔"

اس سے پہلے کہ میں ناراضگی یا خفگی کا اظہار کرتا ــــــ باہر گولی دغنے کا دھماکہ ہوا، ہم سے پہلے راکسی تیز تیز سیڑھیاں پھلانگتا ہوا کوٹھے پر بھاگ گیا۔

سڑک سنسان ہو رہی تھی، بندوق کی نال سڑک کی طرف تانے ہم چھپ کر بیٹھ گئے۔ آس پاس کے گھروں سے ایسی کئی کھڑکیاں (ممکن ہے میرا خیال ہو) وحشت زدہ سی باہر کو جھانک رہی تھیں۔ ہمیں ایک ہی طرح سے بیٹھے بیٹھے گھنٹوں گزر گئے تھے ــــــ مگر ہم کس بات کا انتظار کر رہے تھے؟ راکسی بار بار پونچھ ہلاتا ہوا اوپر سے نیچے کر رہا تھا۔ ایلیشا کچھ دیر سانس روکے بیٹھی رہی، پھر اکتا گئی تو منع کرنے کے باوجود مارگریٹ آنٹی والا کوٹ پہن کر اوپر گئی ــــــ اور چھت پر مزے لے لے کر ٹہلنے لگی ــــــ دو تین گھنٹے جب اسی حال میں گزر گئے تو میں نے پلٹ کر بیوی سے کہا، چلو چلتے ہیں، کچھ بھی نہیں ہوا بندوق پکڑے پکڑے ہاتھ درد کر گئے۔"

شمو بھائی نے برا سا منہ بنایا۔" جب کچھ بھی نہیں ہوا، پھر کیا سنانے کے لیے آپ نے ہمیں یہاں روک رکھا ہے......"

" کیوں نہ دوسری آفیسر چوائس کھول ہی لی جائے میں دھیرے سے مسکرایا۔ اس لیے

کہ جو بات اب آپ کو سنانے والا ہوں اس کے لئے...... یہ بھی ممکن ہے آپ ماننے سے ہی انکار کریں، مگر میرے معزز دوستو، آپ بہتر جانتے ہیں، مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اسی کے ساتھ میں نے اپنے لیے ایک بڑا سا پیگ تیار کر لیا گلاس ہونٹوں سے سٹایا پھر تلخی بھرا گھونٹ معدے میں اتارتا ہوا بولا۔

"دوستو! مجھے خود بھی اس بات کی حیرانی ہے کہ بندوق چھت پر لئے کیا ہم کچھ ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے؟ اگر نہیں تو پھر ہمیں دکھ کس بات کا تھا؟ کہ کچھ نہیں ہوا؟ اور سچ پوچھئے تو اسی بات نے ہمیں کافی دیر تک پریشان کیا تھا۔ ایلیشا کا جوش کسی کمزور نشہ کی طرح ٹوٹ چکا تھا——— میری بیوی کا موڈ بھی بہت خراب تھا۔ اس رات ہم تینوں میں پھر جھگڑا ہوا——— جس وقت جھگڑا ہوا اس وقت بھی راکسی ہمارے کمرے میں ہی تھا اور مہذب طریقے سے اپنی پونچھ ہلا ہلا کر شاید کچھ کہنا چاہ رہا تھا———

ایلیشا بولی——— "تم جھوٹ بولتے ہو ڈیڈی۔ کچھ بھی نہیں ہوا، میں اچھی خاصی ڈانس کی پریکٹس کر رہی تھی۔"

گو کہ میرے اپنے چہرے پر بھی کسی گلیمر کی پرت موجود تھی——— اس پرت کو خارج کرتا ہوا میں ہونٹ چبا چبا کر اپنی صفائی دے رہا تھا اور فساد کے برے نتائج کو سفاک لفظوں کے ساتھ بیان کر رہا تھا——— مگر درست ہے، میں ایلیشا اور اس کی ممی دونوں کے موڈ کو بحال کرنے میں ناکام رہا——— غصّے میں بغیر کھائے پیئے سب سونے چلے گئے——— میں بھی اپنے بیڈروم میں واپس آ گیا——— اور نہ جانے کب میری نیند لگ گئی——— میرے کپڑوں والی الماری میں نفیس سے نفیس لباس رکھے ہیں۔ ایلیشا جب دس سال کی تھی اور میرے سر کے بال سفید ہونے لگے تھے تو سیاہ سفید بالوں کے امتزاج نے مجھے مسحور کر دیا تھا——— میرے دوستوں کا بھی کہنا تھا کہ ان کی آمیزش نے میری شخصیت کو انتہائی سنجیدگی اور وقار عطا کیا ہے——— میں سوٹ پہن کر، سر پر ہیٹ لگائے، ہاتھ میں اسٹک تھامے رات کے وقت معزہ یعنی اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی کو نکلتا تھا———

پرویز کا چہرہ بدستور بوجھل تھا، مجھے یقین تھا اسے میری تمہید گراں گزر رہی تھی اور اسی لیے وہ بار بار کرسی پر پینترے بدل رہا تھا——— میں نے آفیسر چوائس کا ایک گھونٹ بھرا، پھر

کہا...... "میری بات سے آپ بھی اتفاق کریں گے کہ جو ذائقہ اس شراب میں ہے، وہ کسی میں نہیں۔ کیوں شمو بھائی ــــــ؟ آں۔ ناراض مت ہوئیے، میں اس رات کے قصہ پر واپس آ رہا ہوں ــــــ شک اور انکار کی سرحد یہیں سے شروع ہوتی ہے ــــــ اور اب کہانی بالکل ختم پر ہے ــــــ میری نیند اچٹ گئی وہی دھیما اور مہذب لہجہ...... جیسے کوئی میرے قریب کھڑا چبا چبا کر نرمی اور متانت سے لفظوں کی ادائیگی کر رہا ہو، اور ادائیگی کرنے والا اتنا پاس کھڑا ہو کہ اس کی سانسیں بھی گننے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہو...... وہی نرم ملائم اور مہذب انداز گفتگو۔

"سنئے اب یہاں آپ کو، یا سب کو میری ضرورت ہی کیا ہے وفاداری اور غلامی کی آپ کی نظروں میں قیمت ہی کیا رہی؟ ناراض مت ہوئیے۔ غور کیجئے، آپ ہم میں سے سب کچھ لے چکے ہیں۔ ہماری حیوانیت، درندگی ــــــ جبلت۔ نہیں اس میں افسوس کرنے جیسی کوئی بات نہیں ہے محترم ــــــ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے، لیکن اتنا یاد رکھئے گا ــــــ اپنی وفاداری اور غلامی، میں نے ٹھیک طرح سے نبھائی ــــــ کیوں ٹھیک ہے نا؟ تو جاتے جاتے آپ سے تھوڑی سی انسانیت مانگ رہا ہوں۔ اگر آپ کے اندر بچ گئی ہے تو...... نہیں؟...... اچھا الوداع......"

میں جانتا تھا شمو بھائی، آپ یقین نہیں کریں گے، مگر اس وقت یہاں میری موجودگی کی حد تک، جس کا آپ کہیں تو ثبوت بھی دے سکتا ہوں...... وہ راکی ہی تھا، اور وہ وہی میرے مخصوص لباس میں تھا ــــــ سوٹ، ہیٹ ــــــ ہاتھ میں اسٹک ــــــ اس نے ہیٹ اتار کر، جھک کر مجھے سلام کیا پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

OOO

یہ کسی تھکی ہوئی رات کی داستان نہیں ہے (2)

صاحبو! میرا یقین کیجئے، مرنے والا آدمی کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور وہ بھی ایسی صورت میں ــــــ جب موت یوں میری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو۔ کتے کی صورت ــــــ تو صاحبو، اسے گالی مت تصور کیجئے۔ بس یہی غلطی ہوئی مجھ سے اور میں اقرار کرتا ہوں کہ...... اس رات نہ میں نے پی رکھی تھی، نہ کسی طرح کا دوسرا کوئی نشہ کر رکھا تھا۔ اور نہ...... صاحبو! اس اقرار سے بھی اگر آپ کوئی نتیجہ نہ نکال پا رہے ہوں ــــــ تو مجھے سو جوتے مار لیجئے مگر خدا کے واسطے اس کتے کو ضرور تلاش کیجئے ــــــ جو پتہ نہیں کب کیسے اس اندھی تاریک رات میں ــــــ اس گلی سے ہوتا ہوا چپ چاپ میرے بدن میں اتر آیا تھا۔

یقین نہیں آیا تو میں آپ کو اس پراسرار ڈراؤنی اور تاریک رات کی اس گلی میں لے جاتا ہوں ــــــ جہاں بد بوتھی یا میں تھا۔ گلی کا چوکیدار تھا اور ایک کتا ــــــ جس کی سہی سہی آنکھیں کبھی میری طرف دیکھتیں ــــــ کبھی بند گیٹ کے باہر سنسان سڑک کو ــــــ اور پھر گلے سے بھوں بھوں کی دھیمی آواز نکال کر چپی سادھ لیتیں۔

صاحبو، سچ تو یہ ہے کہ اس رات کچھ بھی نہیں ہوا تھا ــــــ بس ایک چھوٹا موٹا معمولی سا فساد ہو گیا ــــــ معمولی سا فساد ــــــ آپ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بالکل جائز ہے۔ یہ کیا کہ چند محلے جل گئے۔ کچھ گاڑیاں پھونک دی گئیں۔ کچھ بچے نذر آتش کر دیئے گئے۔ کچھ نوجوان ہلاک کر دیئے گئے۔ پھر سب کچھ معمول پر...... نہیں جناب...... یہ کیا ــــــ کچھ ایڈونچر چاہئے۔ مجھے، آپ کو، پولیس کو، روزانہ اخبار پڑھنے والوں کو ــــــ اور ٹی وی دیکھنے والوں کو ــــــ جیسے کوئی بھونچال آتا ہے۔ جیسے کوئی قیامت ٹوٹتی ہے اور سچ پوچھئے تو...... نہیں صاحبو،

رنجیدہ مت ہوئیے، میں واقعات سے کاٹ نہیں رہا ہوں آپ کو...... چاہتا ہوں کہ واقعات سمجھنے سے پہلے آپ مجھ سے یوں واقف ہو جائیں، جیسے اس کتنے سے جس سے آپ کو آگے چل کر واقف ہونا ہے۔ تو صاحبو ـــــ عام طور پر خواب دیکھنے والے حضرات کی طرح میں بھی خواب دیکھتا ہوں ـــــ اور خواب بھی کیسا۔ خواب میں بم کے گولے پھوٹتے ہیں۔ ہلچل مچتی ہے، جتنی زیادہ ہلچل مچتی ہے، اتنی دیر تک لگتا ہے ـــــ جیسے اندر سے کوئی انجانی خوشی ابل رہی ہے۔ میں مشتعل ہوتا ہوں، مشتعل ہوتا ہوں اور خوش بھی ہوتا ہوں۔ اب مان لیجئے، آپ کمرے میں بیٹھے ہیں ـــــ میں بھی بیٹھا ہوں تو میری خواہش ہوتی ہے، ساری اشیاء سالم اور جامد کیوں ہیں۔ کچھ ہو۔ جیسے بھڑ اک سے پنکھا گر جائے ـــــ بلب پھٹ جائے ـــــ یا دیواریں ہلنے لگیں۔ آس پاس کے مکانات ملبے کے ڈھیر بن جائیں۔ مزدور جب اینٹیں توڑتے ہیں تو مجھے مزہ ملتا ہے۔

اچھا چلئے اب آپ کو وہ واقعہ سناتا ہوں...... اس دن...... آپ سمجھ گئے ہوں گے، مجھے مشتعل ہونے کا اچھا خاصہ بہانہ مل گیا ہوگا۔ اور صاحبو، تسلیاں دینے والے بہت تھے مگر صاحبو، دل کی دھڑکن اتنی تیز رفتار تھی کہ ان تسلیوں کو فریم کرا کر دل کے قید خانے میں رکھنے کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں بچی تھی۔ میں جس محلے میں ہوں، اس سے تو آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ اپنی ذات کا ایک اکیلا میں ہوں، شاید ایسے ہی موقعے کے لئے میرے احباب مجھے سمجھایا کرتے تھے کہ وہ مکان چھوڑ دو کہ ہوشیاری اسی میں ہے ـــــ اور آگ لگانے والی اپنی آنکھیں بھی ایسے موقع پر بے خبری میں مند جاتی ہیں...... تو صاحبو! فساد ہونا طے تھا یا یوں کہیے کہ جو فضا بن رہی تھی اس نے گویا صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ میاں بھاگنا ہو تو ابھی سے نو دو گیارہ ہو لو۔ اس لئے کہ فساد اس ملک کا مانسون تو ہے نہیں، جس کے آنے میں شک ہو۔ پھر کیا تھا، گھر والوں کو افرا تفری میں رشتہ داروں کے یہاں بھجوا کر خود اکیلا ڈٹ گیا ـــــ کہ اندر اس خوف و دہشت کی فضا میں کچھ ایسا گلیمر ضرور تھا، جو دیکھنا چاہتا تھا کہ آگے آگے کیا ہوتا ہے۔

اور اس رات...... دو محلہ چھوڑ کر دکھن محلہ کے ہاشم بھائی بھاگے بھاگے گھر آئے، دروازہ کھٹکھٹایا، اپنی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے۔

''میاں بہت ڈھیٹ ہو چکی ہے۔ اب بھاگ بھی چلو۔ آج کی رات خیریت نہیں۔ کوئی جگہ ہے بھی یا نہیں۔

شام ہوتے ہی سڑک ایسے خاموش ہوگئی جیسے کرفیو کا اعلان ہو چکا ہو۔ آسمان کی رنگت بھی پیلی پڑ گئی تھی۔ میں سڑک پر آیا تو پانچ گھر چھوڑ کر پان والے کے پاس کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ باتوں میں فساد کی بارودی مہک اس قدر تھی کہ میں تھکا سا کمرے میں گیا۔ ایک ایک دروازہ چیک کیا ــــــ تالا لگایا پھر باہر نکل آیا۔ تب تک رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ سڑک سناٹے میں ڈوبی تھی۔ مجھے لگا، اب گھر چھوڑ دینا چاہیے۔

بس اسی خیال کے تحت میں سرپٹ دوڑ پڑا۔ ٹھیک اسی وقت سنسان سڑک پر کئی لوگ دوڑتے بھاگتے نظر آئے۔ پھر گولی چلنے کی تیز آواز ہوئی ــــــ پولیس جیپ کا سائرن بھی بج اٹھا۔ میں اور تیز دوڑا۔ سانس جیسے جسم سے اپنا ناطہ توڑ لینے پر آمادہ تھی کہ ٹھیک اسی وقت مجھے کسی نے ہاتھوں سے پکڑ کر گلی میں کھینچ لیا۔

''پاگل ہو، کہاں دوڑ رہے ہو۔ موت کو دعوت دے رہے ہو کیا؟''

میں نے گھوم کر دیکھا۔ اس آدمی کو پہچانتا تھا میں ــــــ چھوٹے سے شہر میں رہنے کے زیادہ تر فائدوں میں سے ایک ہے کہ ہر چہرہ شناسا لگتا ہے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ شیو پوری کا چوکیدار ہے۔ اور یہ گلی جس میں چوکیدار نے مجھے کھینچا تھا۔ آمنے سامنے کے چار چھ گھروں کو جوڑنے والی ایک تنگ گلی تھی۔ جس سے اکثر و بیشتر گزرنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا ــــــ میں جب بھی ادھر سے گزرتا، ناک بند کر کے گزرتا ــــــ کیونکہ آگے کے دو مکان کے باہری حصے کا سنڈاس اسی گلی کو کھلتا تھا اور اس کی بدبو پوری گلی میں اس قدر گونجتی تھی کہ زیادہ تر لوگ اس طرف جانے سے بھاگتے تھے۔ مگر میرا کیا تھا، آنکھیں کھولیں تو چاروں طرف بدبو کے بھبکے ہی تو تھے ــــــ جنہیں سونگھتا ہوا میں بڑا ہوا تھا...... چوکیدار نے مجھے اندر کر لیا ــــــ پھر گیٹ چڑھا دیا ــــــ ٹھیک اسی وقت پولیس جیپ سائرن بجاتی ہوئی پاس سے گزر گئی۔

چوکیدار نے دھیرے سے کہا۔

''پھنس گئے۔ اب کرفیو لگ گیا ہے۔''

اس نے ایسے معنی خیز اشارہ سے میری طرف دیکھا جیسے آنکھوں آنکھوں میں میری شرافت کے سارے کپڑے جسم سے الگ کر رہا ہو کہ میاں اب بولو۔ باہر کرفیو اور یہ تنگ بدبودار گلی۔ کہاں جاؤ گے۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ ہلکے اندھیرے میں گندہ سا چیتھڑا بچھائے کوئی فقیر

آرام سے ایک طرف سو رہا تھا۔ اس کے قریب میں ایک کتنے کی ڈراؤنی آنکھیں چمک رہی تھیں ــــــ میں نے چوکیدار کی طرف گھوم کر دیکھا۔

چوکیدار بولا۔ وہ پارس گلی والی فقیر ہے۔ کچھ بولتا وولتا نہیں ہے۔

کتنے نے ایک بار پھر دھیرے سے بھوں کیا۔ شاید کتا بھی حالات کی نزاکت سمجھ چکا تھا۔ وہ وہاں سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ پیروں سے الجھنے کی کوشش کی۔ میں نے سانس روک لی۔ یارب کتنے سے زندگی میں اتنا ڈرتا آیا تھا کہ شاید بھوت پریت سے بھی اتنا ڈر نہ لگتا ہوگا۔

چوکیدار بولا۔ یہ کتا کاٹتا نہیں ہے۔ صرف سونگھتا ہے۔

''کیوں؟''

''سونگھ کر پہچان جاتا ہے کہ اپنا آدمی ہے یا نہیں۔''

میں نے پھر پوچھا۔ ''کتے کو بھلا اس کی تمیز کیسے ہوتی ہے؟''

اس پر چوکیدار خاموش رہا۔ کچھ وقفہ بعد اس نے انجانے میں اپنا ڈنڈا پٹکا۔ پھر ایک دم سے چونک گیا۔ جیسے اچانک خیال آیا ہو۔ آج وہ ڈیوٹی نہیں دے سکتا اور اس تنگ گلی میں سب کے سب کسی اپرادھی کی طرح پھنس گئے ہوں...... وہ پھس پھسی سی ہنسی ہنسا۔

''کیا کہیں۔ عادت چھوٹتی نہیں نا۔''

میں چپ چاپ چلتا ہوا گیٹ تک آ گیا۔

رات دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ لوہے کا گیٹ اس وقت ہمارے لئے جیل کی آہنی سلاخوں کی طرح تھا۔ سوئے ہوئے فقیر نے منہ سے عجب سی آواز نکالی تھی۔ پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ کتا اب اس کے سرہانے آ گیا تھا اور اپنا منہ اس کے میلے کچیلے منہ کے پاس لے جا کر کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کھڑے کھڑے پاؤں میں درد ہونے لگا تھا۔ میں نے اندھیری گلی میں ذرا آگے بڑھنے کی کوشش کی تو چوکیدار کی آواز سنائی پڑی۔

''آگے پاخانہ بہہ رہا ہے۔ اس طرف مت جائیے۔''

کیا...... مجھے اچانک ابکائی سی محسوس ہوئی۔ خوف کی شدت نے بدبو کے احساس کو

اب تک مجھ سے دور رکھا تھا۔ اب مجھے شدید قسم کی بدبو محسوس ہو رہی تھی، اس قدر شدید کہ ناک پھٹ رہی تھی...... باہر کیسے جاؤں، اور سچ یہ بھی ہے کہ رات کسی بھی طرح یہاں نہیں گزار سکتا۔ کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ بچھانے کے لئے بھی پاس میں کوئی چادر نہ تھی۔ اور یوں اس طرح پینٹ شرٹ پہنے، گندی گلی میں تو لیٹنے کا سوال نہیں تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی تھی۔ میں گھر سے بھاگا ہی کیوں؟ قیامت خیز ہولناک رات۔ ہم سے کچھ ہی دوری پر اندھیرے میں پاخانہ بہہ رہا تھا۔ کھلے سنڈاس سے بدبو کے بھبکے آگ کے شعلوں کی طرح تیزی سے ہماری طرف لپک رہے تھے۔

کتا کھکھایا، فقیر کو کھانسی اٹھی تھی۔

چوکیدار بولا۔ کرفیو رات بھر رہے گا۔ چلو سونے کی کوشش کرو۔

اس نے ڈنڈے کو سرہانے رکھا اور آرام سے ایسے لیٹ گیا کہ اچھے بھلے لوگ گھر کے آرام دہ بستروں پر نہیں لیٹتے ہوں گے۔ اس نے ایسی بے فکری سے آنکھیں موندلیں جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ کتا فقیر کے پاس سے اٹھا۔ چوکیدار کے پاس آکر دم ہلانے لگا۔ چوکیدار نے ڈھیرے سے ہوں ہاں کر کے کتنے کو بھگایا۔ کتا اب وہاں سے ہو کر میرے پیر کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

اُف معاذ اللہ ــــــ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور جیسے ٹھنڈ لہر پتوار کی طرح میرے بدن کو چیرتی چلی گئی ــــــ وہ آنکھیں، میں جانتا ہوں، آپ یقین نہیں کریں گے اور آپ یقین کریں بھی تو کیسے جبکہ خود پہلی بار مجھے بھی یقین نہیں آیا۔ ان میں جنگلی جانوروں یا جبلت جیسی کوئی چمک نہیں تھی۔ خلاف توقع وہاں انسانی نفرت موجود تھی۔ ہاں شدید انسانی نفرت ــــــ کتے نے منہ پھیر لیا۔ اور اپنی نفرت میری آنکھوں میں اتار کر چپ چاپ آگے چلتا بنا۔

میں نے پھر سوچا۔ کیا میں یہاں لیٹ سکتا ہوں۔ نہیں۔ تو کیوں نہیں لیٹ سکتا۔ اخلاقیات کے سارے درس یہاں، اس کرفیو زدہ رات کی آغوش میں، اس تنگ بدبودار گلی میں ــــــ چپکے چپکے سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ پیٹ میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا، جاتے وقت خواہش ہوئی تھی۔ کم از کم بریڈ اور سلائس ہی کھالوں ــــــ بعد میں موقع ملے نہ ملے۔ مگر بھوک ایسے موقع پر، سنسان سڑک پر پولیس جیپ کی طرح بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

اچانک تیز بدبو کا بھبکا اٹھا تھا۔ پچھلے دروازے سے ہوا کے جھونکے اس طرح اندر

آ گئے تھے ـــــــ جیسے چھوٹے بچے، تھوڑے سے کھلے گیٹ سے باہر جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ نہیں مجھے سونا چاہئے، مگر کہاں...... نیند بہت ضروری ہے پیارے...... مگر۔ کتا مجھے گھور رہا تھا، اب مجھے احساس ہوا یہ بدبو کتے کے بدن سے اٹھی تھی اور میرے بدن میں منتقل ہو رہی تھی۔

کئی ماہ ہوئے، میری بیوی نے کہا تھا۔ گھر میں سب چیزیں موجود ہیں۔ صرف...... وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ میرے سمجھنے کا انتظار کرتی رہی۔ ایک ضروری اسٹیٹس سمبل۔ کتا۔ السیشن ہو یا پھر بھورا جھبرا معصوم سا کتا...... جیسے...... میں نے غصے میں بیوی کو ڈانٹا۔ بکومت۔ کتے ذلیل ہوتے ہیں۔''

''انسانوں سے بھی''۔ بیوی اردو افسانہ لکھنے والے واہیات ادیبوں کی طرح جیسے فلسفے کا توپ داغنے پر آمادہ تھی۔

''ہاں! اس سے بھی زیادہ۔'' میرا جواب تھا۔

مجھے لگا، کتا میری آنکھوں میں اپنے لیے نفرت کی کہانی تلاش کر رہا ہو۔

میں نے غصے میں کہا۔ کم بخت ڈرامت، میں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا اپنی بیوی سے۔

فقیر اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور اپنے کان کھجلا رہا تھا۔ پھر ٹٹول کر دلائی میں چھپائی ہوئی روٹی اس نے نکالی۔ روٹی کا ٹکڑا توڑ کر اس نے اپنے منہ میں ڈالا۔ میں نے دیکھا۔ وہ میری طرف بھی ایسا ہی ایک چھوٹا سا ٹکڑا بڑھا رہا تھا۔

OO

اس بار جب سنسان سڑک سے پولیس جیپ سائرن بجاتی ہوئی گزری تو میں نے حواس بحال کیے ـــــــ سوچا، آواز دے کر پولیس کو پکاروں۔ بتاؤں کہ انجانے میں، میں کیسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے یقین تھا، پولیس والے کسی محفوظ مقام پر مجھے ضرور پہنچا دیں گے۔

''چوکیدار نے چلا کر کہا۔ گیٹ تک جاؤ گے تو پولیس پکڑ لے گی۔''

میری گھبراہٹ دیکھ کر اس نے بے سرے انداز میں ہنسنا شروع کر دیا۔

صاحبو، مجھے کہنے دیجئے۔ آج اور اب سے پہلے میں صرف سنتا آیا تھا کہ نیند تو کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے۔ پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ سوکھی روٹی کے ٹکڑے ڈکار کر فقیر لمبی تان کر سو گیا

تھا۔ چوکیدار اب پھر سے سو گیا تھا اور خراٹے بھر رہا تھا۔ کتّے نے بھی ادھر ادھر گھوم کر تھوڑی سی جگہ ہتھیالی تھی۔ نیند ضروری ہے۔ بدبو کا کیا ہے۔ بدبو تو جنم سے سونگھتا رہا ہوں۔ یہاں وہاں آس پاس چاروں طرف۔ میں نے خود کو سمجھایا اور وہیں، ایک طرف اپنے لیے جگہ بنا کر اوندھا ہو گیا۔

اور صاحبو! سچ کہتا ہوں، مانیں نہ مانیں مجھے نیند آ گئی۔ اور نیند بھی کم بخت ایسی قاتل کہ کچھ بھی یاد نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں اور کن لوگوں کے بیچ ہوں۔ کہنا چاہیے میں گھوڑے بیچ کر سویا۔ اور میری ظالم نیند اس وقت ٹوٹی جب کرفیو میں ڈھیل کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہلکی سی آنکھیں چوندھیائیں تو میں سمجھ گیا، اب اس جگہ میں تنہا بچ گیا ہوں۔ فقیر شاید پو پھٹتے ہی کہیں نکل گیا۔ کتا بھی اپنے ساتھیوں کی تلاش میں باہر جا چکا تھا۔ چوکیدار بھی غائب تھا۔ گیٹ کھل گیا تھا ——— گو دھوپ ابھی نہیں نکلی تھی، لیکن ساری رات کرفیو کے بعد والا سویرا تھا، جس کے ہٹتے ہی ڈر اور خوف کو، چمگادڑ کے بچے کی طرح سینے سے چمٹائے لوگ سڑکوں پر آ نکلے تھے۔ میں نے انگڑائی لے کر اٹھنا چاہا تو ایسے چونک گیا جیسے ہاتھ اچانک کسی دھاردار چیز پر پڑ گیا ہو۔ یہ بوٹ تھا اور بہر حال میں اسے خوب پہچانتا تھا۔ یہ سرکاری بوٹ تھا۔ اور جو آدمی اسے پہنے تھا وہ بغور مجھے اور میرے قیمتی لباس کو دیکھ رہا تھا۔

''چلو......''

میں نے اٹھنے کی کوشش کی، بولنا چاہا مگر، دفعتاً چونک گیا ——— میرے نرخرے سے انسان کی جگہ کتّے کی آواز نکل رہی تھی۔

سرکاری آدمی ایک دم سے بوکھلا اٹھا......

''کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟ اس جگہ...... اس کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ زہر بھرا ہوا تھا۔'' جانتے نہیں شہر میں کرفیو لگا ہے۔''

میں...... میں اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ میں ایک شریف شہری ہوں۔ اس ملک کا ایک معزز شہری۔ میں یہاں قریب میں ہی آباد ہوں اور اچانک فساد چھڑ جانے کی وجہ سے محفوظ مقام کی تلاش میں...... مگر بدقسمتی سے میں اس جگہ پھنس گیا مگر یہ کیا ——— میرے نرخرے سے لگا تار کتّے کے بھونکنے کی آواز نکل رہی تھی۔

''تم...... تم ہو کون؟''

سرکاری آدمی اب کچھ غصے اور شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں......'' کتا پھر گھگھایا۔

''سب پتہ چل جائے گا بچو۔ چلو تھانے۔''

○○

مجھے تھانے لے جا کر اس نے اپنے سے سینئر باس کو سیلوٹ مارا پھر دھیرے دھیرے کچھ پھسپھسانے لگا۔ میں نے کان لگایا تو پتہ چلا وہ میرے بارے میں ہی بول رہا تھا۔

''یس سر۔ یہی آدمی ہے۔ نہیں، سر، مجھے شک نہیں یقین ہے ــــ اس کے کپڑے دیکھیے سر۔ شہر میں جو کچھ بھی ہوا، میرا یقین کیجئے۔ سر، یہی آدمی ہے۔ یہ آدمی مجھے مشتبہ حالت میں اس جگہ ملا۔ نہیں سر، میرا منہ مت کھلوائیے۔ اب میں کیا بتاؤں۔ نہیں سر ــــ میں ٹھیک بتا نہیں سکتا۔ نہیں۔ آپ سننا ہی چاہتے ہیں۔ سر تو سنیے۔ وہاں سنڈاس کھلے ہوئے تھے اور پتلے پاخانے کی دھار بہہ رہی تھی۔ اور یہ آدمی ایسی بے فکری کی نیند سویا تھا کہ...... ذرا ملاحظہ فرمائیے سر یہ آدمی...... اس کا حلیہ...... اس کا لباس...... اس کی آواز...... ہاں تو جی...... اب تم بتاؤ۔ کون ہو تم؟ دیکھو سیدھے سیدھے سچ سچ بتا دو۔''

اب وہ میری طرف غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے منہ کھولا۔ اور کیا بتاؤں...... مجھے خوشی سے زیادہ حیرت اور حیرت سے زیادہ خوشی ہوئی کہ میں، اپنی ہی آواز میں ہمکلام تھا۔

''میں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔''

آفیسر نے چونک کر اپنے جونیئر کو دیکھا......

''تم تو کہتے تھے کہ یہ......''

''یس سر۔ میں سو فیصد سچ کہتا ہوں''

''اگر یہ سچ ہے تو اب...... یعنی تم بھی دیکھ رہے ہو......''

''میں ایک شریف آدمی ہوں سر، اور یہ مجھ پر تہمت ہے، الزام ہے۔''

سینئر کے لہجے میں غصہ تھا...... ''شٹ اپ یہ تو عام انسانوں کی طرح باتیں کر رہا ہے''

جونیئر نے ایک زور کا چانٹا میرے گال پر لگایا کہ اس وقت اسے میرے منہ سے کتے

والی آواز کی زیادہ ضرورت تھی۔ مجھے غصہ آیا۔ میں نے زندگی میں کبھی اس طرح کی بے عزتی برداشت نہیں کی تھی۔ میں نے دیکھا، جونیئر، سینئر دھیرے دھیرے آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے...... میں نے انہیں اپنی طرف سے مطمئن کرنے کے لئے دوبارہ الفاظ جوڑے۔ مگر یہ کیا۔ وہ زخرے سے نکلتی ہوئی کتنے کی آواز۔

جونیئر خوفزدہ ہو کر بولا۔ دیکھئے سر...... دیکھا، نا......

سینئر کی نظریں میرے چہرے پر گڑی تھیں۔

''میں...... میں ٹھیک ہوں سر'' مجھے خود تعجب تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

''لو، اب تو یہ پھر آدمی کی طرح بولنے لگا''

''مگر یہ پہلے کتے کی طرح بولا تھا اور آپ نے بھی آواز سنی تھی'' جونیئر زور دے کر بولا۔

''ہاں سنی تو تھی مگر اب......''

جونیئر، سینئر کے کان میں دھیرے سے پھسپھسایا۔ ''نہیں سر، آپ غور کیجئے، غور کیجئے۔ میں کہہ رہا ہوں نا، یہ جو ہو رہا ہے اس وقت پورے ملک میں۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجئے سر، ہنڈریڈ پرسنٹ سر، مجھے یقین ہے۔ اور کیا صرف دو ہاتھ دو پیر کا ہونا ہی انسان ہونا ہوتا ہے۔ یس سر' وہاں وہ پرانے زمانے کا سنڈاس...... اور آپ نہیں جانتے سر۔ وہ جو ہو رہا ہے...... پورے ملک میں...... یہ آدمی ہے سر۔''

وہ جو بھی کہنا چاہتا ہو مگر اس کے لیے شاید اس کے پاس موزوں الفاظ نہیں تھے۔ غصے میں وہ اپنے بال نوچ رہا تھا۔ اس نے پھر سر سہلایا۔ '' تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ سارے فساد کے پیچھے بس اس کتے کا۔ نہیں سر، میرا اعتراض یہی ہے۔ آپ اسے انسان کیوں کہتے ہیں۔ ایک کتے کو انسان۔ جو میں اب آپ کو سنانے جا رہا ہوں......''

جس وقت جونیئر سینئر افسر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ساڑھے سات بجے کا وقت ہوگا، دھوپ آسمانوں کو چھیدتی ہوئی کمرے میں گھس آئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت ایک کانسٹبل ایک پٹے والے کتے کو جو کہ زنجیر سے بندھا تھا۔ کھینچتا ہوا اندر لے کر چلا آیا۔

اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھ پاتے، کانسٹبل چلا کر بولا۔ سر، چمتکار ہو گیا۔ انہونی ہو گی۔

سینئر غصے میں دہاڑا۔ '' بکو کیا بکنا چاہتے ہو؟''

''سر۔اس کتے کی آواز سنئے۔جی ہاں سر۔غور سے سنیے۔''
اور...... بالکل سچ کہتا ہوں صاحبو، وہ کتا انسانی آواز میں بول رہا تھا۔
''شرافت کا زمانہ نہیں رہا۔سراسر ظلم ہے، زیادتی ہے۔آپ لوگ کسی بھی شریف کتے کو پکڑ کر اندر بند کر لیتے ہیں۔ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔''

کتا بڑبڑا رہا تھا۔سینئر کی آنکھیں پھیل گئی تھیں ــــــ جونیئر پر غشی طاری تھی۔اور تب سینئر نے دھیرے سے جونیئر کے کندھے تھپتھپائے۔بولا ــــــ ''سنو...... غور سے سنو۔ایسا ہوتا ہے...... ایک خاص مدت میں...... جب ہم ارتقا پذیر ہوتے ہیں...... سمجھ رہے ہونا...... ارتقا پذیر...... تنزلی کے راستے بھی یہیں سے پھوٹتے ہیں، سمجھ رہے ہونا...... یعنی اگر کچھ بدل جائے۔ہم تم ہو جائیں۔تم ہم...... فیشن سے لے کر اخلاقیات...... یعنی کتا انسان ہو جائے اور انسان...... ایک خاص وقت میں...... یعنی یہ ارتقاء کا بہت معمولی سا دستور ہے...... تم سمجھ رہے ہونا...... دراصل زمین اپنے مرکز سے ہٹ رہی ہے۔نیا پرانا ہو رہا ہے۔یعنی...... میں جو کہہ رہا ہوں...... تم سمجھ......''

سینئر ٹھہر ٹھہر کر سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔مگر صاحبو، جو بات اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، وہ ناقابل یقین ہے۔سینئر بول ضرور رہا تھا مگر۔حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ بولنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا مگر اس کے نرخرے سے مستقل کتوں جیسی آواز نکل رہی تھی اور سب چونک کر حیرت سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔

OOO

اقبالیہ بیان

(غیر ضروری کردار کے بہانے)

سب انسپکٹر پھنک چند کو یہ پوری دنیا ہی غلط نظر آتی تھی۔ وہ ہر بات کو اس طرح غلط انداز سے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا کہ اپنے بچوں تک پر شک کر بیٹھتا اور نتیجتاً ان بچوں کی اماں کو پھنک چند کے سامنے قصوروار بننا پڑتا...... "کہ یہ اپنے ماتھے کا تل دیکھو اور یہ بچے کے پاؤں کا تل۔ ذرا غور سے دیکھو۔ دونوں کتنے مشابہہ ہیں...... اور اب بھی تم شک کرتے ہو کہ یہ تمہارے بچے نہیں ہیں۔"

"مگر کم بخت شکلیں اتنی جدا جدا کیوں ہیں؟" پھنک چند مونچھوں پر تاؤ دیتا۔

پتنی، پتی کے انسپکٹرانہ مزاج سے واقف ہوتی ہے۔ اس کے نرم پڑتے ہی شروع ہو جاتی...... لو اب اس کے بارے میں مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ شکلیں بنانا تو بھگوان جانے، مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ بڑے ہوں تو مونچھیں بالکل آپ جیسی ہوں گی۔ بڑی بڑی اور کڑی کڑی۔"

پھنک چند کی باچھیں کھل جاتیں۔ وہ کچھ زیادہ ہی قوت اور فخر سے مونچھیں اینٹھنے لگتا۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی نظریں درد کر جاتیں۔

ایسا نہیں ہے کہ پھنک چند ہمیشہ سے غلط دیکھنے کا عادی رہا ہے مگر ایک تو اس کی بلوان بدھی ـــــ اور اس پر سے سب انسپکٹری کا نشہ۔ دن رات چور، اچکے، ڈاکوؤں کی صحبت میں اس کی مت بھی چوپٹ ہو گئی تھی۔ پھنک چند کا خیال تھا کہ یہ پولیس کی ذات ہے جس نے دنیا کو سدھار کر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ اگر پولیس نہ ہوتی تو سارے ہی چور اُچکے ڈاکو ہوتے ـــــ

پھنک چند کو پولیس کے ڈنڈے پر اتنا فخر تھا کہ جب اس کا پرموشن حولدار سے سب انسپکٹر کے لیے ہوا تو بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے —— لو، اب یہ خاص الخاص ڈنڈا ہاتھ سے گیا۔ حوالداری میں تو یہ ڈنڈا ہر وقت کا ساتھی تھا۔ سب انسپکٹری میں ڈنڈے کا ایسا ساتھ کہاں۔ وہ تو پرموشن اور پیسہ بڑھنے کا چکر نہ ہوتا تو کبھی وہ اس ڈنڈے کو ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ اور سب انسپکٹری کا عہدہ قبول ہی نہ کرتا مگر......

دنیا داری ہو یا، پولیٹکس —— پھنک چند کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہوتا۔ تھانہ کلائیں چک کے، اس کے ساتھی بھی اس کے جنرل نالج سے خاصہ رعب کھاتے تھے۔ خاص کر اس وقت جب وہ دیش کی پالیٹکس کے بارے میں چیخ چیخ کر گفتگو کر رہا ہوتا...... ''سب سالے آتنک وادی ہو گئے ہیں۔ سالے اندر سے ہی آتنک وادی تھے تبھی تو انگریز آ گئے۔ دیش کو غلام بنا دیا۔ پھر سالی آزادی ملی بھی تو کیا —— وہی آتنک وادی بھری چھری سے دیش کو لہو لہان کئے جا رہے ہیں......''

پھنک اپنے خیال سے مطمئن ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتا اور سوچتا۔ پولیس نہ ہوتی تو دیش کہاں جاتا —— نرک میں —— اور کیا —— ؟''

OO

پھنک چند اپنی نوکری سے مطمئن تھا۔ وہ پولیس کی نوکری کو اس قدر باوقار مانتا تھا کہ دوسری تمام نوکریوں پر پولیس کی نوکری کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کے اختیار اور دائرے میں اگر کوئی اونچ نیچ ہو بھی جاتی تو وہ اسے صحیح گردانتا تھا۔ تھپڑ، مار پیٹ، گالی گلوج، رشوت...... وہ ان سب چیزوں کو قانون اور 'پولسیا رعاب' کا ایک حصہ مانتا تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ سالے، آتنک وادی۔ مانے پر نہیں سمجھیں تو ہم کیا کریں۔ ان کا برا حشر کر کے دیکھو۔ تب دیکھو، کیسے باپ کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ چھوڑ اس لیے دیتا ہوں کہ سالوں پر رحم آتا ہے۔ پیسہ اس لیے لیتا ہوں کہ سالوں کو چھوڑتے ہوئے گھرنا ہوتی ہے...... سالوں نے دیش کو چوپٹ کر رکھا ہے۔''

OO

پھنک چند یوں تو اپنی بیوی پر ہر بات میں بھاری پڑتا تھا مگر رات میں، سونے کا لمحہ

واحد لمحہ ہوتا جب اس کے پسینے نکل آتے تھے۔ یوں جیل کی کال کوٹھریوں میں بڑی بڑی مار سے قیدیوں کی موت نکلتے دیکھ کر اس کے ماتھے پر پسینے نہیں چوتے تھے۔۔۔۔۔۔ مگر ادھر کچھ برسوں سے وہ خود کو جسمانی کمزوری کا شکار محسوس کر رہا تھا۔ گو اس معاملے میں اس نے ساتھی سب انسپکٹر رتن لال اور دیگر معقول لوگوں سے مشورہ لینے، اور صلاح قبول کرنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہ کی۔ مگر رات کا مسئلہ دیوار پر رینگتی چھپکلی کی طرح اس کے وجود میں سرسراہٹ سی مچا دیتا۔ اندھیرے میں بتی گل ہوتے ہی جب کپڑوں کی سرسراہٹ اور سانسوں کے زیر و بم کی صدا اس کے کانوں میں پڑتی تو پھنک چند کی دھڑکنیں تیز تیز چلنی شروع ہو جاتیں۔ دھرم پتنی کی حرکات سکنات پر رات کے اندھیرے میں اس کی آنکھیں جیسے کان بن جاتیں۔۔۔۔۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ کمزور لمحے کے داؤں پیچ میں خود کو اتنا شکست خوردہ محسوس کرتا کہ اس کی آواز تک بند ہو جاتی اور سارا پولسیا رعوب ہوا جاتا۔۔۔۔۔ وہ کسی کیڑے جیسا خوف کھاتا اور بچے جیسا گھبراتا۔ دھرم پتنی جب اپنے ادھیڑ پن کی بجھ رہی آگ کو سنبھالتے ہوئے اس کے سامنے کسی ننگی کمان کی طرح تن جاتی تو اس کی سانس غبارے کی طرح پھول رہی ہوتی۔۔۔۔۔ یہ وہ لمحہ ہوتا جب اس کی پتنی اپنے پھولے ابھرے پیٹ اور زچگی کے عمل سے گزرنے والی لکیروں پر ہاتھ پھراتے ہوئے لیمپ جلا لیتی۔ بچھوے کی طرح پھدک کر، اپنے ڈھکے سینے کو روشنی میں جگا 'کر' پھنک کی پھول رہی سانسوں میں اپنی سانسیں رکھ دیتی۔۔۔۔۔ نسوں میں ہیجان دوڑ جاتا، اور برداشت نہیں ہوتا تو بے حیا لفظوں کی اگنی میں بھی کود پڑتی۔

''یہ کیا ہو جاتا ہے۔ نامرد تو نہیں ہو گئے!''

پھنک چیختے چیختے ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے رہ جاتا۔۔۔۔۔

''ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے۔ یا کوئی اور بات ہے۔۔۔۔۔ ؟''

پھنک کو، ہونٹوں کا لعاب سوکھتا محسوس ہوتا۔۔۔۔۔ 'اور بات مطلب؟'

''پولیس والے ہو۔ تم پولیس والوں کا ایمان دھرم کیا۔ روج ہی کچھڑے اڑا کر آتے ہو گے؟''

پھنک کو اس جملے پر اپنی مردانگی دوبارہ ملتی ہوئی محسوس ہوتی۔ پھولی ہوئی سانس کے زیر و بم میں کمی آتی۔ مسکراتا، جھڑکتا۔۔۔۔۔ تو تمہیں کیا۔؟

''وہ بھی تو جاتا ہے۔ تمہارا دوست، رتن لال، کوٹھے پر۔۔۔۔۔؟''

''سب جاتے ہیں۔ایک رتن لال ہی کیوں؟''

''اچھی نوکری ہے۔ایک پتنی سے دل نہیں بھرتا۔''

''کسی کا نہیں بھرتا۔سب کرتے ہیں ایسا۔اب زیادہ بک بک مت کر۔سو جا۔ورنہ اتنی زور کا تھپڑ دوں گا کہ زندگی بھر کو چندلی ہو جائے گی۔''

○○

اس بار بیوی کچھ نہیں بولی۔گنجے ہو جانے کے ڈر سے یا پھنک سے مار کھانے کے خوف سے دبک کر، بھیگی بلی بن کر اپنے پگھلتے ساون کو سنبھالے سو جاتی۔پھنک دیر تک جاگتا رہا۔ٹانگوں ،اور ٹانگوں کے درمیانی حصے میں اس کے ہاتھ دیر تک رینگتے رہے۔چھپکلی کی کٹی، بے حس وحرکت ہوگئی دم کی طرح اب وہاں کوئی حرکت نہیں تھی۔پھنک کو ایسے کئی قصے معلوم تھے، جو اس کے دوست احباب پولیس والوں کی نوکری سے متعلق سناتے آئے تھے۔جیسے یہ، کہ آخری وقت میں یہ سالے نامرد ہو جاتے ہیں۔سب بھگوان کراتا ہے۔پولیس والوں کا آخری وقت بہت دکھ میں گزرتا ہے۔اور ثبوت کے طور پر آس پاس کی کتنی ہی مثالیں گنا دی جاتیں۔گو شروع میں پھنک ان باتوں کو نہیں مانتا تھا مگر اب ادھر چند برسوں سے اپنی جسمانی طاقت کو دیکھتے ہوئے وہ تھوڑا تھوڑا ڈرنے ضرور لگا تھا۔

○○

پھنک چند پولیس کے ہر کرم کو جائز مانتا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ پولیس جو بھی کرتی ہے۔ٹھیک ہی کرتی ہے۔اور اسے سب کچھ کرنے کا ادھیکار بھی ہے۔پھنک چند کی جیب ہمیشہ پھولی رہتی تھی اور وہ اپنی پھولی جیب سے بڑے بڑے افسران کو بھی خوش رکھتا تھا۔اسی لیے اس کی پہنچ بڑے بڑے افسران تک تھی۔یہاں تک کہ بھوانی سنگھ، سپرنٹنڈنٹ آف پولیس بھی اس سے کچھ زیادہ ہی خوش رہتے تھے۔خوش رہنے کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ پھنک ان کے چھوٹے بڑے گھریلو کام بھی خوش دلی سے قبول کرلیا کرتا تھا اور ان کے لئے چھوٹے موٹے پیسوں کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔بھوانی سنگھ اپنی سخت گیری کے لئے محکمے میں مشہور تھے اور پولیس کی ناک سمجھے جاتے تھے۔ان کے چنگل میں آکر بڑا سے بڑا بدمعاش بھی پانی مانگتا تھا۔ملزموں کو ٹارچر کرنے، سچ اگلوانے

اور اقبالیہ بیان حاصل کرنے میں بھوانی سنگھ کا جواب نہیں تھا۔ ملزم کی آدھی ہوا تو ان کی لمبی تگڑی شخصیت اور چہرے پر چھائے جلال کو دیکھتے ہی نکل جاتی...... ہاں، کتنے ہی موقعوں پر یہ ناک کٹتے کٹتے بھی بچی تھی۔ اور بھوانی سنگھ کی مردانگی نے اس ناک کو دوبارہ بحال کیا تھا۔ کبھی کبھی کسی ملزم کو پکڑنے میں پھنک چند سے بھول چوک ہو جاتی تو بھوانی سنگھ اسے تعزیرات، دفعہ، قانونی ہتھکنڈے اور وردی کی طاقت کے بارے میں چھوٹی چھوٹی باریکیاں سمجھایا کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھنک قانونی امور کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہو گیا۔ اب جب سے ٹاڈا کا معاملہ شروع ہوا تھا، پھنک کے لیے اور آسانی ہو گئی تھی۔ وہ بلا روک ٹوک کسی پر بھی کوئی دفعہ آزمالیتا اور حراست میں لے لیتا۔ یا حراست کی دھمکی دے کر چھوٹی موٹی رقمیں اینٹھ لیتا۔ آرمس ایکٹ اور دسوں ایکٹ کی وضاحت و وکالت وہ اس طرح کرتا کہ حراست میں لیا گیا آدمی گھبرا جاتا اور اس سے جو بھی بن پڑتا، پھنک کو دے کر اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا۔

○○

پہلی پہلی بار جب ٹاڈا کی ہوا چلی تو اسے پتہ بھی نہیں تھا کہ ٹاڈا ہے کیا بلا۔ لیکن اسے اتنا ضرور معلوم چل گیا تھا کہ ٹاڈا آجانے کی وجہ سے اس کی حیثیت پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا صوبہ ان بیس صوبوں میں سے ایک ہے، جہاں ٹاڈا کی ناؤ تیر سکتی ہے۔ اور پھنک تو اس ناؤ کو بہانے بلکہ اڑانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

شروع شروع میں جب ٹاڈا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو وہ بھوانی بابو سے ملا۔

''پھنک، تو بہت بھولا بھالا ہے، بھوانی بابو ہنسے...... اب ایسے سمجھ لو جو گیند تیرے ہاتھ میں تھی وہ اب تیری جیب میں آگئی ہے۔''

''ہاں، آگئی ہے۔ سر مگر میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔''

بھوانی سنگھ نے ٹھہا کا لگایا۔ ''گدھے کے بچے...... رہے گا زندگی بھر سب انسپکٹر کا سب انسپکٹر۔ کچھ کام کر کے دکھا۔ یہی موقع ہے۔ اوپر سے بھی حکم آیا ہے۔ ٹاڈا کے تحت زیادہ سے زیادہ لوگوں کو حراست میں لینا ہے۔''

پھنک کے چہرے پر چمک لہرائی۔ ذرا کھل کر بتایئے سر۔

''اب ایسے سمجھو کہ قانون تمہارے ہاتھ میں ہے۔ کوئی آدمی تمہاری مرضی کے خلاف

کام کرے تو تم ٹاڈا میں اسے حوالات میں بند کرا سکتے ہو۔ کوئی تمہارا 'ٹھینگا' بھی نہیں بگاڑ سکتا۔''

''وہ کیسے سر؟''

''ٹاڈا کی خصوصی عدالت میں ملزم سے لیے گئے اقبالیہ بیان کو ہی بطور ثبوت تسلیم کیا جائے گا۔''

''پھنک کا دماغ گھوم کر رہا گیا۔۔۔۔۔۔ مطلب، اس کا کیا مطلب ہوا سر؟''

بھوانی پھر بے مطلب ہنسے۔ ''اپنی من مانی اور آسان ڈھنگ سے کر سکتے ہو پھنک۔ کسی کو بھی میرے جیسے سینئر پولیس افسر کے سامنے لے آؤ۔ ٹھکائی کر دو۔ پٹائی کر دو۔ سادہ کاغذ پر انگھوٹھا لگوا دو۔ گواہ کی پہچان بھی ٹاڈا کے معاملے میں پوشیدہ رہے گی۔ یہ دونوں ہی شقیں ہمارے لئے خطرناک اوزار ہیں۔ کیوں پھنک؟''

اس کے بعد بھوانی بابو نے اٹھ کر دو پیگ تیار کئے۔ ایک اپنے لئے، ایک پھنک کے لئے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے پھنک کے پاس آکر ٹھہرے۔۔۔۔۔ لو پیو۔

'نہیں سر'

''پیو''۔۔۔۔۔۔ بھوانی سنگھ اس بار گرج کر بولے۔ ''پیو اس لیے پیو۔۔۔۔۔۔ کہ تم چغد آدمی ہو۔ ابھی کمائی کا وقت ہے اور تم ہو کہ ٹاڈا کے بارے میں سوال پوچھ رہے ہو۔ جاؤ جا کر دوسرے تھانوں میں دیکھو۔''

''جی سر''

''اور سنو۔ آتنک واد سے نپٹنے کے لئے ہی پولیس پرشاسن کو قانون کا یہ ہتھیار دیا گیا ہے۔ اس کا استعمال کرو۔ دھر پکڑ کرو۔ گرفتاری کرو۔ تھانہ بھرو۔ اور سنو۔ ۱۷ تاریخ کو رتھ یاترا کلائیں چک سے گزرنے والی ہے۔ زیادہ خطرہ لچھی ٹولہ امام باڑہ سے ہے۔ سمجھ رہے ہو نا۔۔۔۔۔ ہر حالت میں۔۔۔۔۔ پیو۔۔۔۔۔ شرماؤ مت۔۔۔۔۔ کتے کی برادری میں سب چلتا ہے۔ کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔

OO

لچھی ٹولہ کا امام باڑہ۔۔۔۔۔ سانولے چہرے والی صبیحہ اور وہ رشید حرامزادہ۔۔۔۔۔

پل میں پھنک کے چہرے پر تیزی سے کتنی ہی پرچھائیاں گزر گئیں۔ چڑیا کی طرح

پھدک پھدک کر چلنے والی صبیحہ یاد آ گئی۔ ان دنوں کے ہر ایک لمحے پر جس کی دسترس تھی۔ جس کے چہرے کے نقوش ہر وقت آنکھوں میں تیرتے رہتے تھے۔ اور پھنگ کبھی کبھی یہ بھی سوچتا تھا کہ وہ رشید کی طرح مسلمان کیوں نہیں ہے۔ کاپیوں پر اس کا نام لکھنا ــــــ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھنٹوں امام باڑہ کے پاس، چائے کی دکان پر بیٹھے رہنا ــــــ امام باڑہ میں ہلچل محرم کے دنوں میں شروع ہوتی تھی۔ کچھی ٹولہ کا امام باڑہ دراصل مسلمانوں کا محلّہ تھا اور اس محلے کے تعزیہ کی بہت دھوم تھی۔ رشید اور صبیحہ اسی محلے کے تھے اور کالج کے دنوں میں پھنگ کے ساتھی تھے۔ ہاں وہ بات تو پھنگ کو اس دن پتہ چلی جب......

OO

ڈماڈم......ڈماڈم......ڈماڈم......تا......تا......نہ......نہ

امام باڑے پر ہلچل تھی۔ نیاز فاتحہ ہو رہا تھا۔ ایک طرف محلے کے چھوکڑے، بچے ہر......رے رے اور یا علی، حسن حسین چیختے چلاتے آپس میں لکڑی بھالا کھیل رہے تھے۔ کچھ بڑے جوان لڑکے انہیں ہٹاتے ہوئے گھیرا بنا رہے تھے۔ امام باڑہ کچھی ٹولہ کا خلیفہ گلے میں موٹا سا پھولوں کا ہار ڈالے اپنی حد درجہ مصروفیت دکھاتا ہوا ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ نگاڑہ بج رہا تھا...... ڈھول ڈرم پیٹے جا رہے تھے۔ سروں پر دوپٹہ ڈالے عورتیں لڑکیاں ایک طرف بھیڑ کی صورت، ہنستی مسکراتی اس جم غفیر کو تک رہی تھیں۔ امام باڑہ کے ایک طرف لئی گوند اور رنگ برنگی چمکیاں لیے محلے کے لڑکے جالیاں جھالریں بناتے اور اسے تعزیہ میں سجانے کی تیاری کر رہے تھے۔ نگاڑے کی آواز پر گھیرے میں کھڑے لڑکوں نے ڈنڈا بجانا شروع کر دیا تھا۔

'ڈماڈم......ڈماڈم......ڈماڈم......تا......تا......نہ......نہ

لیکن پھنگ تو کچھ اور ہی دیکھ رہا تھا۔ نیاز والی رکابی لیے صبیحہ، امام باڑے کے ایک طرف جانماز بچھائے، سر پر رومال رکھ کر فاتحہ کرتے ہوئے رشید کو کچھ زیادہ ہی انہماک سے دیکھ رہی تھی ــــ چلتے...... چلتے زمین ٹھہر گئی، آسمان خاموش ہو گیا...... نگاڑے رک گئے...... وقت کی ہلچل میں سکوت چھا گیا۔

پھنگ کے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہا تھا......

صبیحہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی...... فاتحہ کر دیجئے۔

رشید نے نظر اٹھائی۔ مسکرا کر صبیحہ کو دیکھا اور کارکابی کا کپڑا اٹھا کر پھونک دیا۔
محرم کا نگاڑہ بج رہا تھا...... ڈماڈم...... ڈماڈم...... تا...... تا...... نہ...... نہ

○○

وہ رات آنکھوں میں گذر گئی۔ شدید بے چینی میں کروٹیں بدلتے ہوئے۔ صبح ہوتے ہی وہ ہنومان جی کے مندر نکل گیا۔ پرارتھنا کیا، تلک لگایا، پرساد کھایا۔ من میں اندھڑ چل رہے تھے۔ دو چار دن ایک دوسرے کو، آنکھوں آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گزر گئے...... ایک دن کالج میں گوشۂ تنہائی میں اس نے صبیحہ کا راستہ روک لیا۔ اس کے الفاظ سانسوں کی ہلچل میں کھو گئے تھے ___ صبیحہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ویسی ہی، جیسے محرم کے دن نیاز والی رکابی لیے اس کے ہونٹوں پر تھی۔

''کیا ہے؟''

ادھر ادھر کی بات کے بعد اس نے دھڑاک سے پوچھ لیا ___ مجھ سے شادی کروگی؟

'نہیں۔' مسکراہٹ میں شرارت سمٹ آتی تھی۔

'کیوں؟'

''کیونکہ ابا نہیں چاہیں گے۔ تم ہندو ہو ___ '' وہ خطرناک مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہی تھی اور وہ مسکراہٹ کی دھار سے کٹا جا رہا تھا۔

''بس اتنی سی بات پر۔''

'ہاں۔ ابا بہت سخت ہیں ہمارے ___ وہ تو لڑکیوں کی پڑھائی کے بھی خلاف تھے۔ لیکن تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو؟'

وہی مسکراہٹ اور محرم کے نگاڑہ کی آواز...... ڈماڈم...... ڈماڈم...... تا...... نہ...... نہ

پھنک کو لگا، وہ بے جان ہو گیا ہے...... اس کی حیثیت اس کچرے جیسی ہے جسے سمندر کی لہروں نے ساحل پر اچھال دیا ہے۔ وہ اس کے چہرے کو تکے جا رہا تھا جو بے حد ملائم، خوشنما اور تازگی لیے ہوا تھا۔

'اگر مان لو میں مسلمان ہوتا تو......؟'

'تب تم اپنے ابا سے میرے یہاں رشتہ بھجواتے۔'

'رشتہ بھجواتا......تب؟'

'تب ــــ تب میں ہاں کر دیتی۔'

صبیحہ چڑیے کی طرح پھدکی ــــ پھر ٹھہری نہیں۔ حیا جیسی کوئی سرخی اس کے چہرے پر دمک آئی تھی۔ اس کے بعد وہ رکی نہیں، قلانچیں بھرتی تیزی سے دوڑی...... پھر ٹھہری۔ شرمائی۔ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور پھنک ــــ اب اس کے دل میں۔ اس جگہ پر جہاں دھڑکن کے گیت گونجتے تھے ــــ محرم کے نگاڑے بج رہے تھے...... ڈما...... ڈما...... ڈم......

'تب میں ہاں کر دیتی...... ساری رات صبیحہ کا یہ جملہ اس کے کانوں میں بجتا رہا۔ اس کا شرمانا، رکنا، پلٹ کر دیکھنا اور اپنی اداؤں کی سنہری دوڑ میں اسے کس لینا۔ ساری رات وہ انوکھے خمار میں ڈوبا رہا۔ جیسے وہ دن...... وہ...... لمحہ...... وہ رات...... سب کچھ اس کی زندگی کی کتاب میں کسی روشن روزن سے داخل ہو گیا تھا۔

دوسرے دن کالج میں پتہ چلا، رشید اور اس کے یار دوست اسے چاروں طرف پوچھتے چل رہے تھے۔ وہ اس کے محلے بھی گئے تھے۔ گھر جا کر بھی اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اسے پتہ چلا ــــ کل رشید کے کسی دوست نے اسے صبیحہ کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ رشید اسے کالج کینٹین میں مل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، رشید اور اس کے ساتھیوں نے چائے کے گلاس ہوا میں اچھالے اور آناً فاناً ان کے ہاتھوں میں ہاکی کی اسٹک ناچنے لگی۔ معاملہ سمجھتے ہی اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ پھر اسے کچھ پتہ نہیں۔ کچھ خبر نہیں۔

وقت گزرا۔ اندر کہیں محرم کے نگاڑہ کی آواز بجی رہ گئی تھی...... ڈماڈم...... ڈماڈم...... نا...... نہ......

جیسے جیسے رتھ یاترا پہنچنے کا دن قریب آرہا تھا، پھنک کی ذمہ داریاں بڑھتی جارہی تھیں۔ شہر میں تناؤ بڑھ گیا تھا۔ خاص کر مسلم اکثریتی علاقوں میں تناؤ سے بچنے کے لئے جلوس نکالنے، سجائیں کرنے، مجمع اکٹھا کرنے اور مذہبی عبادت گاہوں سے ہونے والی تقریروں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی ــــ پھنک کو خبر ملی تھی، امام باڑہ کے پاس ایک جتھا یاترا کو روکنے اور

بھنگ کرنے کی سازش رچ رہا ہے۔اور اس جتھے کی نمائندگی کرنے والوں میں جو چند ناموں کی فہرست اس کے پاس تھی......اس میں ایک نام تھا......رشید انصاری۔

ذہن کی نازک سطح پر پھر محرم کا نگاڑہ بج اٹھا......ڈماڈم......ڈم......نا......نہ......

پھر پھنک نے دیر نہیں کی۔کسی ذمہ دار افسر کی طرح اس نے امام باڑہ کے پاس جیپ روکی____ چاروں طرف ناکہ بندی کی گئی۔اریسٹنگ ہوئی۔کمانی چائے والے اور تھوتھا کباب والے کی دکان سے چار پانچ ملا ٹائپ لوگوں کو پولیس نے دھر دبوچا۔ان میں مؤذن بھی تھے،امام بھی۔ان سب کو ٹاڈا کے تحت حراست میں لے لیا گیا۔

امام باڑہ میں سناٹا چھا گیا۔

پھنک نے رشید انصاری کے بارے میں پتہ کیا۔ایک چائے والے نے آگے گلی میں ایک مکان کی طرف اشارہ کر دیا۔گلی اتنی پتلی تھی کہ جیپ کے اندر جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

پھنک نے سپاہیوں کو باہر ہی روکا۔پھر وہ خود ہی مکان کی طرف بڑھ گیا۔یہ ایک منزلہ ٹوٹا پھوٹا سا مکان تھا۔مکان کی سفیدی جھڑ چکی تھی۔پلاسٹر بھی ادھڑ چکا تھا۔دروازے والی سیڑھی ٹوٹی ہوئی تھی____ اور اس جگہ موٹی موٹی چار پانچ اینٹیں رکھ کر سیڑھی کی جگہ بنائی گئی تھی۔جس وقت پھنک گلی میں داخل ہوا،آس پاس کی کھڑکیاں دروازے کھل گئے۔آنکھیں خوفزدہ تھیں اور پولیس کے قدم کو رشید کے مکان کی طرف بڑھتا دیکھ رہی تھیں......

پھنک اینٹے والی سیڑھی پر ہمت کرکے چڑھا۔پھر دروازہ پیٹنا شروع کیا۔

اندر سے آواز آئی ''......کون''

'پولیس۔پھنک نے جواب دیا۔

فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔دروازہ کھولنے والا ایک معمر بوڑھا آدمی تھا۔اس نے میلی سی بنیان اور چار خانے کی لنگی پہن رکھی تھی۔سر پر ایک گندی میلی سی ٹوپی چپکی تھی۔پھنک کی وردی کو دیکھتے ہی وہ آدمی سہم گیا۔

'رشید کہاں ہے؟'

'جی......نامعلوم......'

'آپ کون ہیں اس کے؟'

'سسر ہیں جی'

'گھر میں اور کون ہے؟'

'میری بیٹی یعنی رسید کی اہلیہ...... ایک میری اہلیہ۔ ایک رشید کی لڑکی ـــــ بوڑھے کے چہرہ کا رنگ فق تھا۔

'لڑکی کی عمر؟'

''سولہ سال کی ہوگی جی۔ لیکن سرکار، آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں۔ رسید نے کوئی جرم تو نہیں کیا سرکار۔''

پھٹک گلے کو کھکھار کر بلند آواز میں بولا ـــــ ''رسید آجائے تو کہنا کہ تھانہ میں ملے۔ کہہ دینا کہ انسپکٹر صاحب نے یاد کیا ہے۔ ضرور سے کہہ دینا۔''

اس دن شہر میں پولیس کی پکڑ دھکڑ چلتی رہی۔ قریب 300 آدمیوں کو پولیس نے ٹاڈا کے تحت حراست میں لے لیا۔

OO

اس دن رشید انصاری تھانے میں حاضر نہیں ہوا۔

دوسرا دن، رتھ یاترا گزرنے کا دن تھا۔ صورتحال انتہائی نازک ہو چکی تھی۔ پولیس کی ڈیوٹی بانٹی جا چکی تھی۔ پولیس کی دھڑ پکڑ جاری تھی۔ امام باڑہ کے پاس سے ابھی بھی اچھی رپورٹ نہیں آئی تھی۔

رتھ یاترا ٹھیک بارہ بجے پہنچ گئی ـــــ یاترا میں شامل لوگوں کو دونوں طرف سے 'رکچھا کوچ' لیس پولیس نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ آواز کا شور اتنا تھا کہ کان کو کان سنائی نہیں دے رہا تھا۔ جے شری رام کے نعروں سے آسمان گونج رہا تھا۔ ایک بجے کے آس پاس اس یاترا کو امام باڑہ سے گزرنا تھا۔ جس وقت پھٹک آدمیوں کے جم غفیر سے گزرتا ہوا امام باڑہ کے پاس آیا، وہیں بھیڑ میں ـــــ اچانک، وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ باڑے میں اسی جگہ، جہاں محرم کے روز نیاز فاتحہ ہو جانے کے انتظار میں کھڑی صبیحہ کو دیکھا تھا۔ اسی جگہ، چبوترے کے اسی مقام پر بجلی کی طرح وہ چہرہ کوندا۔ دبلا پتلا ـــــ لانبا، گھٹنے سے نیچے تک کا کرتا۔ پائجامہ اور ہوائی چپل۔ آنکھیں ذرا اندر کو دھنس گئی تھیں۔ گالوں کی ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں۔ چہرے پر ہلکی سی جھری کا

جال بجھ چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود پھنک نے پہنچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی......

نگاڑہ بجا...... ڈم...... ڈما...... ڈم......

یاترا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھوں کی بھیڑ امڈ آئی تھی۔ آس پاس۔ کھڑکیوں، دروازے، چھتوں پر آدمیوں کے سیلاب کو دیکھا جا سکتا تھا۔ پھنک جیسے سب کچھ بھول چکا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اس آدمی کی طرف بڑھ رہا تھا...... کانوں میں برسوں پہلے گم ہوئی نگاڑے کی آواز گونج رہی تھی...... ڈم...... ڈما...... ڈم...... نا...... نہ...... برسوں پہلے کی اس آواز میں رتھ یاترا میں شامل ہجوم کی آواز مل گئی تھی...... جئے...... ڈماڈم...... شری...... ڈم...... نا...... نہ......

اچانک چبوترے پر کھڑے کسی آدمی نے زور سے نعرہ لگایا —— یا علی

اچانک بھگدڑ مچ گئی...... پولیس نے فائرنگ کی...... آنسو گیس چھوڑے...... اور نازک ماحول سے نبٹنے کی تیاریوں میں جٹ گئی......

○○

رتھ یاترا گزر گئی۔ لیکن طوفان نہیں تھما۔ اس دن کچھی ٹولہ امام باڑہ سے چن چن کر، گھروں سے مردوں کو نکالا گیا اور وین میں بھر بھر کر تھانے پہنچایا گیا۔

پولیس کے آدمی جس وقت رشید کے مکان کے دروازے پر پہنچے، ان میں سب سے آگے پھنک تھا۔ پھنک نے دروازہ کی کنڈی زور زور سے ہلائی۔ دروازہ کھولنے والی ایک عورت تھی۔ آنچل ہٹا اور اس کا دہشت زدہ چہرہ باہر آ گیا۔ پھنک چونک کر دو قدم پیچھے ہٹا۔

محرم کا نگاڑہ ایک بار پھر بج اٹھا۔ وہی امام باڑہ کے چبوترہ پر نیاز کرانے کی اپنی باری کا انتظار کرتی ہوئی...... عورت تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پھنک کی سانسوں میں طوفان آ گیا۔ ہونٹوں کا لعاب سوکھ گیا۔ پھر اس نے خود کو بحال کیا۔ پولسیا رعاب میں واپس آ گیا۔

'رسید کہاں ہے؟'

'جی۔ وہ تو گھر پر نا ہیں'...... عورت تھر تھر کانپ رہی تھی۔'

تم صبیحہ ہو......!

وقت جیسے ٹھہر گیا تھا، ہونٹ لرز رہے تھے......

پھنک کی آواز نرم پڑی۔عورت نے نظر اٹھا کر دیکھا...... پھر تھم کر رہ گئی......

"پھنک...... میں پھنک ہوں...... پھنک چند......، وردی میں وہ اپنی افسری کا گانٹھ باندھ رہا تھا...... پہچانا؟

عورت کے بدن کی تھرتھراہٹ اب تک بند نہیں ہوئی تھی۔ اچانک پشت سے اس کے باپ کا چہرہ ابھرا۔اس نے عورت کو جھٹکے سے پیچھے کھینچا...... "اندر جا۔باہر زنانیوں کا کیا کام......"

پھنک پھر اسی 'پولسیار عاب' میں واپس آ گیا۔اس کے بدن سے تیز ہوا کا جھونکا ٹکرایا۔ سب کچھ بھول کر اس نے سپاہیوں کو آواز لگائی۔ لے لو سب کو حراست میں۔

پولیس کے سپاہی شاید اسی انتظار میں تھے۔وہ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔اندر چارپائی پر رشید کی جوان لڑکی زبیدہ سو رہی تھی...... سپاہیوں کی ہولناک آنکھوں نے اسے گھورا۔ لڑکی نے خوفزدہ ہو کر چیخ ماری...... ایک سپاہی نے انتہائی بدتمیزی سے اس کے سینے پر چکوٹی بھری۔ پھنک نے تن تنا کر اس کا ہاتھ روک لیا...... شاید وہ تذبذب کی حالت میں تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا...... مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ جس وقت پولیس وین تھانے کو کوچ کر رہی تھی، وین سے رونے دہاڑنے کی آواز گونج رہی تھی۔اس سے بے نیاز پھنک اس عورت کو گھور رہا تھا، جس میں اس کے سپنے کی، پہلی بارش کی پھواریں کھوئی ہوئی تھیں......

ٹاڈا قانون کے تحت جیل ریکارڈ میں نام درج کراتے وقت صبیحہ کی بیٹی کو لے کر پریشانی ہو گئی۔وہ 15 سال کی نابالغ لڑکی تھی۔سپرنٹنڈنٹ بھوانی سنگھ نے یہ گتھی بھی سلجھادی۔ جیل ریکارڈ میں اُس کی عمر 18 سال درج کی گئی، اور اس پر بھی ٹاڈا کا مقدمہ بنا دیا گیا۔

پھنک کے بدن میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی...... لیکن سر...... لڑکی تو ابھی نابالغ ہے......

بھوانی ہنسے۔"ملزم کے لئے عمر کی کوئی سیما اس قانون میں طے نہیں۔دودھ پیتے بچے سے لے کر 98 سال تک کے بوڑھے کو اس کی زد میں لیا جا سکتا ہے...... ہم نے تو بس اس پر ذرا سی مہربانی کی ہے......"

پھنک کو حیرانی تھی...... 'لیکن جرم کیا لکھا جائے گا'

'رشید آتنک وادی ہے۔اس نے بھیڑ میں بھگدڑ پیدا کرنے کی کوشش کی۔تم سچ مچ

چغد ہو۔ پھنگ چند۔ جب ہم ہی قانون ہیں تو پھر ثبوت کی ضرورت کیا ہے۔ جو چاہیں، دفعہ ٹھوک دیں گے۔ رشید آتنک وادی ہے تو اس کو ٹھکانہ دینے والے بھی آتنک وادی ہوئے۔ اب رشید کی ماں کو لو۔ آتنک وادی کے شریر میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ ماں کا ہے۔ کیوں —— تو ماں بھی آتنک وادی ہوئی نا۔؟''

''لیکن سر۔ وہ بڑھیا تو رشید کی ساس ہے۔ رشید کی ماں تو ہے ہی نہیں''

''پھر وہی مورکھ جیسی باتیں۔ ارے بھگدڑ پھیلانے اور گڑبڑی پیدا کرنے میں یہ سب تھے۔ ٹاڈا کی تیس دھاراؤں میں سے کوئی بھی لگا دیں گے۔ آتنک وادی گتی ودھیوں میں لپت ہونا ایک دھارا ہوئی۔ بھیڑ یا بھگدڑ سے ایک آدمی کے ہلاک ہونے کی خبر ملی۔ اس طرح رشید پر مرتیو دنڈ اور کم سے کم اس کو پانچ سال کی سزا سنائی جا سکتی ہے۔ اس کے گھر ہتھیار رکھوا دو —— اور اس پر آرمس ایکٹ کی دھارا لگوا دو۔''

'لیکن سر، رشید تو ابھی فرار ہے۔'

'دھارا 8 کے مطابق بھگوڑے شخص کی سمپتی کی قرقی کی جا سکتی ہے۔، اس میں آگے یہ بھی جوڑا گیا ہے کہ جو شخص مفرور ہے اس کے خلاف مقدمہ کی سنوائی اس کی غیر موجودگی میں بھی ہو سکتی ہے۔ اور جرم ثابت ہو جانے پر اس کی غیر موجودگی میں بھی اسے سزا سنائی جا سکتی ہے۔'

○○

پھنگ کے دماغ میں مسلسل نگاڑے بج رہے تھے...... اس کے بعد اس نے کچھ نہیں پوچھا...... اسے لگا، وہ کسی بلیک ہول میں پھنس گیا ہے —— اور دھیرے دھیرے ہوا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے...... اسے لگا، آنکھوں سے پاؤں تک پورے بدن میں اندھیرا پسر گیا ہے...... اسے پہلی بار لگا، اس سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی......

اسی شام وہ لاک اپ میں رشید کے پریوار والوں سے ملنے گیا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے صبیحہ کی طرف دیکھا...... آج اس کی آنکھوں میں محرم کے نگاڑے خاموش تھے...... زبیدہ اسے دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹی —— جیسے سامنے والا آدمی اس کی عزت لوٹنے پر آمادہ ہو...... اس کی سانس پھول رہی تھی...... وہ تو یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ بہت جلد ڈزاگنڈ کورٹ میں ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اس بیچ رشید کا ملنا بہت ضروری ہے۔ وہ انہیں

بتانے آیا تھا کہ تیر کمان سے چھوٹ چکا ہے...... تمہارے خلاف خفیہ گواہ بھوانی سنگھ نے پیدا کر لیے ہیں ــــــ اور انہیں دکھانے یا بتانے کی ضرورت عدالت کو نہیں ہے...... یعنی جو غلطی ہو چکی ہے اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار ہو جانے کا وقت آ گیا ہے...... اس قانون میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے ہیرو لوگ بھی زیرو ہو جاتے ہیں......

اچانک رونے کی آواز ابھری...... لاک اپ میں کسی کی ہچکیاں گونج گئیں۔ پھنک نے گھوم کر دیکھا۔

یہ صبیحہ تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے...... برسوں پہلے کا ایک منظر پھنک کی آنکھوں میں دوڑ گیا ــــــ اگر میں مسلمان ہوتا تو...... پھر تم اپنا رشتہ بھجواتے......''

''اور مان لو میں نے اپنا رشتہ بھی بھجوا دیا تو......، تو میں ہاں کر دیتی...... ہاں کر......''

پھنک اندر تک ہل کر رہ گیا۔ پیٹ کے نیچے والے حصے میں ذرا سی ہلچل ہوئی...... اس نے ناخن سے وہ حصہ کھجلایا...... رات آسمان پر چھا رہی تھی۔ بیرکوں سے قیدیوں کے چیخنے چلانے اور رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اسی شام رشید نے حوالات میں خود آ کر اپنی گرفتاری دے دی۔ وہ بہت زیادہ ڈرا ہوا تھا...... اب باقی تھا تو بس اقبالیہ بیان کی رسم اور اس کے بعد ان سب کی قسمت پر قانون کی مہر لگ جانی تھی......

رات کے ٹھیک بارہ بجے بھوانی سنگھ کی کار باہر رکی ــــــ اور پھنک چونک کر اٹینشن کی مدرا میں آ گیا۔

○○

وہ رات اقبالیہ بیان لینے کی رات تھی......

یاتنا گرہ یا اذیت گھر کی دیواروں میں خوف حلول کر گیا تھا۔ جیسے سناٹے میں دور سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی پڑتی ہے، ویسے ہی دور سے بھوانی سنگھ کے بوٹوں کی ٹاپ ابھری۔

پھنک نے ٹھنڈی سانس بھر کر یاتنا گرہ کی کالی ہو رہی کوٹھری کو دیکھا۔ دیواروں پر جا بجا مکڑے کے جالے لٹک رہے تھے۔ کالی ہو رہی دیوار کا پلستر جھڑ چکا تھا۔ کمرے میں ایک کرسی تھی۔ پھنک کے پاس ہی کانسٹبل رتنا کر کھڑا تھا۔

باہر کتنے بھونک رہے تھے۔

بھوانی سنگھ اس سے پہلے بھی کتنے ہی اقبالیہ بیان لے چکے تھے—اور پھنک ان سب کا چشم دید گواہ رہا تھا۔ پھنک جسے ساری دنیا ہی غلط نظر آتی تھی—اور جو ہر چیز کو غلط انداز سے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا، آج پہلی بار خود کو الجھنوں کا شکار محسوس کر رہا تھا۔ اس نے تھوک نگلا۔ پھر رشید کی طرف مڑا۔

'تم جانتے ہو۔ تم لوگوں کو یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟'

ہاں—رشید کی آنکھوں میں موت ناچ رہی تھی۔

'اقبالیہ بیان کے لئے'

'اس کا مطلب جانتے ہو......'

رشید نے سانس درست کی۔ ''پھنک۔ میں جانتا ہوں تم یہ سب کیوں کر رہے ہو۔ کالج کی لڑائی کو تو عرصہ بیت گیا۔

'اب اس جرح کا وقت نہیں ہے۔ دیر ہو چکی ہے۔'

رشید کی کمزور آواز ابھری۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ نہ میرے خاندان والوں نے—آخر تم ہم لوگوں کو کیوں پھنسوانا چاہتے ہو......دھیرے دھیرے اس کی آواز میں تلخی آتی جارہی تھی...... ''چن چن کر امام باڑہ سے مسلمانوں کو جیپ میں بھر بھر کر لے گئے تم لوگ۔ رتھ یاترا نکالنا گناہ نہیں تھا—گناہ تھا بھیڑ میں کسی کا یا علی بول دینا......تمہاری حکومت ہے—اس لیے جو مرضی چاہے کر سکتے ہو۔ اتنی جیلیں نہیں ہیں تمہارے پاس۔ کتنے مسلمانوں کو بھروگے۔''

''ان سوالوں کے لیے ابھی وقت نہیں ہے رشید۔'' پھنک الجھتی سانسوں کو درست کرتے ہوئے چلایا۔

''اقبالیہ بیان کا مطلب جانتے ہو......؟''

○○

تبھی دروازہ بھڑاک کے ساتھ کھلا۔ پھنک نے اڑی رنگت کے ساتھ دیکھا۔ دو بوٹ

یا تنا گرھ کے دروازہ پر آ کر ٹھہر گئے۔ بھوانی سنگھ کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ ہاتھ میں شراب کا ایک گلاس تھا۔ آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ بدن پر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کی وردی تھی ـــــــ جس پر کئی ستارے چمک رہے تھے۔ ہاتھ میں ایک پلین پیپر تھا۔

زبیدہ نے ہلکی سی چیخ ماری اور اماں صبیحہ سے لپٹ گئی۔ علیم نے اپنی بوڑھی بیوی کی طرف دیکھا۔

بھوانی سنگھ ایک قدم آگے بڑھے۔ گلاس سے ایک گھونٹ لیا۔ پھر آگے بڑھ کر رشید کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ مارا۔

'سالے، سور کی اولاد۔ یہاں سائن کر۔'

رشید کی آنکھوں کے آگے جیسے پوری دنیا گھوم گئی۔''

'سائن کر یہاں۔'

رشید نے پلٹ کر دیکھا۔ نہیں کروں گا۔ تم ڈرا رہے ہو مجھے۔ آخر چاہتے کیا ہو تم لوگ؟

بھوانی نے زور کا ٹھہا کا لگایا۔ باقی شراب ایک سانس میں پی گئے۔ پھر لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھے۔ کاغذ کانسٹبل رتنا کر کی طرف بڑھایا۔ پھر رشید کی طرف تیزی سے گھومے۔ اس بار ان کا دایاں بوٹ والا پیر تیز سے گھوما۔ بوٹ رشید کی جانگھوں سے ٹکرایا۔ وہ تیز چیخ کے ساتھ زمین پر لوٹنے لگا...... گلے سے بھیانک چیخ گونج اٹھی......

رشید پھر چیخا ـــــــ 'کچھ بھی کر لو۔ مگر سائن نہیں کروں گا میں......'

بھوانی غصے میں آگے بڑھے۔ وزنی بوٹ کی نوک اس کے سینے پر رکھی۔ پھر انگلی کے اشارہ سے زبیدہ کو اٹھنے کے لئے کہا۔

پھنک نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے سارے بدن میں سہرن پھیل گئی۔ اسے لگا رات ہو گئی ہے...... چتی کام دھام سے فارغ ہو کر اس کے کمرے میں آئی ہے..

بھوانی نے کانسٹبل رتنا کر کو اشارہ کیا۔ 'اس کے کپڑے کھولو!'

کانسٹبل رتنا کر نے ایسے جیبھ نکالی ـــــــ جیسے قانون اور قانون کے اصولوں کا پالن کرنا اس کا اولین فرض ہو۔

رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ آسمانوں پر کہیں بادلوں کا ایک بڑا سا ٹکڑا ئی لاش کی مانند دکھائی دے رہا تھا...... بڑے ٹکڑے کو گھیرے کچھ چوکور تاریک ٹکڑے بھی تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چوکور ٹکڑے ان سوگواروں میں شامل ہوں، جو لاش کندھوں پر اٹھائے آسمان کی نگریا میں بڑھتے جا رہے ہوں...... اکا دکا جو ستارے آسمان پر نظر آرہے تھے وہ چپ تھے......اور بدلیوں میں چھپنے کے منتظر تھے......

ہوا ایک بیک تیز ہوگئی۔

بھوانی سنگھ کرسی پر بیٹھ گیا—— اندر دبا ہوا غصہ رہ رہ کر چاول کی بھاپ کی طرح کھنکھنا رہا تھا...... 'سالے پتہ نہیں قانون کو کیا سمجھتے ہیں آتنک وادی...... دیس کو کھولنا سمجھ رکھا ہے۔ جب مرضی آئی دنگے کروا دیے۔ اب یہ ہندواستھان...... اور ایک رتھ یاترا ن نہیں نکل سکتی۔ سالے پاکستان بنوا کر بھی کھس نہیں ہوئے۔ یہاں بھی اپنی کریں گے...... انہیں تو بس تھوڑی سی جگہ دے کر دیکھو...... سالے چار ملا جمع ہو جائیں تو دوسرا اسلامستان بنالیں گے...... سالے جاہل کی اولاد...... سارا کٹر واد نہیں بھلا دیا تو...... کیوں رے رتنا کر بھڑوے سالے۔ آج تیری مردانگی کو کیا ہو گیا ہے...... دیکھتا کیا ہے سالا...... جوان لڑکی ہے—— تروتازہ ہے...... ارے دیکھتا کیا ہے سالا بھڑوا......''

آگے بڑھ کر اس نے رتنا کر کو ایک ہاتھ دیا...... ''یہ سب سالے آتنک وادی ہیں...... لوٹ رہے ہیں دیس کو اور تو ان پر رحم کھا رہا ہے۔ ان پر......'' وہ علیم الدین، اس کی اہلیہ، صبیحہ، زبیدہ اور گھبرائے سے رشید کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

'لیس سر'...... رتنا کر مار کھا کر کسی بھوکے شیر کی طرح زبیدہ پر جھپٹا۔

'شاباش!'

بھوانی نے قہقہہ لگایا—— ایک لمحے کو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ آج یہ کیسی زبان وہ استعمال کر رہا ہے...... پھر اس نے اس خیال کو جھٹکا۔ پولیس کا وہ کتنا ہی بڑا افسر کیوں نہ ہو—— اسی زبان کو ماڈل بنانا چاہیے۔ اسی زبان سے پولیس کی کھوئی ہوئی ناک بنی رہ سکتی ہے۔

بھوانی سنگھ کو ملزموں کا اتھان (بھلا) کرنے میں مزہ ملتا تھا۔ ان کی پتنی جوانی میں ہی مرگئی تھی۔ ایک لڑکا تھا جو پڑھ کر ولایت چلا گیا۔ وہیں کی ایک میم سے شادی کرلی اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ بھوانی سنگھ لمبے تگڑے آدمی تھا۔ دوبارہ شادی نہیں کی۔ اور پولیس کی نوکری میں شادی نہ

کرنے کا غم بھی نہیں ہوا۔ وہ ایسے سوداگر تھے کہ جس مال پر ہاتھ رکھ دیں، وہ مال ان کا ہوا۔ اور وہ شروع سے ہی اس پولسیا رعاب کا استعمال کرتے رہے تھے۔

○○

زبیدہ چلائی۔ اس کے چلانے سے حوالات کی دیواریں دہل گئیں۔ شلوار کا ناڑا ٹوٹ کر گرا تھا۔ اس کا دودھیا سڈول پاؤں جیسے اچانک انگاروں کی بارش کرنے لگا تھا۔ بھوانی سنگھ کی آنکھوں میں نشہ چھا گیا۔' سالے ہر کام نیچے سے شروع کرتا ہے۔ ٹھہر جا......، رشید نے مدافعت کی کوشش کی——— بوڑھے علیم الدین نے آنکھیں پھیرلیں۔ بھوانی کانسٹبل رتنا کر پر چیخے۔ ان سالوں پر چابک مارو——— اور جو ہو رہا ہے اسے دیکھنے پر مجبور کرو؟

بوڑھا علیم الدین روتا ہوا بھوانی کے پیروں پر گرا...... '' صاحب یہ ظلم مت کرو...... نادان بچی ہے۔ ابھی پوری عمر پڑی ہے...... ابھی تو کچھ بھی دیکھا نہیں ہے اس نے......،

'' تو؟ ہم دکھلائیں گے——— ابھی دکھائیں گے۔ اسی وقت۔ کیوں پھٹک چند؟''

بھوانی کو کافی دیر بعد پھٹک کا خیال آیا، جو گیٹ پر، دوسری طرف منہ کئے کھڑا تھا......

' ارے پھٹک چند...... سالے کی حال ہے——— ابھی بھی تیرے پینٹ کا حال ٹھیک نہیں ہوا——— بھوانی مزے لے کر ہنسے۔

○○

کانسٹبل رتنا کر نے چابک سنبھال لیا۔ چمڑے کا چابک۔ چابک ہوا میں لہرایا۔ ملی جلی کئی چیخ ایک ساتھ فضا میں بلند ہوئی...... بھوانی کے ہاتھ آگے بڑھے۔ جسم کیا تھا...... منجھے ہوئے کمہار کے چابک دست ہاتھوں کا کرشمہ...... تراشے ہوئے عضو...... دودھیا صندلی بدن...... مخروطی انگلیاں——— پھولے پھولے ہونٹوں سے ٹپکتا شہد...... آنکھوں کی وحشت میں ہرنی سے بل...... جیسے گورے انگ انگ میں شراب ہی شراب بھر دی گئی ہو......

زبیدہ اب چیخ بھول گئی تھی...... وہ جیسے شدید ٹھنڈ سے کانپ رہی تھی...... جسم پر کپڑے کا ایک تار تک نہیں رہ گیا تھا...... ہاتھ میں وہ قوت نہیں تھی کہ جسم اور جسم کے ابھاروں کو ڈھانپ سکتی...... سینے کی حیرت ناک گداز گولائیاں اور دودھیا نورانی چمک نے بھوانی کے علاوہ کانسٹبل

رتنا کر کے دماغ کی نسوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا......

رشید نے پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا —— یا اللہ کہہ کر رونے کی کوشش کی ——

مگر آنسو تو کب کا آنکھوں سے پیچھا چھڑا چکے تھے...... یہ اس کی بیٹی ہے...... وہی زبیدہ...... جو کتنی بار اس کی بانہوں میں ابا کہہ کر سمائی تھی...... رشید بلیاں لیتا تھا...... پاگل۔ کیوں اتنا پیار کرتی ہے۔ ایک دن تو سسرال چھوڑ کر چلی جائے گی...... میں تو نہ جاؤں گی۔ یہیں رہوں گی۔ تمہارے پاس۔ وہ جھوٹ موٹ روتے ہوئے اس کے بدن سے کسی چھوٹے بچے کی طرح چمٹ جاتی۔

ایسے موقعوں پر آنکھوں کو دیکھنے کی تاب کہاں رہ جاتی ہے۔ آنکھیں دیکھ تو رہی ہوتی ہیں —— مگر دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھ رہی ہوتی ہیں...... ایسے پتھرا جاتی ہیں کہ اندر ہی اندر موت ہو گئی ہو آنکھوں کی۔ ایسے سو جاتی ہیں کہ تاریکی کے سوا کچھ بھی بھائی دینے کی حد سے باہر نکل آتی ہیں......

پھنک کو لگا۔ کوئی چیونٹی سی سرسرا رہی ہے بدن میں —— نہیں پیٹ کے نیچے والے حصے میں...... کچھ جنبش ہوئی ہے...... نہیں...... وہ کمرے میں ہے...... رات کا تھکا ہارا...... پتنی نے اندھیرا کر دیا ہے بتی بجھا دی ہے...... اور اب وہ دن بھر کی میلی کچیلی ساڑی پھینک کر نائیٹی بدل رہی ہے...... اندر جیسے کچھ جھنجھنا رہا تھا...... ٹوٹ رہا تھا......

رتنا کر کے چابک پھر برسے اور اس نے پینٹ کے اندر اپنی ہتھیلیوں کو مضبوطی سے جانگھوں پر بھینچ لیا......

بھوانی کے ہاتھ اپنے پینٹ کی زپ تک آئے —— اور زبیدہ کے ننگے بدن نے ایک بھیانک چیخ کے سامنے خود کو دو مضبوط حیوانی بازوؤں میں سمٹا ہوا محسوس کیا...... رشید پوری قوت سے گالی دیتا ہوا مارنے کو جھپٹا تو رتنا کر کے چابک نے اسے دوبارہ زمین دکھا دی۔ وہ بھرائی سی تیز تیز سسکیاں لے رہا تھا۔ ایسی سسکیاں جو بڑھ جائیں تو جسم سے روح کا رشتہ منقطع کر دیتی ہیں......

آسمان پر بادلوں کا بڑا سا گھنیرا ٹکڑا جو کسی لاش کی مانند دکھائی دے رہا تھا اب آسمان سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اب وہاں سرمئی، سرخی مائل بدلیاں چھا گئی تھیں۔ اور پان کی پیک کی طرح بدلیوں میں لال لال چکتے اچھل پڑے تھے......

بھوانی نے لمبی لمبی سانس درست کی۔ ایک طرف نڈھال سی زبیدہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ، دیوار کے سہارے گھٹی گھٹی سانسیں چھوڑ رہی تھی...... کمرے میں وہ سب تو تھے جنہیں چھتنار درخت کہتے ہیں...... اور جن کے سہارے اسے زندگی کی طویل و عریض کھائیاں عبور کرنی تھیں...... ماں باپ...... نانا، نانی...... اور ان سب کے سامنے اسے...... اس نے خوف اور ہیبت سے پھر ایک تیز چیخ ماری...... اندر دبی سسکیوں نے ندی کی باندھ کو توڑ دیا تھا اور وہ کسی ٹوٹی پھوٹی گڑیا کی طرح اپنا عریاں بدن سنبھالے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی......

صبیحہ نے موت جیسی آنکھوں سے زبیدہ کو دیکھا...... کچھ بول نہیں سکی...... آواز اٹک کر رہ گئی۔

"آتنک وادیوں سے اقبالیہ بیان لکھوانا بھی کتنا مشکل کام ہوتا ہے...... یہ سب بھی کرنا پڑتا ہے —— یہ ملیچھ۔"

بھوانی نے للچائی آنکھوں سے تاک رہے رتنا کر کو دیکھا...... "تو کیا سوچتا ہے۔ میری مت ماری گئی تھی —— جوانی سی لڑکی ہے۔ مگر یہ سالا کمبخت حرام کا جنا ایسے، بیان پر دستخط نہیں کرے گا۔ اور تو ایسے للچائی آنکھوں سے کیا دیکھ رہا ہے...... وہ تیرا شکار ہے...... وہ...... اس نے صبیحہ کی طرف اشارہ کیا۔

صبیحہ دو قدم خوف سے پیچھے ہٹی۔ پھر دیوار سے ٹکرا گئی۔

پھنک کے اندر محرم کے نگاڑے ایک بار پھر سے چیخے...... دھم ...... دھڑم...... ڈماڈم...... اس کی پتنی نے نائیٹی پہن لی ہے...... بستر پر لیٹ گئی ہے۔ اور اب اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا ہے۔ پھنک نے زیر ناف اپنے ہاتھوں کو جنبش دی ہے...... کٹی ہوئی چھپکلی ایک دم شانت ہے —— سویا ہوا بے حس کیڑا۔ یہ کیڑا ہاتھ کی جنبش کے باوجود مردہ سا ہے۔ سویا ہوا۔

کانسٹبل رتنا کرنے بانہہ کی آستین چڑھائی۔ پھر بندر کی طرح اچھالا۔ اگلے ہی لمحے اس نے صبیحہ کو ایسے دبوچ لیا جیسے کوئی چڑیا باز کے پنجوں میں آگئی ہو...... اچانک چر...... ر...... ر...... کی آواز ہوئی۔ صبیحہ کے بلاؤز کا ایک بڑا حصہ رتنا کر کے ہاتھ میں تھا۔

بوڑھے علیم الدین نے اپنا سر دیوار سے ٹکرایا۔ گڑگڑانے والے انداز میں بولا:

''میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے...... بند کرو...... بند کرو یہ سب۔''

'بند کروں۔ مگر کیوں بھائی؟'، بھوانی کرسی سے اچھلا۔ علیم الدین کی گردن تھامی اور اسے تیزی سے دیوار کی طرف دھکا دیا۔ ٹھیک اسی وقت پشت سے رشید نے پوری طاقت لگا کر اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن حملہ کرنے میں زور سے زیادہ فرط جذبات کو دخل تھا۔ بدن کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بھوانی نے ایک زور کی ٹھوکر اس کی زپ والی جگہ پر ماری۔ رشید ٹانگوں کے بیچ ہاتھ پھنسا کر بری طرح چیخا۔ اس کا پورا جسم جھنجھنا اٹھا تھا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ اپنا پیر پکڑ کر، بلبلا کر، زمین پر لوٹنے لگا——

بھوانی نے پینٹ کی گرد جھاڑی ''...... بند کر دوں...... آخر کیوں بھائی۔ اس لئے کہ تم اپنی من مانی کر سکو۔ کان کھول کر سن لو، اب تک جتنی من مانیاں تم لوگوں نے کی ہیں، ہم نے اس کی رائی برابر بھی زیادتی نہیں کی۔ آتنک وادی سالے...... دیس کو لوٹنے چلے ہیں......''

اس نے اوندھی پڑی زبیدہ کو دیکھا۔ جس کا بدن دیوار سے اڑا ہوا تھا اور جو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سولہ سال کا معصوم بدن حوالات کے اندر کی گرمی سے مرجھائے ہوئے پھول کی طرح لگ رہا تھا...... اس سے پہلے جس جسم سے جو دودھیا چاندنی کی دھار پھوٹ رہی تھی، اب وہ چاندنی بجھی بجھی لگ رہی تھی......

'نہیں—— مزہ نہیں آیا۔ ان آتنک وادیوں کو تو ایسا مزہ چکھانا چاہئے کہ آنے والی پیڑھیاں یاد رکھیں—— رشید کے حملے سے بوکھلائے بھوانی کا چہرہ گرم پانی کی طرح کھول رہا تھا۔ اس نے زور سے آواز لگائی۔ پھنگ چند!

''یس سر''

''رتناکر''

''یس سر''

رتناکر کی زپ کھل گئی تھی۔ اور وہ کسی دور سے دوڑتے آرہے مسافر کی طرح تھکا ہوا معلوم دے رہا تھا۔ اور سانس 'ہنپنی' کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

صبیحہ کی ساڑی کھلی پڑی تھی۔ بلاؤز ایک طرف پھیکا ہوا تھا۔ اور وہ ادھ مری سی ننگے جسم کے ساتھ حوالات کی میلی ہورہی چھت کو گھور رہی تھی......

'رتنا کر۔ پھنک چند......، بھوانی پھر زور سے چلایا۔

'لیس سر'......دونوں اٹینشن ہو گئے۔

''ان تینوں کو ننگا کردو۔ چلو جلدی کرو''۔ اس نے علیم الدین، اس کی اہلیہ اور رشید کی طرف اشارہ کیا۔

مدافعت میں اٹھے ہاتھ، اور ماحول کی بھٹی میں جھلس گئے جسم میں اب طاقت ہی کہاں رہ گئی تھی——— کپڑے اتر گئے۔ آنکھوں میں موت سے زیادہ بے شرمی کا خوف تھا......

ہوا تیز ہو گئی تھی۔ حوالات کا مضبوط دروازہ تیز ہوا سے ڈولا۔ بھوانی کے قہقہے میں دراوزہ ہلنے کی آواز دب گئی۔

پھنک کے ہاتھ بوڑھی عورت کے بدن سے کپڑا اتارتے ہوئے لگاتار کانپ رہے تھے۔ انگلیاں لرز رہی تھیں......مگر ڈر، عادت اور آفیسر کے حکم سے بندھے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا......بس وہی حرکت کرتی سی پرچھائیاں......اس کی پتنی کا بدن نائیٹی میں سرسراتا ہے......بستر ذرا سا کسمسایا ہے......پتنی کے سرسراتے ہوئے ہاتھ اُس کے کندھے تک آکر ٹھہر گئے ہیں......

بھوانی نے رشید کے فق چہرے کو دیکھ کر ایک گندی سی گالی بکی———اور چیخ کر کہا......'' چل سالے......بٹی سے زنا کر......زنا سمجھتا ہے......سالے یہ تیری ہی زبان کا لفظ ہے......پاکستان میں تو کوڑے پڑتے ہیں اس لفظ پر......، پھر اس نے رتنا کر کو اشارہ کیا۔ سالا دیر کرے تو چابک سے چمڑی چھیل دینا'

رشید کانپتا ہوا پاؤں پر گر پڑا——— ''لاؤ میں سائن کر دیتا ہوں...... جہاں چاہتے ہو...... جتنے کاغذ پر۔ جہاں جہاں اسٹیمپ لگوانا چاہتے ہو......سب لے آؤ......مگر اس وقت بخش دو۔ مجھے......زندگی بھر کے لئے جیل میں ٹھونس دو——— میرے خاندان والوں پر بھی رحم مت کرو......سب کو جیل میں ڈال دو۔ سڑا دو......عمر قید دے دو...... پھانسی دے دو......اس سے بھی کوئی بڑی سزا ہو تو......مگر یہ سب......،

وہ لرز رہا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

''میں مر چکا ہوں۔ یہ زندگی نہیں ہے۔ موت سے بدتر زندگی مر چکا ہوں۔ جو کچھ دیکھ لیا ہے، اس سے آگے دیکھنے، سننے اور جینے کو باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔ انسانیت کے واسطے...... یہ بچی ہے میری۔ سمجھو صاحب...... آپ کی بھی بچی ہوگی......'

''نہیں ہے۔ میری کوئی بچی نہیں ہے ـــــ بھوانی زور سے گرجے۔ رٹنا کر کے چابک نے برس برس کر رشید کو بیٹی کے پاس پہنچا دیا ـــــ وہاں دیور کے پاس ـــــ ننگی زبیدہ کا سر بیہوشی کے عالم میں دیوار سے ٹک گیا تھا۔

'چل رے بوڑھے۔ تو بھی اٹھ۔ بڑی دیر سے دیوار میں سر مار رہا تھا ـــــ بھوانی گرج کر بولے۔'' چل...... چل اپنی بہو کے ساتھ شروع ہو جا ـــــ سنتے ہیں سالے مسلمان کا کٹا ہوا جانور اصلی رنگ تو بڑھاپے میں دکھاتا ہے۔ اپنی بوڑھی عورت سے تجھے بھلا کیا ملتا ہوگا۔ چل شروع ہو جا۔ پھنک چند......، بھوانی پھنک چند سے مخاطب ہوئے...... ذرا بوڑھے کو سمجھا۔ بتا کہ یہ سب قانون کے دائرے میں آتا ہے۔ چل لگا اسے ایک ڈنڈا ـــــ کہ سالے آتنک وادی کا مزاج ٹھکانے آجائے......''

OO

آسمان پر چھائی سرخی مائل بدلیوں کی رنگت ایسے ہوگئی تھی جیسے آنسو گر رہے ہوں...... فطرت کی نقاشی بھی عجیب ہے...... کبھی کبھی جب بھرپور گھٹا اور بدلیاں چھائی ہوں تو آسمان کو دیکھئے۔ ایسی انوکھی اور زندہ تصویریں کہ رافیل اور لیونا ڈونچی کے شاہکار بھی شرما جائیں ـــــ اب چاروں طرف آسمان پر خون پھیلا تھا۔ اور اس کے آنسو بدلیو کے خفیف ٹکڑوں کے بیچ لٹکے ہوئے تھے۔

پھنک چند کے قدموں میں جنبش ہوئی...... اچانک وہ بھوانی سنگھ کی طرف مڑا اور گھٹی ہوئی آواز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''نہیں سرکار...... مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔''

'' کیوں؟ بھوانی طیش میں مڑے۔ کیوں تیری کڑی ہے۔ تیری بیوی ہے...... سالے پولیس میں نہیں رہنا ہے تو سنیاس کیوں نہیں لے لیتا......''

''لیکن سر......، وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا...... یہ...... یہ قانون کے دائرے میں نہیں

آتا ــــ یہ قانون کے دائرے سے باہر ہے......،

اس کا چہرہ سپاٹ ہو رہا تھا۔ اور برف کی طرح ٹھنڈا۔

'' قانون۔ بھوانی سنگھ ہونٹ بھینچ کر مڑے۔ بڑا قانون والا ہو گیا ہے آج پھنک چند...... اس سے پہلے ایسے کتنے اقبالیہ بیان لے چکا ہے تو۔ میرے سامنے...... میں گواہ ہوں۔'

اس نے سر جھکا لیا۔

'' قانون سکھاتا ہے تو۔ بھوانی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھیلا...... اتنی سی وردی اور قانون سکھاتا ہے تو...... بتاتا ہوں تجھے۔ آزادی کے دنگوں میں یہی لوگ تھے۔ کٹی ہوئی ریلیں آتی تھیں ہندو شرنارتھیوں کی ــــ مردوں کے تو سر اتار لیتے تھے یہ سالے ــــ اور ہندو لڑکیوں کو یہ ملا داڑھی والے اپنے ناڑے کے اندر بند کر لیتے تھے......''

'' اس وقت یہی کچھ سب کے ساتھ ہو رہا تھا سر......، پھنک، کی آواز لڑکھڑا گئی مگر وہ بول نہ سکا ــــ بھوانی کے دھکا دینے سے اس کے جسم کا توازن بگڑ گیا۔ وہ رتنا کر کی طرف لڑھک پڑا۔ اچانک سنبھلا۔ اور دوسرے ہی لمحے سرعت کے ساتھ گھوما ــــ اور ہوا سے ہلتے دروازے سے باہر نکل گیا۔''

پھنک چند۔ بھوانی زور لگا کر چیخے پھر بدبدائے...... سالا نامرد کا بچہ۔

آسمان پر بدلیوں کا کھیل چلتا رہا۔ کتنے آنسو ٹپکے اور بادلوں کے کتنے ٹکڑے چکور ہو کر کندھے پر لاش اٹھائے سوگواروں میں بدل گئے۔ کس نے یہ منظر دیکھا...... ہوا تیز چلتی رہی...... آسمان کے منظر بدلتے رہے...... بدلیاں گپ چپ نیلے آسمان اور خفیف اندھیرے میں چھپنے نکلنے کا کھیل کھیلتی رہیں۔

قارئین!

'' یہاں یہ کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسی کہانیوں کے ساتھ عجیب ماجرا یہ ہے کہ ایسی کہانیاں اپنے اختتام کے لئے بھٹکتی رہتی ہیں ــــ 'پوٹا' اور 'ٹاڈا' کے مارے اِن لوگوں کا انجام کیا ہو، میں آپ پر چھوڑتا ہوں ــــ لیکن فی الحال میرے پاس ایسی کہانیوں کا انجام کے لئے دو صورتیں ہیں:

انجام (1)

اس کے بعد پھنک چند کی کوئی خبر نہیں آئی۔ وہ کہاں گیا...... کہاں مر کھپ گیا......اور اسی لیے مجھے آپ کے سامنے ٹپکنا پڑ رہا ہے...... وہ میرا کردار تھا، اس لیے مجھے پتہ ہے...... کہ وہ اتنا بہادر بھی نہیں ہوسکتا کہ خودکشی کر لے، کسی کو مار دے یا فرار ہو جائے...... مجھے پتہ ہے، وہ ایسا کوئی بھی ہمت بھرا کام کرنے کے لائق نہیں ہے...... پھر بھی۔ وہ اس منظر کا چشم دید گواہ رہا ہے، جو ٹارچر روم کی اندھیری کوٹھری میں کھیلا جاتا رہا اور (شاید) منظر کی تاب نہ لاکر وہاں سے فرار ہوگیا۔

ہاں، ایک بار ایسا بھی ہوا۔ (یہ میرا ابھرم نہیں ہے)...... کہ رات کے اندھیرے میں وہ اچانک میرے کمرے میں نظر آیا...... میرے لکھنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا۔ میں نے صاف پہچان لیا...... وہ پھنک چند ہی تھا۔ وہ کافی کمزور لگ رہا تھا۔ مگر چہرے سے نہیں...... اس نے بتایا، اس نے جو بتایا، وہ میرے لیے حیرت زدہ کرنے والا تھا۔ اس نے بتایا...... وہ شمسان میں رہ رہا ہے ان دنوں...... جہاں مردے رہتے ہیں یا مردے جلائے جاتے ہیں...... وہ وہیں چھپا بیٹھا ہے۔ اسے روشنی سے...... اجالے سے ڈر لگتا ہے......اور وہ اپنی کھوئی ہوئی مضبوطی کو پانے کے لئے بدن میں کانٹے اگانے کا عمل کر رہا ہے۔

مجھے اس سے ناراضگی تھی۔ اس لیے میں غصے سے اس کی طرف بڑھا۔ اور سچ کہتا ہوں، وہ اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔۔ پھر یہ ہوا کہ غصے کے عالم میں، اس کی جگہ، میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا...... احساس ہوا کہ کرسی کی سیٹ پر ڈھیر سارے کانٹے اُگے ہوئے تھے......

انجام(2)

اگر آپ کو اس کہانی کا یہ انجام پسند نہیں ہے، تو اسی کہانی کا ایک انجام یہ بھی ہوسکتا ہے۔

پھنک چند گھر آگیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی...... جیب میں قانون سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی پستول اس کی کپکپاہٹ کے ساتھ کانپ رہی تھی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا...... ذہن پر بجلیاں گرج رہی تھیں...... گھر میں قدم رکھتے ہی اس نے دیکھا...... اس کی جوان لڑکی بستر پر سوئی

پڑی ہے۔ ایک لمحے کو زبیدہ کا چہرہ اس کی آنکھوں میں ناچ گیا...... آسمان سے جیسے کوئی بجلی گری اور اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں سما گئی۔

کانپتے ہاتھوں سے اس کی انگلیاں جیب کے اندر رکھے پستول کو ٹٹولتی رہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ٹانگوں کے پاس ہلکی سی حرکت ہوئی۔ ایسا لگا، جیسے کٹی ہوئی مردہ چھپکلی اچانک تڑپ گئی ہو۔ بے حس سوئے کیڑے میں ہلکی سی پھڑ پھڑاہٹ سما گئی ہو...... پھر وہ اپنی چھٹپٹاتی، ٹوٹتی سانسوں کو یکجا کرتے ہوئے زور سے چیخا۔ جیسے ہی چیخ سن کر بدحواس سی اس کی بیوی اس کے سامنے آئی، اس نے گولی چلا دی۔ بیوی چیخ مار کر زمین پر گر پڑی۔ اس نے دوسری گولی کمرے میں سوئی ہوئی بیٹی کی طرف داغی۔ پھر رکا نہیں۔ اپنی کنپٹی پر پستول کی ناک رکھ کر آنکھ موند لی......

باہر ہوا سر سرا رہی تھی...... آسمان پر بدلیوں کا کھیل ابھی بھی چل رہا تھا......

○○○

سناٹے میں تارا

بُرے موسم کے بے حد اداس دنوں میں یہ کتاب

نظریات کی سیڑھیوں کے نیچے
کھدائی جاری ہے

پوری طاقت سے پکڑے رہیے
اپنے اپنے ملک، مذہب
اور عقیدے کے سانپوں کی دُم
جیسے پکڑے رہتے ہیں
ڈوبتی ناؤ پر سوار لوگ
ایک دوسرے کو!

—— نعمان شوق

سنّاٹے میں تارا

(بُرے وقت کے اُداس موسموں میں یہ کتاب)

سب بھول، گیا کچھ یاد نہیں

میں سب کچھ بھول گیا۔ کچھ بھی یاد نہیں رکھنا چاہتا۔ میری پچھلی کتاب ''صدی کو الوداع کہتے ہوئے...... '' تھی۔ یہ کتاب سن 2000ء کے اوائل میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔

سن 2000ء ـــــ نئی الفی کی شروعات ہو گئی تھی۔ نئی الفی، نئی صدی۔ نیا موسم......

لیکن نئی صدی یا نئی الفی کے محض ان تین برسوں نے ہمیں کہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے......

سن 2000ء میں شائع شدہ اپنی کتاب میں، 'سنّاٹے میں تارا' عنوان کے تحت میں نے کھل کر اپنی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی تھی ـــــ

'' تمھارے ہاتھوں پر
ناچتی رہی ہے
ناچتی رہی ہے یہ دنیا ''

ـــــ ناظم حکمت

میں نے سنّاٹے میں تارا، کی شروعات میں، ناظم حکمت کے یہ نظم شامل کی تھی۔ آج نئی صدی کے تین برس گزر جانے کے بعد لگتا ہے ـــــ میرے ہاتھوں پر کب کہاں ناچی تھی یہ دنیا ـــــ دنیا کی تو رفتار ہی رُک گئی ہے ـــــ

چلتے چلتے جیسے زندگی کی سوئی ٹھہر گئی ـــــ

چلتے چلتے جیسے وقت رک گیا____

چلتے چلتے جیسے تین برسوں میں بھیانک طوفان آ گیا____

ہر شاخ جل گئی____

محبت کے معنی بدل گئے____ سیاست بدل گئی____ دنیا بدل گئی...... اور بدل گیا مسلمان......

وہ اخوت بھائی چارگی اور معصومیت کی مثال، مسلمان____

وہ مسلمان____ جن کے نام سے ایمانداری اور محبت کی دہائیاں دی جاتی تھی......

○○

سناٹے میں ایک تارا ٹوٹا اور چپکے سے خلاء میں سوراخ کرتا ہوا مسلمانوں کے ماتھے پر آ کر خاموشی سے لکھ گیا____ دہشت پسند......

سن 31/ دسمبر 1991ء کو اخبار کی سرخیاں تھیں......

بے گناہ انسانوں کو یرغمال بنانا____ ایذا پہنچانا، قطعی غیر اسلامی اور غیر انسانی عمل

اغوا کاروں کے عمل کا جہاد اور اسلام کے نظام عدل وانصاف سے کوئی تعلق نہیں____

انڈین ائیر لائنز کے اغوا کاروں سے بات چیت کے لئے قندھار جانے کی پیشکش کرتے ہوئے افغانستان کے حکمراں طالبان سے پُرزور اپیل کی گئی ہے کہ وہ طیارہ میں یرغمال بنائے گئے معصوم بچوں اور روپن کٹیال کی بیوی کی فوری رہائی کو یقینی بنائے۔

نئے سال کے موقع پر ہم نے اطمینان کا سانس تو بھرا کہ بدلی ذرا سی چھٹی تھی۔ اغوا کنندگان مسرت سے جھومتے، اپنے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یعنی ٹھیک نئی الفی کے پہلے دن صورت حال بدل چکی تھی۔

تین جنگجوؤں کے عوض یرغمال مسافروں کی رہائی

مسافروں کی وطن واپسی ☆طیارہ اغوا بحران کا ڈراپ سین ☆ اغوا کار تینوں جنگجوؤں کو لے کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ☆ ہائی جیکروں نے اپنے ایک ساتھی کو مار ڈالا

انڈین ایئر لائنز کے طیارہ اغوا سے پیدا غیر یقینی صورت حال 154 مسافروں اور عملہ کے ارکان کے بدلے تین کٹر جنگجوؤں کی رہائی کے سمجھوتے کے ساتھ ختم ہوگئی۔ ہائی جیکروں اور طالبان کے ساتھ ہندوستانی مذاکرات کاروں کی پانچ روز تک صبر آزما بات چیت کے بعد اس بحران کو ختم کرنے کا معاہدہ عمل میں آیا۔ جس کے تحت اغوا شدہ طیارہ سے رہا کئے گئے مسافروں کے پہلے دستے کو لے کر انڈین ایئر لائنز کا ایک خصوصی طیارہ بوئنگ 737 آج رات پونے نو بجے یہاں پہنچا جس میں 101 مسافر سوار تھے۔ دوسرا طیارہ ایئر بس اے 320 اس کے کچھ ہی دیر کے بعد اترا اس پر باقی ماندہ مسافر اور عملہ کے لوگ تھے۔ ہوائی اڈہ پر رہا کئے گئے مسافروں کے رشتہ دار بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اپنے عزیزوں کو دیکھ کر ان کی خوشی کی حد نہ رہی اور کئی لوگوں کو بلکتے دیکھا گیا۔

لیکن طوفان ابھی تھما نہیں تھا۔ ان تین برسوں میں دنیا کو کیا کیا نہیں دیکھنا پڑا ——— 11 ستمبر کے ——— ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے حادثہ کے بعد امریکہ کا انتقامی سلسلہ...... افغانستان سے عراق تک تباہیوں کا ایک نیا خطرناک موسم...... دیکھتے دیکھتے دنیا کا گلوب گھوم گیا۔ دہشت پسندی دنیا کے ایک ایک صفحے پر لکھ دی گئی...... ہندستان میں جمہوریت کا قتل عام ہوا...... کشمیر سے کنیا کماری تک خون ہی خون پھیل گیا...... گودھرا سے شروع ہوا خونی سفر، ہر صوبے کو گجرات بنانے کی تیاری میں اپنے اپنے سیاسی مہرے چل رہا ہے ———

اور......

اس گہرے سناٹے میں کس کس دکھ کا حساب رکھوں۔
رکھوں بھی تو کیوں؟——
کیوں سوچوں کہ پہلی بار یہ دنیا میرے ہاتھوں پر کب ناچی تھی——
پہلی بار یہ دنیا میرے اشاروں پر کب جھومی تھی——
پہلی بار یہ دنیا میرے اندر کب مسکرائی تھی!——

دہشت پسندی کا سفر

''ایک عجیب سی مشکل میں ہوں اِن دنوں
میری بھرپور نفرت کرنے کی طاقت
دن بدن کمزور پڑتی جا رہی ہے
انگریزوں سے نفرت کرنا چاہتا ہوں
تو شیکسپیئر آڑے آجاتے ہیں
مسلمانوں سے نفرت کرنا چاہتا ہوں
تو غالب آکر کھڑے ہو جاتے ہیں......''

......کنور نرائن

اب چلئے دہشت پسندی کے کچھ منظر آپ کو دکھاتا ہوں——

منظر ایک......

4/اکتوبر 2002ء سب ٹی وی چینل پر منوج رگھوونشی کا پروگرام کھلا منچ چل رہا ہے—— تماشائی ہال میں بیٹھے لوگ آپس میں جرح کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ جرح کرنے والوں میں راشٹریہ سہارا اردو کے ایڈیٹر عزیز برنی ہیں—— تو دوسری طرف ایودھیا تنازعہ سے روشنی میں آئے اور اپنی بے لگام زبان کے لئے مشہور پروین توگڑیا—— موضوع ہے ''اسلامی دہشت گردی......'' منوج، پروین توگڑیا کے سُر میں ہی بولتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں پر مسلسل اپنا طنزیہ تیر چلا رہے ہیں—— قرآن کی دھجیاں اڑا رہے ہیں——

تماشائی ہال میں شور ہے ــــــ عزیز برنی اکیلے پڑے، اپنا بچاؤ کرنے میں پریشان نظر آرہے ہیں......

منوج رگھونشی چیخ رہے ہیں......نہیں آپ کہئے......قرآن صرف اس مخصوص وقت کے لئے صحیح تھا، یا آج کے لئے۔'

تو گڑیا پوچھتے ہیں ــــــ آخر اسلامی دہشت گرد کی مخالفت کرنے کے لئے کوئی مسلمان سامنے کیوں نہیں آتا۔ ایک بھی مسلمان؟

تماشائی ہال میں بیٹھے زیادہ تر لوگوں کے ہاتھوں میں فتوے، حدیث اور قرآن پاک کے الگ الگ نسخے، آیتوں کے ترجمے موجود ہیں ــــــ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا جواب ایک ایسے آدمی کو دینا ہے جو ایک اردو روزنامہ کا ایڈیٹر ضرور ہے مولوی یا عالم نہیں۔

بات کھلے منچ کی نہیں ہے۔ آئے دن ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، جب وشو ہندو پریشد اور شیوسینکوں کو تماشا گاہ میں بیٹھا کر پروین تو گڑیا جیسے بے لگام جانوروں کے سامنے ڈاکٹر برنی جیسے سیدھے سادھے لوگوں کو کھڑا کر دیا جاتا ہے ــــــ ایسے پروگرام ساری دنیا دیکھتی ہے اور جو پیغام ایسے پروگراموں کے ذریعہ عوام تک پہنچایا جاتا ہے ــــــ وہ بہت صاف ہوتا ہے ــــــ مثلاً مسلمان بھگوڑے تھے......اسلام تلوار کے زور سے پھیلا......اسلام دہشت گردی کا مترادف ہے......اور مسلمان، وطن کا غدار ہے۔

ہندوستان میں اسلام مخالف لہر کچھ عرصے سے بے حد تیز ہوئی ہے۔ نتیجے کے طور پر ملک کی سب سے بڑی اقلیت یا دوسرے لفظوں میں ملک کی دوسری بڑی اکثریت، یعنی مسلمانوں نے اگر ایک بار پھر خود کو عدم تحفظ کے گھیرے میں دیکھنا شروع کیا ہے، تو یہ کہیں سے غلط نہیں ہے۔ ایسے ملک میں جہاں کا وزیر اعظم تک جذبات کے بہاؤ میں مسلمانوں کے خلاف آگ اُگلنے میں ذرا بھی ہچک محسوس نہیں کرتا ہے، وہاں یہ سوچنا تو پڑے گا ہی ــــــ کہ آخر اس شدّت پسند رویے کا سچ کیا ہے ــــــ؟ واجپائی جیسے سیاستداں کو بھی مسلمانوں کے بارے میں وہی ٹیپ چالو کرنا پڑتا ہے...... جسے وشو ہندو پریشد ایک لمبے عرصہ سے بجاتا آیا ہے ــــــ تب سوچنا پڑتا ہے کہ دال میں کچھ نہیں بلکہ 'خطرناک حد تک کالا ضرور' ہے۔

ایک وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایودھیا تنازعہ یا ہندوتوا کا 'موضوع' اقتدار کے گلیارے میں خاص ہلچل پیدا کرنے میں ناکام ہے ـــــــ لیکن بعد کے حادثوں نے بتادیا کہ ایسا سوچنے والے غلط تھے۔ دراصل ہندستانی تہذیب میں مذہب کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ 100 کروڑ کے عوام سے لے کر اقتدار اور سیاست کے گلیارے تک ـــــــ ہر زمانہ، ہر عہد کا اکیلا فاتح یا ہیرو 'مذہب' رہا ہے...... اور یہ بھی کھلا سچ ہے کہ نئی صدی کا تیسرا سال ختم ہوتے ہوتے اسی مذہب کی آڑ لے کر، ایک بار پھر سے اسلام کو جھوٹا، قرآن کو غلط کتاب اور مسلمانوں کو دہشت گرد عائد کرنے کی کارروائی اپنی تمام حدیں پھلانگ چکی ہے۔

منظر-2

24 ستمبر 2002ء کو ایک ساتھ دو حادثے ہوئے تھے ـــــــ جموں کشمیر ودھان سبھا الیکشن کے دوسرے دور میں 28 سیٹوں کے لئے پولنگ ہوئی۔ اس دن صبح سے جی نیوز چینل ''فدائن، انکاؤنٹر، پروگرام میں رونگٹے کھڑا کرنے والا لائیو شو دکھا رہا تھا۔ جسے دیکھ کر اپنے آدمی ہونے پر شرمندگی ہو رہی تھی۔ 16 گھنٹے تک چلنے والی کارروائی اس وقت ختم ہوئی جب سیکورٹی فورسیز نے گوگی باغ کے مکان میں چھپے دونوں فدائن دہشت گردوں کو مار گرایا۔ ذرا اس خطرناک منظر کو یاد کیجئے ـــــــ ایک طرف جاری الیکشن ـــــــ دوسری طرف '' دہشت گردوں کو مار گرانے کی کارروائی...... کیمرا بار بار چھت پر گرے ایک دہشت گرد پر فوکس ہوتا ہے...... جو مر چکا ہے۔ مکان سے آگ کے شعلے اٹھ رہے ہیں...... آگ میں جلتا ہوا ایک چھجہ دہشت گرد کے پاس گرتا ہے...... اور دیکھتے ہی دیکھتے دہشت گرد کا بدن آگ کے شعلوں میں جھلس جاتا ہے......

20-25 سال کے ان جوانوں کی شناخت اسلامی دہشت گرد کے طور پر کرائی جا رہی ہے۔ اسلام ـــــــ جو پیدائش سے اپنی تعلیم میں تشدد، بھید بھاؤ، چھوا چھوت کے خلاف، جنگ لڑتا رہا ہے ـــــــ 20ویں-21ویں صدی میں 'بڑی طاقتوں' کے ذریعہ ایک سچے مذہب اور دنیا کی دوسری بڑی آبادی کو آج دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے۔

24 ستمبر کو ہی گجرات کے اکچھر دھام مندر پر فدائن حملہ اور ـــــــ دہشت گردوں

کے حملے کی خبریں سارے ملک میں چیخ رہی تھیں۔ لوگ سانس روکے اسلامی دہشت گردی اور پولیس کمانڈو کی کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔ ملک کا ہر نیوز چینل اس لائیو شو کو زیادہ سے زیادہ سنسنی خیز بنا کر دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا یہ دونوں کارروائیاں اسلامی تھیں؟ یا صرف دہشت گردی کی کارروائیاں......؟

آپ کہہ سکتے ہیں کہ فدائن چونکہ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کر رہے تھے...... اس لئے یہ اسلامی کارروائی ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کون کرے گا کہ 'فدائن' اس طرح کی کارروائی سچ مچ اسلام کے نام پر کر رہے تھے؟ اسلامی تحریکوں سے وابستہ 'حرکت القصاص، لشکر طیبہ یا حرکت المجاہدین کو چھٹنے دیجئے ــــــ حقیقت میں کوئی بھی ہندوستانی مسلمان اسے گلے اتارنے کو تیار نہیں ہے کہ یہ فدائن ان کے آدمی ہو سکتے ہیں...... یا یہ سب کچھ اسلام کو بچانے کے لئے کیا گیا تھا...... اس کے بعد بھی، ابھی حال تک جموں اور کشمیر میں (اگست 2003) ہونے والے فدائین حملوں کے بارے میں خود دیکھئے ــــــ جب جب دہشت گردی کا کوئی بھی 'حادثہ'، مذہب یا خاص طبقہ سے جوڑ دیا جاتا ہے تو پورے ملک میں رہنے والے اس فرقہ کے لوگوں پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے......

حقیقت میں امریکہ یہی چاہتا ہے۔ اسلام ایک بڑی طاقت کے طور پر ملک کے نقشے پر ابھرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس اثر کو مٹانے کے لئے مسلمانوں اور اسلام کو حاشیے پر ڈھکیلنے کے لئے امریکہ نئے نئے بہانے ڈھونڈ تا رہا ہے اور ایک بڑی طاقت کا ساتھ دینے کے لئے چھوٹے بڑے سبھی ملک مل کر امریکی تاناشاہ کا ہاتھ تھامنے کو تیار ہو گئے تھے ــــــ حقیقت میں دیکھا جائے تو امریکی تہذیب کا سب سے زیادہ مضحکہ خیز اور گھنونا اعلان تھا...... ''اسلامی دہشت گردی کا ان'' آج تک کسی بھی مذہب...... ملک یا سماج میں ہونے والی دہشت گرد کارروائیوں کو مذہب سے جوڑ کر نہیں دیکھا گیا ــــــ عیسائی دہشت گردی، یہودی دہشت گردی یا ہندو دہشت گردی کی مثالیں کبھی نہیں دی گئیں ــــــ سن 84 میں کچھ وقت کے لئے سکھ دہشت گردی، کی آواز اٹھی تھی۔ مگر بعد میں 'اگروادی' یا آتنک وادی کہہ کر اس کلنک کو مذہب سے ہٹانے کی کوشش کی گئی...... پھر اسلامی دہشت گردی کیوں؟ دوہری ذہنیت یا دوہرا رویہ کیوں؟ کیا یہ کل ملا کر مسلمانوں کو حاشیے پر ڈالنے کی کارروائی نہیں ہے......؟

یہ سوال حقیقت میں غور طلب ہے کہ کیا این ڈی اے کا ساتھ دینے والی بھی پارٹیاں اور کچھ کچھ کانگریس بھی ایسا سوچنے پر مجبور ہے......؟ کیونکہ مسلمانوں کا ساتھ دینے پر جس طرح پاسوان جیسوں کو حاشیے پر پھینک دیا گیا ہے، یہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ دراصل ووٹ بینک کے لئے دلت اور مسلمان دو ایسے بڑے ہتھیار رہ گئے ہیں جن کے ارد گرد تمام پارٹیاں ڈول رہی ہیں۔ مسلمان جو نہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کا ہوا، نہ کانگریس کا، نہ بی ایس پی کا ہوا اور نہ ہی سماجوادی کا۔ مسلمانوں کے ووٹ بینک کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، یہ الیکشن میں اچھے اچھوں کی نیند اڑا دیتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ سیاست، حکمت عملی یا ڈپلومیسی کے 'ٹانکے بھرانا' بھی ناممکن تھا۔ مسلمانوں کو توڑ دو تو انتخابی تجزیہ خود آسان ہو جائے گا، کا اصول زیادہ آسان تھا۔ ادھر امریکہ نے لادین کی مقبولیت سے گھبرا کر اسلامی دہشت گردی کا راگ چھیڑا____ اور ادھر بی جے پی کی سیاست میں تیزی آ گئی۔

تو کیا بی جے پی کا برسوں پرانا خواب یہی تھا۔ حکومت کرنے کا اکیلا، خاموشی اور صبر کی بنیاد پر مبنی نظریہ یعنی......صبر سے کام لو۔ وقت کی پرواہ مت کرو۔ بھگوا تعلیم، بھگوا رنگ اور بھگوا انجکشن......دیر آید درست آید کے نظریوں پر کام کرتی بی جے پی سرکار کو اب صرف ایک قلعہ فتح کرنا ہے____ بھاجپا پر سے این ڈی اے کے 'چوکھٹے' کو الگ کرنا۔ نیوٹن کے نظریئے اپنا رنگ دکھاتے ہیں......تو اگلے انتخاب تک بی جے پی کو کسی بھی بیساکھی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

گجرات میں مودی کی فتح سے ان کا سینہ پہلے ہی 'چوڑا' ہو چکا ہے......

مدرسے اسلامی دہشت گردی کی فیکٹری

دیکھتے ہی دیکھتے مدرسے اسلامی دہشت گردی کی فیکٹری بن گئے۔ ہندستان کی 100 کروڑ عوام کے دل میں گانٹھ کی طرح یہ بات بیٹھا دی گئی کہ حقیقت میں مدرسے ہی نئی دہشت گردی کی پیداوار ہیں۔ مدرسوں کے حالیہ سروے سے کئی دلچسپ جانکاریاں ملی ہیں۔ ایک نوجوان نے اپنا نام خفیہ رکھتے ہوئے بتایا کہ سرکار کی طرف سے معائنہ کے لئے آئے لوگوں نے کچھ بے حد دلچسپ مگر قابل اعتراض سوالوں کی جھڑی لگا دی......

......آپ پڑھتے ہیں؟

-ہاں-

......کہاں؟

-مدرسے میں۔

......کیا تعلیم دی جاتی ہے؟

دینی تعلیم۔

......کیا وہی تعلیم دی جاتی ہے جو افغانستان میں ملا عمر یا لادین حمایتیوں کو دی جاتی ہے۔

ہاں، دینی تعلیم ساری دنیا میں ایک ہی ہوتی ہے۔

......آپ کیا پڑھتے ہیں؟

قرآن وحدیث۔

......کیا یہی قرآن وحدیث افغانستان میں بھی پڑھایا جاتا ہے؟

-ہاں۔

OO

کہنا نہیں ہوگا کہ ایسے سروے سے کیا نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مدرسے، اسلامی تعلیم کے مرکز ہیں۔ مدرسوں کو ڈھانے کا مطلب ہے۔ اسلام پر پابندی۔ ایک مکمل تہذیب کا خون۔ یہیں سے قرآن وحدیث کی تفسیر پڑھانے والے مولوی اور حافظ نکلتے ہیں۔ اپنے بچوں کو دینی تعلیم دینے کے لئے مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی انہیں پر منحصر رہتی ہے۔

مدرسوں کو ختم کرنے کی حکمت عملی بنانے سے زیادہ ضروری ہے، یہ دیکھنا کہ غلطی کہاں ہو رہی ہے؟ بے روزگاری اور بھوک سے، پیدا ہوئے سچ سے بھی زیادہ خطرناک ہے وہ ماحول ــــــ جو پچھلے 10-15 سالوں سے اس ملک میں پیدا کیا جا رہا ہے۔ ایک سچ یہ بھی ہے کہ نئی نسل پاکستان سے شدید نفرت کرتی ہے۔ وہ تسلیم کرتی ہے کہ ہندوستان میں بھڑکنے والے فسادات کے پیچھے پاکستان کے ذریعہ دیئے جانے والے ــــــ عجیب وغریب بیانات اور جنرل مشرف کی بھارت کے ساتھ دشمنی کا ہاتھ ہے۔ مدرسوں میں ہونے والی غلط کارروائیوں کی مخالفت ضرور ہونی چاہئے ــــــ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ 'ایک ہی حمام' میں سارے ڈوبے ہوئے ہیں ــــــ اشتعال اور غصّے کا شکار تو اب قرآن جیسی پاک کتاب بھی ہونے لگی

ہے، جس کے بارے میں کوئی بھی مسلمان ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں ہے۔ اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے بچے الگ الگ ہیں...... ہاں، مدرسوں کی تعلیم میں راشٹریہ واد (وطن پرستی) کے سبق ضرور جوڑے جانے چاہئیں، جہاں پانی جیسے بھولے اور معصوم دماغ والے بچوں کو دینی تعلیم کے علاوہ یہ بھی بتانا چاہئے ـــــــ کہ ملک زیادہ اہم ہے......! اور دیش پریم کیا ہوتا ہے......!

لیکن 'دیش پریم' کا مطلب وہ نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ مسلمانوں سے امید کی جاتی ہے......یعنی آپ مسلسل پاکستان کو گالیاں دیجئے تو وفادار ـــــــ مسلمانوں کو ایک نئی تعریف ڈھونڈھنی ہوگی۔ کیوں کہ آنے والے وقت میں دہشت گردی، حب الوطنی اور وفاداری سے متعلق انہیں کتنے ہی امتحانوں سے گزرنا باقی ہے۔

مسلمان مخالف بیانوں کا بڑھتا 'آتنک'

کیا آپ نے غور کیا ہے ـــــــ پچھلے کچھ ایک مہینوں سے وزیر اعظم سے لے کر مودی، توگڑیا، نائیڈو اور آچاریہ گری راج کشور تک، جس طرح مسلمانوں کے خلاف بیان بازی کا سلسلہ شروع ہوا ہے وہ آزادی کے 56 برسوں کی تاریخ پر ایک ایسا کلنک ہے، جسے نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ملک کی تاریخ میں ایسے حادثے کوئی پہلی بار نہیں ہو رہے ہیں۔ لیکن ہندو 'سائیکی' سے پیدا ہوئے ہیڈگوار ہوں......شیاما پرشاد مکرجی، یا انڈمان کی جیل میں قیدی بنا کر بھیجے گئے ویر ساورکر ـــــــ یا جناح کے مسلم لیگی بیانات کا تلخ جواب دینے والے پٹیل ہوں۔ لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تب کی تاریخ اور 'سچ' مختلف تھا ـــــــ تب ہندوستان کا جسم غلام تھا......اور گاندھی جی کی دو آنکھیں یعنی ہندو اور مسلمان کو تقسیم کرنے میں فرنگی سرکار نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ملک کی توڑ پھوڑ اور تقسیم کا مسئلہ اتنا خطرناک تھا کہ پاکستان، جناح، مسلم لیگ اور مسلمان......نفرت کے مستحق سمجھ لئے گئے تھے۔

OO

ملک کی تقسیم کی تاریخ کو بعد کی نسلیں بھی فراموش کرنے میں ناکام رہیں۔ گویا یہ اپنے آپ میں ایسا زخم تھا جس کا ذکر آتے ہی مسلمانوں کے لئے ایک عجیب سی نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا

تھا ـــــ جن سنگھ اور جن سنگھ سے پیدا ہوئی ہندوتوا 'شاکھاؤں' نے اسی نفرت بھرے تصور کو پروان چڑھایا..... لوگوں کو بھڑکایا..... دراصل یہ وہی فلسفہ تھا، جو خون آلودہ تقسیم کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا..... شاید یہ سچ بھی جلد ہضم نہیں ہو سکا کہ بٹوارے سے پیدا ہوا ایک ملک تو اپنے کلچر اور تہذیب کو لے کر، ''جمہوریت'' اور سیکولرازم (جسے بعد میں نام نہاد سیکولرازم کا نام دیا گیا) کا دعویٰ ٹھوکتا رہا ـــــ وہیں دوسرے ملک نے جمہوریہ اسلام کا ٹھپہ 'لگا کر رہی سہی وفاداری اور دوستی کی دیوار پر آخری کیل ٹھوک دی ـــــ یہی نہیں جب اس جمہوریہ اسلام کہے جانے والے ملک سے بنگلہ دیش الگ ہوا..... تب، اس دوسرے ملک پر بھی اسلامی ملک کا ٹھپہ برقرار رہا ـــــ

پچھلے 56 برسوں میں وشو ہندو پریشد، ہندو مہا سبھا، یا شیو سینا جیسی جماعتوں کے گلے سے اسلام کی 'ہڈی' نہیں نکلی ہے۔ آزادی کے بعد کی تاریخ میں پڑوسی ملک کے تعلق سے جب کبھی مذہبی آزادی پر 'کلنک' جیسا کوئی بھی حادثہ سامنے آیا ہے، اسے فوراً اسلام سے یا مسلمانوں سے جوڑ کر دیکھا گیا ہے..... نتیجے کے طور پر نفرت کی آندھی کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی ہے.....

آزادی کے بعد جن سنگھ کی مسلسل شکست نے مسلمانوں اور سیکولرازم کے خلاف نیا مورچہ کھولنا شروع کیا۔ جن سنگھ کے نئے اوتار بھاجپا نے جن سنگھ سے سبق لیتے ہوئے نئے طریقے سے کام کرنا شروع کر دیا..... کام مشکل تھا۔ لیکن ٹھوس اور کامیاب نتیجہ دینے والا۔ اور جس رتھ کے مہارتھی اٹل بہاری، شری اڈوانی اور مرلی جی جیسے دانشور ہوں، وہاں 'صبر' انتظار اور راج کرو، کے نظریئے خود ہی کام کرنے لگتے ہیں۔ رتھ یاترا، بابری مسجد یا متنازعہ ڈھانچے کے گرائے جانے کے بعد سے ہی 'نئے ہندوی کرن' بننے شروع ہو گئے تھے..... انہیں 'سمی کرنوں' سے کٹیار، توگڑیا اور مودی جیسے تیز دھار والے بے لگام شمشیروں کی تخلیق ہوئی تھی۔ اب یہ ایسے بے لگام گھوڑے بن چکے ہیں جن کی آواز اگر روکی نہیں گئی تو ملک کو ایک بار پھر سخت مصیبت سے گزرنا پڑ سکتا ہے۔

ناموں کا چکر

کہتے ہیں جرم کا کوئی مذہب، ایمان نہیں ہوتا..... مجرم نہ ہندو ہوتا ہے، نہ مسلمان.....

مجرم کسی بھی ملک کی عدالت میں صرف مجرم ہی ہوتا ہے...... مجرم کی اس نئی سائیکی کے بارے میں دنیا کے سب سے بڑے مصنف شیکسپیئر کی بھی پہنچ نہیں تھی ــــــ شاید اسی لئے شیکسپیئر کو کہنا پڑا تھا...... نام میں کیا رکھا ہے؟ آج نام میں بہت کچھ رکھا ہے۔

دہشت گردی کی تعریف آج بالکل ہی بدل دی گئی ہے۔ جو بھی ہے، سب کچھ نام میں ہے...... دوبئی کا داؤد ہو...... یا پرتگال میں پکڑا گیا ابو سالم...... مافیا اور انڈر ورلڈ کے یہ مسلم نام اسلامی دہشت گردی کی علامت بن گئے ہیں۔

کیسی عجیب...... مضحکہ خیز حقیقت ہے...... مافیا سرغنہ چھوٹا راجن، چھوٹا راجن رہتے ہیں ــــــ لیکن چھوٹا شکیل، ابو سالیم یا داؤد مسلمان بن جاتے ہیں۔ 'نشیرو ی' اور 'ٹیپ کانڈ' میں پکڑا گیا سنجے دت صرف ایک ایکٹر رہتا ہے ــــــ اور جے پور کے ہرن تنازعہ یا حال میں کار ایکسیڈنٹ کرنے والا سلمان خاں ایکٹر سے مسلمان بن جاتا ہے۔ کرکٹ سٹہ اور جوئے میں ہندوستان سے ساؤتھ افریقہ تک بے شمار نام اُچھالے جاتے ہیں لیکن کلوزنر سے جڈیجہ اور مونگیا تک تنازعہ میں الجھے چہرے محض کرکٹر ہی رہتے ہیں۔ لیکن اسی سٹہ بازار کا شکار اظہر الدین مسلمان قرار دیا جاتا ہے ــــــ کیوں؟

دیکھا جائے تو نام میں بہت کچھ رکھا ہے ــــــ جرم اور دہشت گردی کو قوم، برادری اور مذہب سے جوڑنا مناسب نہیں...... ایسا کرنا اپنے آپ میں جرم ہے ــــــ اس سے پہلے کہ ناموں کا یہ چکر بڑھتے بڑھتے نفرتوں کی نئی تاریخ لکھنا شروع کردے، ان چھوٹی چھوٹی 'غلطیوں' کی تلافی کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جرم کو صرف جرم سمجھنے کی ذہنیت کو بڑھاوا ملنا چاہئے...... اخلاقیات سے 'مذہب کے ہاتھی دانت' نکال کر یہ بتانے کی کوشش ہونی چاہئے کہ اظہر ایک کرکٹر ہے۔ سلمان ایکٹر۔ داؤد یا کشمیر اور پاکستان انسپانسرڈ دہشت گرد، مسلمان یا اسلام سے جڑے لوگ نہیں ہیں۔ صرف مجرم ہیں۔

گجرات ہو یا بھاگلپور...... ملیانہ یا 1984ء کا سکھ ہندو دنگا...... دہشت گردی کیسے پیدا ہوتی ہے ــــــ ہم دیکھ چکے ہیں۔ ناموں کے تنازعہ میں پھنس کر، بگڑتی ہوئی صورت حال اتنی خطرناک ہو جائے گی کہ مستقبل میں اس پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔

''مردہ اُسامہ زندہ اُسامہ سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے''

حقیقت میں دیکھا جائے تو یہی ہورہا ہے ـــــــ 'گمشدہ' اسامہ، اسلامی دہشت گردی کا نمونہ بن گیا ہے ـــــــ بُش اور امریکہ کی آنکھیں چاروں طرف اسے تلاش کرتی پھر رہی ہیں ـــــــ اسی کا نتیجہ ہے کہ ورلڈ ٹریڈ ٹاور کی پہلی برسی منانے کے کافی دنوں بعد بھی امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں داڑھی والوں کو شک کی نگاہ سے دیکھے جانے کا سلسلہ جاری ہے۔ کمل ہاسن کو مسلمان سمجھ کر پکڑنا اور امریکہ میں عامر خاں کو پریشان کیا جانا اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

دنیا کی یہ دوسری بڑی قوم نشانے پر ہے...... اور دہشت گرد ٹھہرائی جاچکی ہے......

10 برسوں میں 'مسلمان' ہونے کا احساس کچھ زیادہ ہی زور پکڑتا چلا گیا ہے اور اب اُسامہ بن لادن اور صدام کے نام کے ساتھ یہ 'مسلمان' نام کچھ ایسے خوفناک ہو چکے ہیں کہ آسٹریلیا، امریکہ اور انگلینڈ میں آئے دن ان دہشت گرد داڑھی والوں کو بیچ بازار میں پکڑ کر جان سے مارنے کی کارروائی چل رہی ہے...... مقصد صاف ہے...... دہشت گرد...... کو ماردو ـــــــ دہشت گردی خود ختم ہو جائے گی۔ لیکن دہشت گرد کون؟

مسلمان اور کون......؟ مطلب پہلی گولی اسلام پر چلاؤ۔ مسلمان خود مر جائے گا۔

OO

پچھلے دس برسوں میں دنیا کی اس سب سے بڑی قوم نے کسی بھی ملک میں، کسی بھی سطح پر کچھ بھی کہا یا کیا ہو ـــــــ میڈیا نے ہر بار 'مسلمان' اور اسلام کو کچھ ایسے رنگوں میں پیش کیا ہے کہ پڑھتے اور لکھتے ہوئے ہر بار مسلمان ہونے کی حیثیت سے تکلیف کا سامنا کرنا پڑا ہے ـــــــ تکلیف کا احساس تو ایک الگ بات ہے۔ ہندوستان کی اس 20 کروڑ مسلمان آبادی کو، سامنے والے کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں بھی نظر آنے لگی ہیں۔

......آپ مسلمان ہو؟

ہاں بھائی ہاں،

......تو مسلمان ایسے بھی ہوتے ہیں؟

'یعنی' مسلمانوں کو کیسے ہونا چاہئے؟

......'نہیں! میرا مقصد'......

میں سمجھتا ہوں۔ میزائلیں......راکٹ لانچرس، اے کے-47 وغیرہ ہر وقت ہاتھوں میں لے کر گھومنا چاہئے...... تاکہ دور سے ہی انہیں دیکھ کر زمین جوتتا ہوا کسان تک چیخ اُٹھے ___ وہ جارہا ہے مسلمان...... دہشت گرد...... ہے نہ؟ نیوز ویک ٹائمس سے لے کر انڈیا ٹوڈے جیسی میگزین دیکھ لیجئے۔ ہتھیار اٹھایا ہوا مسلمان......توپ کے گولوں کے درمیان کھڑا مسلمان...... آگ لگاتا ہوا مسلمان۔ افغانی پہاڑیوں پر چوکس ہتھیار بند مسلمان...... چلاتا ہوا مسلمان۔ پاکستان میں آئے دن خطرناک جلوسوں کی قیادت کرتا ہوا مسلمان...... کچھ عرصے پہلے ایک میگزین میں معصوم 16 سال کی ایک بچی کی تصویر چھپی تھی۔ طالبان کے خلاف مورچہ پر، 14 برس کی یاسمین...... بندوق اٹھائے ہوئے یاسمین کی تصویر مسلمانوں کی نئی سمت کو صاف صاف بیان کرتی نظر آتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں کلاشنکوف اور گرینیڈ...... یہ تصویر سب کی نظروں میں آچکی ہے۔ یعنی کل ملا کر طالبان بھی ہے مسلمان......اور جو طالبان کے خلاف ہیں یا کھڑے کئے گئے ہیں وہ بھی مسلمان...... ناردن الائنس سے لے کر پاکستان اور عرب ملکوں تک مسلمان شک اور سوالوں کے گھیرے کھڑا ہے۔ امریکہ میں...... انگلینڈ میں...... ہندوستان میں...... پاکستان میں......'وہ اسامہ اور صدام سے پہلے بھی شک کے گھیرے میں تھا اور اسامہ اور صدام کے بعد اس کا (مسلمان کا) چہرا اتنا بگاڑ دیا گیا ہے کہ وہ اب دور سے ہی دہشت گرد نظر آنے لگا ہے۔

○○

تھوڑا تھوڑا کر کے مسلمانوں کی مخالفت اور زہر اگلنے کی کارروائی آج ایک بھیانک روپ لے چکی ہے۔ میڈیا نے ہر بار مسلمان اور اسلام کو غلط رنگوں میں پیش کیا ہے۔ پاکستان میں 'زانی' کو سنگسار، کرنے کا مسئلہ ہو...... بابری مسجد سے لے کر جنون یا مذہب کی کوئی بھی کارروائی ہو...... میچ فکسنگ یا اظہر کی بے ایمانیوں کی شہرت ہو...... ممبئی کا فساد ہو یا حاجی مستان...... کریم

لالہ کی باتیں......میڈیا کی سرخیوں میں اسلام آجاتا ہے......اور آدمی غائب ہو جاتا ہے۔سماج اور مذہب پر انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔دہشت گرد تنظیموں کا ذکر ہو تو سیمی سے القاعدہ تک......ان تنظیموں کو میڈیا، اسلام سے کچھ اس انداز سے جوڑتا ہے کہ سڑک سے گزرنے والا معمولی مسلمان بھی دہشت گرد لگنے لگتا ہے ــــ دوسرے کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے والا امریکہ خود اپنے ملک کا سروے کیوں نہیں کرتا، جہاں بلیک لبریشن آرمی، میچر وز، دی آرڈر، جیوش ڈفنس لیگ، پوج اومیکا7 جیسی کتنی ہی دہشت گرد تنظیمیں سر اٹھائے اپنی کارروائیاں کئے جا رہی ہیں۔پچھلی صدی ختم ہونے تک اور نئی صدی کے پہلے سورج طلوع ہونے تک ــــ فضا اسلام اور مسلمانوں کو لے کر خوفناک حد تک خراب ہو چکی تھی۔

سن 2002 کے جاتے جاتے صورت حال اتنی بھیانک ہے کہ آج کا مسلمان گویا بارود کے ڈھیر پر کھڑا ہے......بُش سے مودی تک سب ایک ہی زبان بول رہے ہیں......اسلام کو ختم کردو۔مسلمانوں کو مار ڈالو۔

اسلام، اسلام اور مسلمان

امریکہ سوچتا ہے کہ وہ تاناشاہ بن چکا ہے۔یعنی ایسی طاقت جس پر فتح حاصل نہیں کی جاسکتی......ایسی طاقت جسے کسی کے بھی خلاف استعمال کر سکتے ہیں ــــ شعلوں میں گھرے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی طرف اچانک اپنے چھوٹے سے کیمرے کا رخ کرنے والے کے ہونٹوں سے ایک لفظ نکلا تھا......شِٹ ــــ جلتے اور دھوئیں اگلتے ٹاور کی تصویر اپنے اپنے ٹی وی اسکرین پر جس کسی نے بھی دیکھی ہو، اس نے یہ لفظ ضرور سنا ہوگا......یہ لفظ امریکہ کی اب تک کی غیر مفتوح طاقت پر ایک ایسا غیر جانبدارانہ تبصرہ ہے، جس پر امریکہ کو غور ضرور کرنا چاہئے۔پہلی بار امریکی عوام کو بھی اس بات کا احساس ہوا ــــ کہ وہ بھی دوسرے ملکوں کے لوگوں کی طرح ہی معمولی انسان ہیں۔جن پر حملے ہو سکتے ہیں۔

امریکہ جس کی 'فرعونیت' جاپان، کیوبا، ویت نام، نکرگوا، سومالیہ، کوریا، عراق......فلسطین سے نکل کر افغانستان تک پھیل گئی تھی ــــ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد اسی امریکہ کا سروے کیجئے تو اُسامہ اور اینتھریکس کے خوف نے اس کی اصلیت کو ظاہر کر دیا ہے۔اس کی طاقت کے چیتھڑے اڑ چکے ہیں۔امریکہ جو دوسرے کے گھروں میں سیندھ لگاتا پھرتا تھا اور

دوسرے ملکوں میں ہونے والی ہر کارروائی کے بعد اس کی پہلی یہی تنقید ہوتی تھی کہ مجھے پہلے ہی سے سب کچھ پتہ تھا ـــــ اس کی خفیہ ایجنسیوں کی پول بھی کھل چکی ہے۔

بکر انعام یافتہ اروندھتی رائے نے اپنی ایک کتاب میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ امریکہ کے فوجی اور معاشی مرکز ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگن پر حملے کیوں ہوئے۔ آزادی کی نشان اسٹیچو آف لبارٹی کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ یعنی یہ غصہ جمہوریت کی مخالفت میں نہیں ہے۔ بلکہ امریکی عوام کو سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا ان سے نفرت نہیں کرتی ...... وہ امریکی حکومت کے طرز عمل سے نفرت کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہی بات اسلام پر عائد ہونی چاہئے ...... دہشت گردی کی مخالفت ضرور ہونی چاہئے۔ لیکن اسلام کی نہیں۔ مذہب، عقیدے سے جڑا ایسا خزانہ ہے، جس پر کھلے حملہ سے صورت حال بھیانک ہو سکتی ہے ...... امریکہ کے ساتھ ساتھ باقی ملکوں کو بھی یہ بات اب سمجھ لینی چاہئے۔

سن 2003ء

سن 2003ء کی آندھی گزر چکی ہے ...... نئی الفی کی شروعات نے زخم پر زخم دیئے جانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ جاری ہے ...... گجرات حادثہ اور مودی کے 'جشن' کا طوفان ابھی تھما نہیں ہے۔ مسلمانوں کو پریشان یا مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں، یہ محاسبہ کا دور ہے ...... خوش فہمیوں کے جنگل سے باہر نکل کر ہمیں آنے والے وقت کو سمجھنا ہے ...... گجرات کی فتح سے توگڑیا جیسے جاہلوں کو حوصلہ ملے گا، اس میں شک نہیں ...... ہمیں، انہی لوگوں کے درمیان سے راستہ بنانا ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اچھے لوگوں سے دنیا کبھی خالی نہیں ہوئی ہے ...... ہم سچے اور کھڑے ہیں تو لوگ ہماری حمایت میں ضرور آگے بڑھیں گے ......

ارن دھتی رائے اور کچھ نئے پہلو

اردو میں تاریخی ناولوں کی ایک بڑی دنیا ہے۔ مغل بادشاہوں سے لے کر ان کے عروج، ان کے زوال، میر جعفر، میر قاسم اور سراج الدولہ تک ـــــ تاریخی ناولوں کی کمی نہیں۔ (ابھی حال میں مصطفیٰ کریم کا ناول ''طوفانوں کی آہٹ'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے) یہاں ایسے

تاریخی ناولوں کا تذکرہ میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ ایسے ناولوں کے سہمے سہمے ہوئے ہندو کردار بار بار ایک محدود دائرہ کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ چاہے اکبر بادشاہ کے دربار سے نکلے ہوئے کردار ہوں یا سراج الدولہ کے قریبی...... مجھے چاپلوسی میں ڈوبے، ان کرداروں کو بار بار پڑھتے ہوئے الجھن سی محسوس ہوئی ہے۔

مدت مدید کی تھکن اپنے وجود پر مسلط کرنے کے بعد، ایک انتہائی مہذب دنیا میں پہنچنے تک ـــــ توگڑیا اور مودی جیسوں کی ''نگہبانی'' میں ـــــ ایسا لگتا ہے جیسے ایک بار پھر وہی پرانی کہانی شروع ہوگئی ہے۔ یہ جنگ اب صرف دو لوگوں کے درمیان ہے۔ ایک تاناشاہ ہے اور دوسرا مظلوم ومحکوم...... ایک طرف اقلیت ہے تو دوسری طرف اکثریت۔ طاقتور اور کمزور کی لڑائی میں تمام دلیلیں، قاعدے قانون، اقوام متحدہ کے قیام کا مقصد، سب کچھ جیسے طاق پر رکھا جا چکا ہے۔ گلوبلائیزیشن کے اس عہد میں، سامراج واد کی آڑ میں اب یہی کھیل بُش اور بلیئر مل کر کھیل رہیں ہیں۔

۱۳ رمئی ۲۰۰۳ء نیویارک کے ریورسائڈ چرچ میں ارن دھتی رائے نے جو بیان دیا وہ خاصا اہمیت کا حامل ہے۔

> ''ہم وقت کے ایسے دوڑ سے گزر رہے ہیں جب ہمیں یہ جاننے کے لئے بھی ایک دور میں شامل ہونا پڑ رہا ہے کہ کتنی تیزی سے ہماری آزادی چھینی جا رہی ہے۔ ایسے دور میں کچھ وقت کے لئے ہی سہی، اس دوڑ سے الگ ہونے اور اس طرح کے تمام واقعات، حادثات سے مکمل 'پولیٹیکل' تھیسس لے کر لوٹنے کا جوکھم چند لوگ ہی اٹھا سکتے ہیں۔ میں آج کی رات بھلا آپ کو کیا تحفہ دے سکتی ہوں۔ ہم ایک مشکل دور سے دوسرے مشکل دور کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جنہیں سیٹلائٹ اور ٹی وی میڈیا لگاتار ہمارے دماغوں میں بھرنے کا کام کر رہی ہے۔ لیکن ہمیں اپنی زمین کے بارے میں غور کرنا ہے، سوچنا ہے ـــــ ہم جنگ کے ملبے سے ہوتے ہوئے تاریخ کے دروازے میں داخل

ہوتے ہیں۔ کتنے شہر ختم ہو گئے ـــــ کھیت سوکھ گئے، جنگل کٹتے جا رہے ہیں کتنی ہی ندیاں تاریخ کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔ کتنی ہی عظیم الشان لائبریریوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے گئے...... تو بھلا آج کی رات میں آپ کو کیا تحفہ دے سکتی ہوں۔ دولت، جنگ، سامراج، نسل کشی اور جمہوریت کے بارے میں کچھ منتشر خیالات...... کچھ ایسی فکر جو پتنگوں کی طرح میرے دماغ کے ارد گرد گھومتی ہیں اور مجھے راتوں کو جگائے رکھتی ہیں۔ ممکن ہے میری بات آپ کو اچھی نہیں لگے ـــــ ممکن ہے مہذب دنیا کو یہ پسند نہیں آئے کہ ایک بھارتی شہری یہاں آ کر امریکی سامراج واد پر تنقید کرے۔ میں اپنے بارے میں نہ کوئی پرچم لہرانے آئی ہوں، نہ ہی کوئی حب الوطنی کا گیت گانے...... میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہر ملک، ہر صوبہ اور ہر ریاست کی مرتی ہوئی آتما پر آج ظلم اور دوغلے پن کا راج ہے ـــــ لیکن جب ایک ملک صرف ایک ملک نہ رہ کر سامراج بن جائے تو تحریک کا معیار ڈرامائی طریقے سے بدل جاتا ہے ـــــ میں بتانا چاہتی ہوں کہ آج میں ـــــ امریکی سامراج کے، ایک غلام کی حیثیت سے بول رہی ہوں ـــــ ایک ایسا غلام جو اپنے بادشاہ کا قصیدہ نہیں پڑھنا چاہتا بلکہ اس کے ظلم کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا ہے۔"

ـــــ ارن دھتی رائے

حقیقتاً جب ایک ملک، ایک ملک نہ رہ کر، عظیم الشان سامراج بن جائے تو تحریک کا معیار ہی ڈرامائی انداز سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ مجھے کچھ یہی حال اپنے یہاں مسلمانوں کا نظر آتا

ہے۔ منطق مت دیجئے۔۔۔۔۔ ابھی حال میں ہندی کے مشہور رسالہ ''کتھا دیش'' میں، دیئے گئے ایک انٹرویو میں مشہور ہندی افسانہ نگار **پرینود** نے اس دکھ کو گہرائی سے محسوس کیا ہے......

''آپ اقلیت میں ہوتے تو جانتے کہ اقلیت میں ہونا کیا ہوتا ہے۔''

جی ہاں!...... بہت بھیانک۔۔۔۔۔ جیسے کسی بھی موسم میں ترشول لئے سنگھیوں کا آپ کی پیشانی پر مسلمان ہونا پڑھ لیا جانا...... بسوں میں اردو کتابوں چھپاتے ہوئے...... پاکستان پر بار بار غیر ضروری طریقوں سے اپنا بچاؤ کرنا۔۔۔۔۔ ہندو پاک کرکٹ کا میچ ہو یا کہیں بھی ہونے والا فدائین حملہ...... آپ نہیں جانتے کہ اقلیت میں ہونا کیا ہوتا ہے؟ آپ نہیں جانتے کہ غلام ہونا کیا ہوتا ہے؟ ارن دھتی نیویارک کے ریورس سائیڈ چرچ میں غلام بن گئی تھیں۔۔۔۔۔ مسلمان گودھرا سے پیدا شدہ سچ کے بعد کچھ ایسا ہی محسوس کر رہے ہیں۔

تقسیم ایک پڑاؤ تھا...... اب ایک اہم پڑاؤ گودھرا بن گیا ہے۔ مسلمان آنے والے وقت میں بھی اس پڑاؤ سے گزرے بغیر آگے نہیں جاسکتے...... مہیش مانجریکر کی حالیہ فلم ''پران جائے پر شان نہ جائے'' میں ایک مسلم غریب کردار ایک ہندو کے منہ سے بار بار پاکستانی کہے جانے پر چیختا ہے...... ''سالے...ورلڈ ٹریڈ ٹاور میں ہوائی جہاز گھستا ہے تب بھی یہاں آ کر ہم سے پوچھتے ہو جیسے ہم نے ہی گھسایا ہے۔''

اصلیت یہی ہے کہ آپ اقلیت میں ہوتے تو جانتے کہ اقلیت ہونا کیا ہوتا ہے۔ تقسیم کے بعد سے لے کر اب تک میں نے پتہ نہیں اپنے کتنے مضامین میں اس لفظ اقلیت کے خلاف اپنا احتجاج درج کرایا ہے۔ مجھے شروع سے ہی اقلیتی کمیشن جیسے اداروں سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ میری اپنی منطق تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی، 20 کروڑ سے کم نہیں اور اتنی بڑی آبادی اقلیت نہیں ہوسکتی۔ اسے دوسری بڑی اکثریت کا نام دینا چاہئے۔ مجھے احساس تھا کہ محض دوسری بڑی اکثریت کے اعلان کے انجکشن سے، ہمارے بہت سارے مسائل حل ہوسکتے ہیں لیکن شائد میں غلطی پر تھا۔

گودھرا کانڈ کے بعد جیسے ساری حقیقتیں بدل گئی۔ مودی کا ہندوتو چمکا...... گجرات ہندوتو کی پہلی لیبارٹری بنا...... وی ایچ پی، بجرنگ دل جیسی ہندو تنظیموں کی نفرتیں کھل کر سامنے

آئیں...... تو گڑیا کا ترشول گھر گھر پہنچا...... ملک میں اس سے پہلے بھی فساد ہوتے رہے لیکن نفرت کی ایسی کہانی کا جنم پہلی بار ہوا تھا...... کیا تاریخ خود کو دھرا رہی تھی؟ تہذیبوں کی تاریخیں بدلی تھی...... نئی دنیا میں مہذب ہونے کا ایک ہی مطلب تھا...... طاقتور ہونا ـــــ ہم نے یہ بھی جانا کہ اصول، قائدے قانون اقلیتوں کے پاس نہیں ہوتے ـــــ طاقتوروں کے پاس ہوتے ہیں۔ ہزاروں چشم دید گواہوں کے باوجود مودی یا توگڑیا پر کوئی پوٹا کوئی قانون نافذ نہیں ہوتا ـــــ چاروں طرف بارش کی طرف برستے ہوئے مکالے ایک نئی نفسیاتی کہانی کا سبب بن جاتے ہیں جس کے پہلے صفحے پر لکھا ہوتا ہے ـــــ کہ ''آپ کو بزدل بن کر جینا ہے''...... یہی نفسیات ارن دھتی کو نیویارک میں غلام بنا دیتی ہے اور اسی نفسیات سے گزرتے ہوئے مسلمان بدلے بدلے سے ماحول میں خود کو غلامی کے گہرے کنویں میں قید محسوس کرتا ہے۔

(2)

بُرے وقت کے اداس موسم میں

تو قارئین! بُرے وقت کے اداس موسم میں یہ کتاب آپ تک پہنچاتے ہوئے مجھے ذرا سی بھی خوشی نہیں ہے۔

میں گہرے صدمات کے ریگستان میں پانی کی ایک بوند تلاش کررہا ہوں ـــــ بُرے موسم میں تو سب کچھ خاک ہو گیا۔

پیارے خالد جاوید، یہ تم پر ہی منحصر تھا کہ تم ہی بُرے موسم کی تخلیق کر سکتے تھے۔ مجھے تو نئی صدی کے ان تین برسوں نے بے حد اداس کر دیا ہے۔ اداس اور مغموم......

لینڈ اسکیپ کے گھوڑے...... یہ گھوڑے میرے دوست اور پاکستان کے مشہور فنکار اس.ال. حسین نے بنائے تھے۔ دو گھوڑے۔ ایک ہندستان اور ایک پاکستان......

تقسیم کے 56 برسوں میں آج بھی یہ گھوڑے مختلف دشاؤں میں دوڑ رہے ہیں۔ مجھے ان گھوڑوں کے تعلق سے بار بار جوناتھن سوئفٹ کے گھوڑوں کی یاد آتی ہے۔ جب گولیور گھوڑوں کے دیس پہنچتا ہے تو گھوڑے، اس کے کمزور 'انسانی' سراپا پر تحقیر آمیز نظر ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔ مجھے دیکھو اور اپنے آپ کو دیکھو۔ یہ تمہارے بے ڈول ہاتھ پاؤں...... تم سچ مچ کمتر ہو......

گھوڑے سچ مچ عظیم ہیں......

اور انسان تو امریکہ سے گودھرا اور گجرات تک اپنی کمینگی ظاہر کر چکا ہے......اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ ابھی بھی ٹھہرا نہیں ہے......

OO

میں بھی کہاں ٹھہرا ہوں۔

یہ پاگل کر دینے والا سناٹا مجھ سے کہتا ہے_____ لکھو، تو ہاتھ شل ہے۔ قلم میں طاقت نہیں......

دنیا کی باتیں تو بہت ہو گئیں......

لیکن ابھی میری اپنی باتیں باقی ہیں......

ان تین برسوں میں بُرے موسم کی زد پر، میں بھی رہا ہوں۔ تین سال پہلے ''سناٹے میں تارا'' لکھتے ہوئے، میں انتہائی فخر کے عالم میں اپنے فرشتہ جیسے باپ **مشکور عالم بصیری** کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔

اور اب یہ قلم خاموش ہے......وہ مہربان شفیق چہروں والا باپ 6/مئی، 2001 کی صبح، بادلوں کے کچھ بے حد حسین ٹکروں کے بیچ ہمیشہ کے لئے گم ہو گیا۔

ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے......

6/مئی 2001ء کو ابّی کا انتقال ہوا اور اس کے ٹھیک 16 دنوں بعد میرے صدمے کو کم کرنے کے لئے، میری بٹیا اس دنیا میں آ گئی_____ صحیفہ، انعمۃ۔ دو دو نام رکھے بٹیا کے......

لگا، ابا کی واپسی ہو گئی ہے بٹیا میں......

وہی چہرہ، وہی وظیفہ پڑھنے والی انگلیاں_____

چہرے پر کھیلتی وہی مسکراہٹ_____

مگر یہ مسکراہٹ تو فریب ہے۔ وقت کا دھوکہ ہے......

ابا پھر ایک بار لوٹ گئے۔

اللہ کی نعمتیں کام نہیں آئیں۔

6/جولائی 2003 کی صبح بٹیا نے بھی رخصت سفر باندھ لیا_____

6رمئی ابا گئے تھے۔
6رجولائی بٹیا......
6ردسمبر بابری مسجد شہید ہوئی تھی......

OO

گہرے سناٹے میں ہوں......
اوراس سناٹے میں چپکے چپکے کچھ آوازیں مجھے گھیرے رہی ہیں......
میں......وقت سے ٹوٹے ایک ذرا سے لمحے کا بھی حساب رکھنے والا____
میں......گھر کے ویران سے گوشے میں تنہائیوں کو خط لکھنے والا____
میں......پُراسرار خوبصورت رات کو آنکھوں سے نیندیں چرانے والا____
میں......خاموشی اور سناٹے سے نکلے نغموں کا شیدائی____
میں......پت جھڑ کے دکھ بجھنے والا____
میں......موسم بہار کی راگنی اور اس کے الاپ پر مست مست ہو جانے والا____
میں......تصورات کی وادیوں سے نت نئے خواب چرانے والا____
میں......ایسے ہر خواب سے کہانیاں بُننے والا____
میں......

لیکن دوستو۔ اب یہ میں کہیں نہیں ہے۔ یہ میں تو رخصت ہو چکا ہے____ یہ میں، اب مجھ میں کہیں نہیں ہے۔ مجھے ڈھونڈھنے پر بھی نہیں ملتا۔ نئی صدی کے ان تین برسوں کے پت جھڑ نے مجھے ایک بے حد اداس 'ٹھونٹھ' میں بدل دیا ہے......

گودھرا سے گجرات، امریکہ سے عراق تک، تاریخ صرف اپنی بربادی کے قصے ہی رقم کرتی رہی ہے......
تاریخ جیسے گونگی ہے____ جسے اپنے آپ کو ڈھنگ سے دُہرانا بھی نہیں آتا____
جو ہر برس، ہر لمحہ گزرنے کے ساتھ زیادہ بے رحم اور زیادہ سفاک ہوتی جارہی ہے۔
میں تاریخ کے ایسے بے رحم صفحوں پر____ اپنے لئے جائے پناہ تلاش نہیں کرسکتا____

میں تو ایک معصوم سا ادیب ہوں۔ مظلوم، حساس، اور جذباتی......
میں تاریخ کے ایسے ہر حملے میں، ہر بار لہولہو ہوا ہوں ـــــــ
......ہر بار مرا ہوں
......ہر بار زندہ ہوا ہوں
اور اب بھی لکھی جانے والی تاریخ کے، یہ بے رحم تھپیڑے کھانے کی مجھ میں ہمت نہیں
ہے......
مگر ان آنکھوں کا کیا کروں۔
یہ آنکھیں جو خوش رنگ منظروں کا واسطہ مانگتی ہیں۔
یہ آنکھیں، جو ماضی کی سنہری گم شدہ چاندنیوں کی واپسی چاہتی ہیں......
یہ آنکھیں جو صحیفہ مانگتی ہیں ـــــــ
یہ آنکھیں جو شفیق مہربان چہروں والا باپ اور انعمۃ مانگتی ہیں ـــــــ
یہ آنکھیں صرف خوابوں میں 'زندہ' ہیں ـــــــ
یا خوابوں میں الجھ کر رہ گئی ہیں ـــــــ

OO

اب سڑکوں پر 'دو چار دھارائیں' مرتی ہیں ـــــــ
آئیڈیالوجی مرتی ہے ـــــــ
بیچ چوراہے پر کسی 'تحریک' کو جوتوں سے پیٹا جاتا ہے ـــــــ
کوئی دلیل اپنی موت آپ مرجاتی ہے ـــــــ
سیاست کے گندے تالاب میں منطقوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ـــــــ صرف مہرے
چلنے اور پٹنے کا کھیل رہ گیا ہے ـــــــ
آپ کو صرف اتنا کرنا ہے ـــــــ
کہ اپنے آدمی ہونے کا لباس اُتار دینا ہے ـــــــ
آپ کو آدمی نہیں رہنا ہے ـــــــ
تو پیارے خالد جاوید، بُرے وقت کے اداس موسموں میں، یہ کتاب تمہارے نام بھی

ہے —— اور تمہارے جیسے دنیا کے ان تمام لوگوں کے نام بھی جو اس بُرے موسم گھر گئے ہیں یا خودکو گھرا ہوا محسوس کر رہے ہیں ——

—— ذوقی

20/اگست،2003ء

مشرف عالم ذوقی کی مطبوعات ایک نظر میں

افسانوی مجموعے

تمام کتابیں نئے ایڈیشن اور نئے گیٹ اپ کے ساتھ

- بھوکا ایتھوپیا
- منڈی
- غلام بخش
- صدی کو الوداع کہتے ہوئے
- فرشتے بھی مرتے ہیں
- لینڈ اسکیپ کے گھوڑے
- کہانی تمہیں لکھنے والی ہے (زیر طبع)

ناول

- نیلام گھر
- شہر چپ ہے
- بیان
- ذبح
- مسلمان
- سب سازندے
- دی اولڈ تھیٹر
- رات اتر رہی ہے
- عقاب کی آنکھیں

☆☆

تقسیم، غلامی اور ہجرت سے نکلے ہوئے، ایسے

افسانے، جو تاریخ بن گئے۔

(ہندی میں)

لیبارٹری

صفحہ : 270

قیمت : 150 روپے

سرخ بستی

(دو جلدوں میں)

قیمت : 400 روپے

''گودھرا سے گجرات، امریکہ سے عراق تک ـــــ تاریخ صرف اپنی
بربادی کے قصّے ہی رقم کرتی رہی ہے...... تاریخ جیسے گونگی ہے ـــ جسے
اپنے آپ کو ڈھنگ سے دُہرانا بھی نہیں آتا ـــ جو ہر برس، ہر لمحہ گزرنے
کے ساتھ زیادہ بے رحم اور زیادہ سفاک ہوتی جا رہی ہے۔ میں تاریخ
کے ایسے بے رحم صفحوں پر اپنے لئے جائے پناہ تلاش نہیں کرتا ـــــ میں
تو ایک معصوم سا ادیب ہوں۔ مظلوم، حساس، اور جذباتی...... میں تاریخ
کے ایسے ہر حملے میں، ہر بار لہولہو ہوا ہوں ـــــ ہر بار مرا ہوں...... ہر
بار زندہ ہوا ہوں ـــــ اور اب تاریخ کے ان بے رحم تھپیڑوں کو
برداشت کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے...... میں ایک حقیقت نگار
ہوں -- دوستوفسکی، میخائل شلاخوف کی طرح ایک حقیقت نگار ـــــ
شاید اسی لئے میں اپنے عہد سے آنکھیں چرا کر کچھ بھی تحریر نہیں
کرسکتا...........''

ـــــ مشرف عالم ذوقی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)
Phones: 3216162, 3214465 Fax: 91-011-3211540
E-mail: eph@onebox.com

81-8223-000-4